خواہشیں! احادیث اہلبیتؑ کی روشنی میں

آیۃ اللہ شیخ محمد مہدی آصفی مدظلہ

مترجم: سید کمیل اصغر زیدی

مجمع جہانی اہل بیت علیہم السلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بنام خدائے رحمان ورحیم

قُلۡ أَعُوۡذُ بِرَبِّ النَّاسِ *مَلِکِ النَّاسِ *اے رسول کہہ دیجئے کہ میں انسانوں کے پروردگار کی پناہ چاہتا ہوں جو تمام لوگوں کا مالک و بادشاہ اِلٰہِ النَّاسِ *مِنۡ شَرِّ الۡوَسۡوَاسِ الۡخَنَّاسِ *الَّذِیاور سارے انسانوں کا معبود ہے شیطانی وسواس کے شر سے جو نام خدا سن کر پیچھے ہٹ جاتا ہے یُوَسۡوِسُ فِیۡ صُدُوۡرِ النَّاسِ *مِنَ الۡجِنَّۃِ وَالنَّاسِ *اور جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے پیدا کراتا ہے وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔

فہرست مطالب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف اول

جب آفتاب عالم تاب افق پر نمودار ہوتا ہے کائنات کی ہر چیز اپنی صلاحیت و ظرفیت کے مطابق اس سے فیضیاب ہوتی ہے حتی ننھے ننھے پودے اس کی کرنوں سے سبزی حاصل کرتے اور غنچے و کلیاں رنگ و نکھار پیدا کرلیتی ہیں تاریکیاں کافور اور کوچہ و راہ اجالوں سے پرنور ہوجاتے ہیں، چنانچہ متمدن دنیا سے دور ،عرب کی سنگلاخ وادیوں میں قدرت کی فیاضیوں سے جس وقت اسلام کا سورج طلوع ہوا، دنیا کی ہر فرد اور ہر قوم نے اپنی قوت و قابلیت کے اعتبار سے فیض اٹھایا ۔اسلام کے مبلغ و موسس سرورکائنات حضرت محمد مصطفی ﷺ غار حراء سے مشعل حق لے کر آئے اور علم و آگہی کی پیاسی اس دنیا کو چشمۂ حق و حقیقت سے سیراب کردیا، آپ کے تمام الٰہی پیغامات ایک ایک عقیدہ اور ایک ایک عمل فطرت انسانی سے ہم آہنگ ارتقائے بشریت کی ضرورت تھا، اس لئے ۲۳ برس کے مختصر عرصے میں ہی اسلام کی عالمتاب شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں اور اس وقت دنیا پر حکمراں ایران و روم کی قدیم تہذیبیں اسلامی قدروں کے سامنے ماند پڑگئیں، وہ تہذیبی اصنام جو صرف دیکھنے میں اچھے لگتے ہیں

اگر حرکت و عمل سے عاری ہوں اور انسانیت کو سمت دینے کا حوصلہ، ولولہ اور شعور نہ رکھتے ہوں تو مذہبِ عقل و آگہی سے روبرو ہونے کی توانائی کھودیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک چوتھائی صدی سے بھی کم مدت میں اسلام نے تمام ادیان و مذاہب اور تہذیب و روایات پر غلبہ حاصل کرلیا ۔اگرچہ رسول اسلام ﷺ کی یہ گرانبہا میراث کہ جس کی اہلبیت علیہم السلام اور ان کے پیرووں نے خود کو طوفانی خطرات سے گزار کر حفاظت و پاسبانی کی ہے، وقت کے ہاتھوں خود فرزندان اسلام کی بے توجہی اور ناقدری کے سبب ایک طویل عرصے کے لئے تنگنائیوں کا شکار ہوکر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم کردی گئی تھی، پھر بھی حکومت و

سیاست کے عتاب کی پروا کئے بغیر مکتب اہلبیت علیہم السلام نے اپنا چشمۂ فیض جاری رکھا اور چودہ سو سال کے عرصے میں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء و دانشور دنیائے اسلام کو تقدیم کئے جنھوں نے بیرونی افکار و نظریات سے متاثر اسلام و قرآن مخالف فکری و نظری موجوں کی زد پر اپنی حق آگین تحریروں اور تقریروں سے مکتب اسلام کی پشت پناہی کی ہے اور ہر دور اور ہر زمانے میں ہر قسم کے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا ہے، خاص طور پر عصر حاضر میں اسلامی انقلاب کی کامیابی کے بعد ساری دنیا کی نگاہیں ایک بار پھر اسلام و قرآن اور مکتب اہلبیت علیہم السلام کی طرف اٹھی اور گڑی ہوئی ہیں، دشمنان اسلام اس فکری و معنوی قوت واقتدار کو توڑنے کے لئے اور دوستداران اسلام اس مذہبی اور ثقافتی موج کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑنے اور کامیاب و کامراں زندگی حاصل کرنے کے لئے بے چین وبے تاب ہیں،یہ زمانہ علمی اور فکری مقابلے کا زمانہ ہے اور جو مکتب بھی تبلیغ اور نشر و اشاعت کے بہتر طریقوں سے فائدہ اٹھاکر انسانی عقل و شعور کو جذب کرنے والے افکار و نظریات دنیا تک پہنچائے گا، وہ اس میدان میں آگے نکل جائے گا۔

(عالمی اہلبیت کونسل) مجمع جہانی اہلبیت علیہم السلام نے بھی مسلمانوں خاص طور پر اہلبیتؑ عصمت و طہارت کے پیرووں کے درمیان ہم فکری و یکجہتی کو فروغ دینا وقت کی ایک اہم ضرورت قرار دیتے ہوئے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے کہ اس نورانی تحریک میں حصہ لے کر بہتر انداز سے اپنا فریضہ ادا کرے، تاکہ موجودہ دنیائے بشریت جو قرآن و عترت کے صاف و شفاف معارف کی پیاسی ہے زیادہ سے زیادہ عشق و معنویت سے سرشار اسلام کے اس مکتب عرفان و ولایت سے سیراب ہو سکے، ہمیں یقین ہے عقل و خرد پر استوار ماہرانہ انداز میں اگر اہلبیتؑ عصمت و طہارت کی ثقافت کو عام کیا جائے اور حریت و بیداری کے علمبردار خاندان نبوتؐ و رسالت کی جاوداں میراث اپنے صحیح خدو خال میں دنیا تک پہنچادی جائے تو اخلاق و انسانیت کے دشمن، انانیت کے شکار، سامراجی خوں خواروں کی نام نہاد تہذیب و ثقافت اور عصر حاضر کی ترقی یافتہ جہالت سے تھکی ماندی آدمیت کو امن و نجات کی دعوتوں کے ذریعہ امام عصر (عج) کی عالمی حکومت کے استقبال کے لئے تیار کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس راہ میں تمام علمی و

تحقیقی کوششوں کے لئے محققین و مصنفین کے شکر گزار ہیں اور خود کو مؤلفین و مترجمین کا ادنیٰ خدمتگار تصور کرتے ہیں، زیر نظر کتاب، مکتب اہلبیت علیہم السلام کی ترویج و اشاعت کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، فاضل علاّمہ آیۃ اللہ شیخ محمد مہدی آصفی مد ظلہ کی گرانقدر کتاب (الھویٰ فی حدیث اہل البیتؑ)کو سید کمیل اصغر زیدی نے اردو زبان میں اپنے ترجمہ سے آراستہ کیا ہے جس کے لئے ہم دونوں کے شکر گزار ہیں اور مزید توفیقات کے آرزومند ہیں، اسی منزل میں ہم اپنے ان تمام دوستوں اور معاونین کا بھی صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ جنھوں نے اس کتاب کے منظر عام تک آنے میں کسی بھی عنوان سے زحمت اٹھائی ہے، خدا کرے کہ ثقافتی میدان میں یہ ادنیٰ جہاد رضائے مولیٰ کا باعث قرار پائے۔

والسلام مع الاکرام

مدیر امور ثقافت، مجمع جہانی اہلبیت علیہم السلام

مقدمۂ مؤلف

آپ کے سامنے اس حدیث قدسی سے متعلق کچھ فکری کاوشوں کا نتیجہ حاضر خدمت ہے جو خواہشات نفس،ان کی پیروی اور مخالفت نیز انسانی زندگی میں ان کے آثار کے بارے میں وارد ہوئی ہے۔یہ فکری کوشش درحقیقت ان یادداشتوں کا مجموعہ ہے جنہیں میں نے حوزہ علمیہ قم کے کچھ طلاب کے درمیان درس کے عنوان سے بیان کیا تھا ،اور اب خداوند عالم نے انہیں اس شکل وصورت میں مرتب اور نشر کرنے کی توفیق عنایت فرمادی ہے ۔ان تمام عنایتوں پر اسکی حمد ہے ۔اور اللہ تعالی سے دعا ہے کہ اسے مومنین کے لئے مفید بنادے اور اسکے صاحب تحریر کے لئے بھی اس دن فائدہ مند قرار دے کہ جس دن مال واولاد کچھ کام نہ آئیں گے۔

محمد مہدی آصفی

قم مقدسہ

۲۸،شوال ۱۴۱۲ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حدیث قدسی

عن الامام الباقر (ع): عن رسول اللہ (ص) قال: یقول اللہ عزوجل ''وعزتی، وجلالی، وعظمتی، وکبریائی، ونوری، وعُلوّی، وارتفاعِ مکانی، لایؤثر عبد ھواہ علیٰ ھوای إلاشتّتُ أمرہ، ولبّست علیہ دنیاہ، وشغلت قلبہ بھا، ولم أوتہ منھا إلاماقدّرت

لہ۔ وعزتی، وجلالی، وعظمتی، وکبریائی، ونوری، وعُلوّی، وارتفاع مکانی، لایؤثر عبد ھوای علیٰ ھواہ إلااستحفظتہ ملائکتی، وکفّلت السماوات والارض رزقہ، وکنت لہ من وراء تجارۃ کل تاجر، وأتتہ الدنیا وھی راغمۃ[1] ''

امام محمد باقرؑ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے '': میری عزت و جلالت، عظمت و کبریائی ،نور و رفعت اور میرے مقام و منزلت کی بلندی کی قسم کوئی بندہ بھی اپنی ہویٰ وہوس کو میری مرضی اور خواہش پر ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ میں اسکے امور کو درہم برہم کردونگا اسکے لئے دنیا کو بنا سنوار دونگا ۔اسکے دل کو اسی کا دلدادہ بنا دونگا اور اسکو صرف اسی مقدار میں عطا کرونگا جتنا پہلے سے اسکے مقدر میں لکھ دیا ہے'''' اور میری عزت وجلالت، عظمت وکبریائی، نورورفعت اور مقام ومنزلت کی بلندی کی قسم کوئی بندہ میری مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ ملائکہ اسکی حفاظت کرینگے ۔آسمان اور زمین اسکے رزق کے ذمہ دار ہیں اور ہر تاجر کی تجارت کی پشت پر میں اسکے ساتھ موجود ہوں گا اور دنیا اسکے سامنے ذلت و رسوائی کے لبادہ میں حاضر ہوگی''

[1] عدۃالداعی:ص۷۹۔اصول کافی :ج۲ص۳۳۵۔بحارالانوار:ج۷۰ص۷۸۔بحار الانوار ج۷۰ ص۸۵ و ۸۶۔الجواہر السنیۃفی الاحادیث القدسیۃ:ص۳۲۲۔اور شیخ محمد مدنی نے تقریباً انہیں الفاظ میں اسے :الاتحافات السنیۃفی الاحادیث القدسیہ:ص۳۷پر نقل کیا ہے ۔

یہ حدیث شریف ان روایات میں سے ہے جن کی شہرت کتب فریقین میں مستفیضہ ہونے کی حد تک ہے ۔ ہم نے اس حدیث کو مختلف سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے جن میں سے بعض سندیں ہمارے نزدیک صحیح ہیں ۔

اس حدیث کی تشریح تین فصلوں میں پیش کی گئی ہے

پہلی فصل:ہوائے نفس کی تعریف،اس کے عوارض کی تشخیص،اسکے علاج اور اس پر قابو پانے کے راستے پر مشتمل ہے یہ فصل در حقیقت اس کتاب (حدیث کی تشریح)کا مقدمہ ہے ۔دوسری فصل:اپنی خواہش کو خداوند عالم کی مرضی پر ترجیح دینے والوں کے ذکر میں ہے ۔تیسری فصل:خداوند عالم کی مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح دینے والوں کے ذکر میں ہے ۔

پہلی فصل

''ہویٰ'' (خواہش)قرآن وحدیث کی روشنی میں

ہویٰ (خواہش)ایک اسلامی اصطلاح ہے جو قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے ۔اسلامی تہذیب میں اسکے اپنے ایک خاص معنیٰ مراد لئے جاتے ہیں۔یہ لفظ قرآن اور احادیث میں کثرت سے استعمال ہوا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: (أرایت من اتخذ إلٰھه هواه أفأنت تکون علیه وکیلا[١]) ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا خدا بنالیا ہے کیا آپ اس کی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں'' دوسرے مقام پر ارشاد ہوتاہے:(وأما من خاف مقام ربه ونهی النفس عن الهویٰ فإن الجنة هی المأویٰ[٢]) ''اور جس نے رب کی بارگاہ میں حاضری کا خوف پیدا کیا ہے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا ہے تو جنت اس کا ٹھکانا اور مرکز ہے ''سید رضی نے مولائے کائنات حضرت علیؑ کا یہ قول نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے:(إن أخوف ماأخاف علیکم إثنان:إتباع الهویٰ وطول الأمل) ''مجھے تمہارے بارے میں سب سے زیادہ دو چیزوں کا خوف رہتا ہے :خواہشات کی پیروی اورآرزووں کا طولانی ہونا''

پیغمبر اکرم ﷺاور امام جعفر صادقؑ دونوں سے ہی یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ آپ حضرات نے فرمایا : (إحذرواأهوائکم کماتحذرون أعدائکم،فلیس شیٔ أعدیٰ للرجال من اتباع أهواءهم وحصائدألسنتهم[٣]) ''اپنی خواہشات سے اسی طرح ڈرتے رہو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہو۔ کیونکہ انسان کیلئے خواہشات کی پیروی اور زبان کے نتائج سے بڑاکوئی دشمن نہیں ہے۔''

---

[١] سورۂ فرقا ن آیت ۴۳۔
[٢] سورۂ نازعات آیت۴۰۔۴۱۔
[٣] اصول کافی ج۲ص۳۳۵۔

اور امام جعفر صادقؑ ہی سے یہ بھی منقول ہے کہ: (لاتدع النفس وھواھا،فإن ھواھا ارداھا[1]) ''نفس اور اسکی خواہشات کو ہرگز یونہی نہ چھوڑ دینا کیونکہ نفسانی خواہشیں ہی اسکی پستی کا باعث ہیں''

بنیادی محرکات

انسانی زندگی میں نفس اور ''خواہشات ''کیا کردار ادا کرتے ہیں اسکے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ خداوند عالم نے ہر انسان کو متحرک وفعال رکھنے اور علم وکمال کی جانب گامزن کرنے کے لئے ا۔ فطرت:اس کے ذریعہ خداوند عالم نے اپنی معرفت نیز وفاء، عفت ،رحمت،اور کرم جیسے اخلاقی اقدار کی طرف رجحان کی قوت ودیعت فرمائی ہے۔

٢۔عقل :یہ انسانی وجودمیں حق و باطل کے درمیان تشخیص اور تمیز دینے کی ذمہ دار ہے۔

٣۔ارادہ:کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا انحصار اسی پر ہوتاہے اور شخصیت کا استقلال اسی سے وابستہ ہے۔

٤۔ضمیر:عدل و انصاف پر مبنی درونی و باطنی آوازہے جس کا کام انسان کو صحیح فیصلہ سے آگاہ اور غلط باتوں پر اسکی توبیخ کرنا ہے تاکہ انسان حد اعتدال پر قائم رہے۔

٥۔قلب،صدر،:آیات قرآنی کے مطابق علم ومعرفت کا ایک اور دروازہ ہے۔ اسی پر خداوند عالم کی جانب سے علم ومعرفت کی تجلی ہوتی ہے۔

٦۔ہویٰ(خواہشیں):وہ خواہشات اور جذبات جو انسان کے نفس میں پائے جاتے ہیں اور ہر حال میں انسان سے اپنی تکمیل کامطالبہ کرتے ہیں اور ان کی تکمیل کے دور ان انسان لذت محوس کرتاہے انسان کو متحرک رکھنے اور اسے علم ومعرفت سے مالا مال کرنے کے یہ اہم ترین محرکات ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انسانی وجود میں ودیعت فرمایاہے ۔ سردست ان کی تعداداور تفصیلات

---

[1] گذشتہ حوالہ اسکے وجودمیں کچھ بنیادی محرکات رکھے ہیں اور انسان کی تمام ارادی اور غیر ارادی حرکات نیز اسکی مادی و معنوی ترقی ا نھیں بنیادی محرکات کی مرہون منت ہے یہ چھ محرکات ہیں اور ان میں بھی سب سے اہم محرک ''ہویٰ''یعنی خواہشات نفس ہے۔

کے بارے میں کسی قسم کی علمی اور تفصیلی گفتگو مقصود نہیں ہے ۔ نفسیات کے اس گوشہ پر ابھی اسلامی نقطہ نظر سے مزید غور وفکر اور بحث وجستجو کی ضرورت ہے۔ خدا کرے کہ کوئی ایسا بلند پایہ مفکر سامنے آجائے جو آیات و روایات کی روشنی میں اس گوشے سے متعلق فکری جولانیاں دکھا سکے۔ ۔فکر اسلامی کا یہ گوشہ نہایت شاداب ہونے کے ساتھ ساتھ اچھوتا بھی ہے اور یہی دونوں خصوصیات علماء و مفکرین کے اشہب فکر کو مہمیز کرنے کیلئے کافی ہیں۔

لہٰذا خدا وند کریم سے یہ دعا ہے کہ جو شخص اسلامی علوم کے خزانوں کے سہارے اس مہم کو سر کرنے کا بیڑا اٹھائے وہ اسکے لئے ہر طرح کی آسانیاں فراہم کردے ۔فی الحال اس کتاب میں ہویٰ کے معنی،اسکی تعریف،اور انسانی زندگی میں اسکے کردار نیز اسکے خصوصیات،اثرات،اس سے مقابلہ کا طریقہ اور اس سے متعلق دوسرے امور کا جائزہ لینا مقصود ہے لہٰذا ہم انسانی وجود میں موجود دوسرے محرکات سے صرف نظر کرکے صرف اور صرف ''ہویٰ''خواہشوں کے بارے میں گفتگو کریں گے ۔

''ہویٰ'' کی اصطلاحی تعریف

جب ہم اسلامی علوم میں ہویٰ کے معانی تلاش کرتے ہیں تو ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی تہذیب وتمدن میں ہویٰ ''انسان کے اندر پوشیدہ ان خواہشات اور تمناؤں کو کہا جاتا ہے جو انسان سے اپنی تکمیل کے خواہاں ہوتے ہیں ۔ ''انسان کی شخصیت میں ان کا اہم کردار ہوتا ہے کیونکہ یہ انسان کو متحرک بنانے اوراسے آگے بڑھانے کا ایک بنیادی سبب نیز اسکی تمام ارادی اور غیرارادی حرکتوں کی اہم کنجی ہیں ۔

''ہویٰ'' کے خصوصیات

انسانی زندگی کی تعمیر یا بربادی میں اسکی نفسانی خواہشوں کے مثبت اور منفی کردارسے واقفیت کے لئے سب سے پہلے ان کی اہم خصوصیات کوجاننا ضروری ہے لہٰذا ہم آئندہ صفحات میں اسلامی نقطۂ نگاہ سے خواہشات نفس کے اہم خصوصیات کا جائزہ لیں گے ۔

۱۔چاہت میں شدت: اپنی چاہت کی تکمیل میں بالکل آزاد اور بے لگام ہونا انسانی خواہشات کی سب سے پہلی اور اہم ترین خصوصیت ہے البتہ سیر ہونے یا نہ ہونے کے اعتبار سے اس کے مختلف درجات ہیں کیونکہ کچھ خواہشات تو ایسی ہوتی ہیں جن سے کبھی سیری نہیں ہو پاتی اور چاہے جتنا بھی اس کی تکمیل کی جائے اس کی طلب اور چاہت میں کمی نہیںآتی ۔جبکہ کچھ خواہشات ایسی ہیں جو وقت کے ساتھ سرد تو پڑجاتی ہیں مگر بہت دیر کے بعد۔ مختصر یہ کہ ان تمام خواہشات کے درمیان اعتدال اور توازن کے بجائے شدت طلبی ایک مشترکہ صفت ہے۔ جیسا کہ رسول اکرم صلى الله عليه وآله وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: (لَوکَانَ لِابْنِ آدَمَ وادٍمن مال لابتغیٰ إلیہ ثانیاً،ولوکان لہ وادیان لابتغیٰ لھما ثالثاً،ولایملأ جوف ابن آدم إلاالتراب[1]) ''اگر فرزند آدمؑ کے پاس مال ودولت کی ایک وادی ہوتی تو وہ دوسری وادی کی تمنا کرتا اور اگر اس کے پاس ایسی ہی دو وادیاں ہوتیں تب بھی اس کو تیسری وادی کی تمنا رہتی اور اولاد آدم کا پیٹ مٹی کے علاوہ کسی اور چیز سے نہیں بھر سکتا ہے''پیغمبر اکرم صلى الله عليه وآله وسلم نے یہ بھی فرمایا ہے: (لوکان لابن آدم وادیان من ذہب لابتغیٰ وراء ہما ثالثاً[2]) ''اگر آدمی کو سونے کی دو وادیاں مل جائیں تو بھی اسے تیسری وادی کی تلاش رہے گی'' جناب حمزہ بن حمران کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں یہ شکایت کی کہ مجھے جس چیز کی خواہش ہوتی ہے وہ مجھے مل جاتی ہے تب بھی میرا دل اس پر قانع نہیں ہوتا ہے اور مزید کی خواہش باقی رہتی ہے ،لہٰذا مجھے کوئی ایسی چیز تعلیم فرمائیے جس سے میرے اندر قناعت پیدا ہو جائے اور مزید کی خواہش نہ رہے توامامؑ نے فرمایا '':جو چیز تمہارے لئے کافی ہے اگر وہ تمھیں مستغنی بنا دے تو دنیا میں جو کچھ موجود ہے اس کا معمولی سا حصہ بھی تمھیں مستغنی بنانے کے لئے کافی ہے اور جو چیز تمہارے لئے کافی ہے اگر وہ بھی تمہیں مستغنی نہ بنا سکے تو پھر پوری دنیا پاکر بھی تم مستغنی نہیں ہو سکتے ہو[3] ''امیرالمومنینؑ فرمایا کرتے تھے '':اے فرزندآدم،اگر تجھے دنیا صرف اتنی مقدار میں درکار ہو جو تیری ضروریات کے لئے کافی ہو سکے تو اس کا معمولی سا حصہ بھی

[1] الجامع الصغیرللسیوطی بشرح المناوی۔ ج۲ص۲۲۰ط ۱۳۷۳۔
[2] مجموعۂ ورام ص۱۶۳۔
[3] بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۷۰۔

تیرے لئے کافی ہے اور اگر تجھے وہ چیز بھی درکار ہے جو تیرے لئے ضروری نہیں تو پوری دنیا بھی تیرے لئے ناکافی ہے[1]

''مذکورہ روایات میں خواہشات کی مزید طلب برقراررہنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ کبھی ان کی تکمیل ممکن ہی نہیں ہے بلکہ ان کی شدت طلب کو بتانا مقصود ہے اور یہ کہ عموماً خواہشات حد اعتدال پر قائم نہیں رہتے ۔ورنہ بعض خواہشات ایسی ہوتی ہیں جو زندگی کے آخری مرحلہ میں بالکل کمزور پڑجاتی ہیں حالانکہ کچھ ایسی خواہشات بھی ہیں جوانسان کے آخری سانس تک بالکل جوان رہتی ہیں اور ان میں کسی قسم کی کمی واقع نہیں ہوتی ہے[2] ۔میں خداوند عالم کے ایک ایسے بندۂصالح کو پہچانتا ہوں جس نے توفیق الٰہی کے سہارے جوانی میں ہی اپنے نفس پر غلبہ حاصل کرلیا تھا ۔جب ان کی عمر ۹۰سال کے قریب ہوئی توان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی وہ فرمایا کرتے تھے کہ بنیادی طور پر صرف تین خواہشات ہیں : ۱۔جنسیات ۲۔مال ۳۔عہدہ پہلی دو خواہشات کو تو میں نے اپنی جوانی میں ہی رام کرکے ان پر غلبہ حاصل کرلیا تھا لیکن تیسری خواہش اب بھی میرے دل میں مسلسل ابھرتی رہتی ہے اور مجھے اس کی بنا پر شرک میں پڑنے کا خطرہ لاحق رہتا ہے ۔

۲۔خواہشات میں تحرک کی قوت: خواہشات، انسان کی حرکت و فعالیت کا سب سے اہم اور طاقتور ذریعہ ہیں اور ان کے اندر پائی جانے والی قوت متحرکہ کے بارے میں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ خواہشات نفس و ہ تنہا سبب ہیں جوجاہلانہ تہذیب و تمدن کو پروان چڑھاتے رہے ہیں اورتاریخی نیز جغرافیائی لحاظ سے یہی جاہلانہ تمدن روئے زمین کے بیشتر حصوں پر حکم فرمارہاہے ۔اس جاہلانہ تمدن میں فطرت، ضمیراورعقل کی حکم فرمائی کا سرے سے انکار تو نہیں کیا جاسکتاہے لیکن یہ طے شدہ ہے کہ اس تمدن کی پیشرفت میں خواہشات ہی سب سے بڑاعامل اور سبب ہیں چاہے وہ جنگ و صلح کے معاملات ہوں یا اقتصاد اور علوم وفنون کے میدان یا دیگر جرائم سب اسی کی کوکھ سے جنم لیتے رہے ہیں ۔انسانی تاریخ کے بیشتر ادوارمیں جاہلیت کی حکمفرمائی دیکھنے کے بعد خواہشات میں پائی جانے والی قوت متحرکہ کی وسعت کا بآسانی اندازہ لگایا جاسکتاہے۔روایت میں ہے کہ جناب زیدبن صوحان نے امیر

---

[1] بحار الانوار ج ۷۳ ص ۱۷۰۔

[2] انس نے رسول ؐسے (جامع صغیر سیوطی حر ف (ی)ج۲ص۳۷۱)پر روایت کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا ہۂ''فرزند آدم بالکل بوڑھا پھوس ہوجاتا ہے مگر اس کے ساتھ دو چیزیں باقی رہ جاتی ہیں لالچ اور آرزو ۔''

المومنینؑ سے سوال کیا: (ای سلطان اغلب وأقویٰ) ''کس بادشاہ کا کنٹرول اور غلبہ سب سے زیادہ ہوتا ہے تو آپ نے فرمایا:
(الھوی) '' خواہشات کا[1]۔ ''اسی طرح قرآن مجید نے عزیز مصر کی بیوی کا یہ اقراری جملہ نقل کیا ہے: (إن النفس لأمارۃ بالسوء
إلاما رحم ربی[2]) ''نفس تو برائیوں کی طرف ہی اکساتا ہے مگر یہ کہ جس پر خدا رحم وکرم کردے (وہی اس سے علمائے نحو کے بقول
اس جملے میں نحوی اعتبار سے اتنی تاکیدیں پائی جاتی ہیں جو بہت کم جملوں میں ہوتی ہیں جیسے یہ جملہ اسمیہ ہے اور اسکی ابتداء میں ان پھرا
مارہ صیغۂ مبالغہ اور اسکے شروع میں لام تاکید یہ سب کثرت تاکید کی علامتیں ہیں۔

محفوظ رہ سکتا ہے)''یہ مختصر سا جملہ انسانی زندگی پر خواہشات کے مستحکم کنٹرول کی ایک مضبوط سند ہے۔اور امیر المومنینؑ سے
منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: (الخطایا ''الشھوات''خیل شُمُس حُمل علیھاأھلھا،وخُلِعَت لُجُمھا،فتقحمت بھم فی النار،ألاوان التقویٰ
مطایاذُلُل،حُمل علیھاأھلھا،وأعطواأزِمتھا،فأوردتھم الجنۃ[3]) ''خطائیں اور ''خواہشات'' وہ سرکش گھوڑے ہیں جن پر کسی کو سوار
کرکے انکی لگام اتاردی جائے اور وہ اپنے سوار کو لیکر جہنّم میں پھاند پڑیں لیکن تقویٰ وہ رام کی ہوئی سواریاں ہیں جن پر صاحبان
تقویٰ کو سوار کرکے ان کی لگام انکے ہاتھ میں دیدی جائے اور وہ ان کو جنّت میں پہونچادیں'' شمس دراصل شموس کی جمع ہے اور
شموس اس سرکش اور اڑیل گھوڑے کو کہتے ہیں جو کسی کو اپنے اوپر سوار نہیں ہونے دیتا اور نہ ہی سوار کا تابع رہتا ہے۔گویا سوار
اسے لگام لگائے بغیر اس پر سوار ہوگیا تووہ اسکے قابو میں نہیں رہتااور وہ سوار کو لے اڑتاہےاور سوار بھی اسے اپنے کنٹرول میں
نہیں رکھ پاتا ۔یہی حال خواہشات کا بھی ہوتا ہے جو اپنے اسیرانسان کوہر طرف لئے پھرتی ہیں اور وہ ان خواہشات کو صحیح جہت
نہیں دے پاتا اور ان پر اپنا قابو اسی طرح کھو بیٹھتا ہے جس طرح ایک سرکش گھوڑا بے قابو رہتا ہے۔اسکے برخلاف تقویٰ انسان
کو اسکے خواہشات نفس اور ہوی وہوس پر قابو رکھنے کی قوت عطا کرتا ہے اور نفس کو اسکا مطیع اور فرمانبردار بنا دیتا ہے جسکے
بعدانسان جدھر چاہے انکا رخ موڑ سکتا ہےاورانہیں خواہشات کے ذریعہ وہ جنت میں پہنچ سکتا ہے۔

[1] بحارالانوار ج۷۰ص۷۶حدیث۶۔
[2] سورۂ یوسف آیت ۵۳۔
[3] نہج البلاغہ خطبہ ۱۵۔

۳۔ خواہشات اور لالچ کی بیماری طمع اور لالچ خواہشات کی تیسری خصوصیت ہے جس کی بنا پر خواہشات کی طلب میں اوراضافہ ہوجاتا ہے اور اسکی خواہش بڑھتی رہتی ہے ۔ جبکہ دیگر مطالبات میں معاملہ اسکے بالکل بر عکس ہوتاہے کیونکہ جب انسان کسی اور مطالبہ کو پورا کرتا ہے تو اسکی گذشتہ شدت اور کیفیت و کمیت باقی نہیں رہتی بلکہ شدت میں کمی آتی ہے اور سیرابی کا احساس ہوتاہے ۔ لیکن خواہشات کامعاملہ یہ ہے کہ اگر ان کے مطابق عمل کرتے رہیں تو ان کی طلب میں اضافہ ہوتا جاتاہے،ان کی چاہت کا لاوا مزید ابلنے لگتاہے ۔ جسکے بعد دھیرے دھیرے ان پر انسان کا کنٹرول نہیں رہ جاتا لیکن اگر معقول ضابطہ کے تحت،اعتدال کے دائرہ میں رہ کر ان خواہشات کو پورا کیا جائے تو پھر ان کے مطالبات خود بخود سردپڑجاتے ہیں اورانسان بخوبی انکے او پر غلبہ حاصل کرلیتاہے۔

مختصر یہ کہ بالکل آگ کی طرح ہوتی ہیں کہ اس میں جتنی زیادہ پھونک ماری جاتی ہے اسکے شعلے مزید بھڑکنے لگتے ہیں اسکی لپٹیں اور بلند ہو جاتی ہیں ۔ لہٰذا شرعی حدود میں رہ کر مناسب اور معقول انداز میں ان خواہشات کو پورا کرناان کو آزاد اور بے لگام چھوڑدینے سے بہتر ہے کیونکہ اگر بلاقید و شرط ان کی پیروی کی جائے تو ہر قدم پر تشنگی کا احساس ہوتارہے گااور خواہشات پر انسان کا اختیاربالکل ختم ہو جائے گا ۔ان دونوں ہی باتوں کی طرف روایات میں اشارہ موجود ہے۔ ا۔ خواہشات کی بلاقید و شرط تکمیل سے ان کی شدت میں اور اضافہ ہوتاہے اور ان کے مطالبات بڑھتے ہی رہتے ہیں اور اسکے برعکس اگر صرف شرعی حدود کے دائرہ میں ان کی تکمیل ہوتو سیرابی حاصل ہوتی ہے ۔جیسا کہ مولائے کائنات ؑنے فرمایا ہے:(ردالشھوۃ أ قضی لھا،وقضاؤھاأشدلھا[۲])'' شہوت اور خواہش کو ٹھکرادینا ہی اسکے ساتھ بہترین انصاف ہے اور اسکو پورا کرنا اسے مزید بڑھاوا دینا ہے۔ ''یہاں خواہش کو ٹھکرادینے سے مراد محدود اور معقول پیمانہ پر ان کی تکمیل ہے ۔اور تکمیل سے مراد انہیں بے لگام چھوڑدینا اور ان کی تکمیل میں کسی قاعدہ و قانون کا لحاظ نہ رکھناہے۔

---

[۱] خواہشات سے ہماری مراد تمام چاہتیں نہیں ہیں ۔کیونکہ بعض چاہتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں یہ قاعدہ درست نہیں ہے ۔
[۲] غررالحکم ج۱ص۳۸۰۔

۲۔خواہشات کی بے جا تکمیل اور اس راہ میں افراط کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان خواہشات کے سامنے انسان اتنا بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنی خواہشات پر اس کا کوئی اختیار نہیں رہ جاتا اور وہ ان کا غلام اور نوکر بن کر رہ جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف اگر انسان واقعاً کسی اصول و ضابطہ کے مطابق محدود پیمانہ پران کی تکمیل کرے تو پھر اپنی خواہشات پر اسکا مکمل اختیار رہتا ہے اور وہ انہیں جدھر چاہے موڑسکتا ہے۔امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے: (مثل الحریص علی الدنیا کمثل دود القز،کلماازدادت من القزعلی نفسھا لفاکان أبعد لھا من الخروج حتیٰ تموت[1]) دنیا کے لالچی انسان کی مثال ریشم کے اس کیڑے جیسی ہے کہ جو اپنے اوپر جتنا ریشم لپیٹا جاتا ہے اسکے نکلنے کا راستہ اتنا ہی تنگ ہوتا جاتا ہے اور آخر کار وہ موت کے منھ میں چلا جاتا ہے۔

خواہشات پر عقل کی حکومت

اگر چہ انسان پر خواہشات کی حکومت بہت ہی مستحکم ہوتی ہے لیکن عقل کے اندر ان خواہشات کو کنٹرول کرنے اور انہیں صحیح رخ پرلانے کی مکمل صلاحیت اورقدرت پائی جاتی ہے۔بشرطیکہ انسان خواہشات پر عقل کو فوقیت دے اور اپنے معاملات زندگی کی باگ ڈور عقل کے حوالہ کردے۔صرف یہی نہیں بلکہ جس وقت خواہشات پر عقل کی گرفت کمزور پڑجاتی ہے اور خواہشات اسکے دائرہ اختیار سے باہر نکل جاتے ہیں تب بھی عقل کی حیثیت حاکم و سلطان کی سی ہوتی ہے وہ حکم دیتی ہے،انسان کو برے کاموں سے روکتی ہے،اور خواہشات ،نفس کے اندرصرف وسوسہ پیدا کرتے ہیں حضرت علیؑ نے فرمایاہے:(للنفوس خواطر للھویٰ،والعقول تزجروتنھیٰ[2]) ''نفوس کے اندر مختلف خواہشیں سر ابھارتی ہیں اور عقلیں ان سے مانع ہوتی ہیں اورانہیں روکتی رہتی ہیں''آپؑ ہی سے منقول ہے: (للقلوب خواطرسوء،والعقل یزجرمنھا[3]) ''دلوں میں برے خیالات آتے ہیں اور عقل ان سے روکتی رہتی ہے''اس کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات کی بناء پر انسان کے نفس میں صرف برے خیالات،اوہام اور وسوسے جنم لیتے ہیں لیکن عقل کے پاس انہیں کنڑول کرنے نیز ان سے روکنے کا اختیار موجود ہے اور اس کی حیثیت حاکم و سلطان کی سی ہے۔

---

[1] بحار الانوار ج۷۳ص۲۳۔
[2] تحف العقول ص۹۶۔
[3] غررالحکم ج۲ص۱۲۱۔

اسی لئے مولائے کائناتؑ نے فرمایاہے:(العقل الکامل قاھر للطبع السّوء[1]) ''عقل کامل ،بری طبیعتوں پر غالب ہی رہتی ہے''،جسکا مطلب یہ ہوا کہ انسانی مزاج اور اسکا اخلاق،بے جا خواہشات کی بناء پر بگڑ کر چاہے جتنی پستی میں چلاجائے تب بھی عقل کی حکومت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اور عقل سلیم وکامل اپنے اندر ہر قسم کی بری طبیعت اور مزاج کو قابو میں رکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔یہ اسلامی تربیت کا ایک اہم اصول ہے جسکے بارے میں ہم آئندہ تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

انسان،عقل اور خواہش کا مجموعہ

یہاں تک ہم اس واضح نتیجہ تک پہونچ چکے ہیں کہ خواہشیں کتنی ہی قوی اور موثر کیوں نہ ہوں لیکن وہ انسان سے اسکا ارادہ اور قوت ارادی کونہیں چھین سکتی ہیں۔بشرطیکہ انسان عقل کو کامل بنالے اور معاملات زندگی میں عقل کو اہمیت دیتا رہے کیونکہ انسان، عقل اور خواہشات سے مل کر بنا ہے لہٰذا عقل اور خواہشات کے باعث انسان ہمیشہ ترقی و تنزلی کی منزلیں طے کرتا رہتاہے انسان اپنے معاملات حیات میں جس حد تک عقل کی حاکمیت کا قائل ہوگا اور اپنی عقل کے تکامل کی کوشش کرے گا اسی حد تک ترقی اور کمال کی جانب قدم بڑھائے گا اسکے برخلاف عقل کو بالکل نظر انداز کرکے اور اس سے غافل ہو کراگر خواہشات کوعقل پر ترجیح دے گاتو اسی کے مطابق پستیوں میں چلاجائے گا۔

لیکن حیوانات کی زندگی کا معاملہ انسان کے بالکل بر خلاف ہے کیونکہ ان کے یہاں کہیں سے کہیں تک عقل کا گذر نہیں ہے اوروہاں سوفیصد خواہشات کی حکومت ہوتی ہے گویا وہ صرف ایک سبب کے تابع ہوتے ہیں اوران کی زندگی صرف اسی ایک سبب کے تحت گذرتی ہے۔مولائے کائنات کا ارشاد ہے:(إن اللّٰہ رکّب فی الملائکۃ عقلاً بلا شھوۃ،ورکّب فی البھائم شھوۃبلا عقل،ورکّب فی بنی آدم کلیھما۔فمن غلب عقلہ شھوتہ فھو خیر من الملائکۃ،ومن غلبت شھوتہ عقلہ،فھو شر من البھائم[2]) ''خداوند عالم نے ملائکہ کو صرف عقل دی ہے مگر خواہشات نہیں دیں اورحیوانات کو خواہشات دی ہیں مگر عقل سے نہیں نوازا ،مگر اولاد آدمؑ میں یہ دونوں چیزیں ایک

[1] بحار الانوار ج۱۷ص۱۱۶۔
[2] وسائل الشیعہ،کتاب الجھاد:جہاد النفس باب ۹ح۲۔

ساتھ رکھی ہیں لہٰذا جسکی عقل اس کی خواہشوں پر غالب آجائے وہ ملائکہ سے بہتر ہے اور جس کی خواہشیں اسکی عقل پر غلبہ حاصل کرلیں وہ حیوانات سے بدتر ہے''

خواہشات کی شدت اور کمزوری

اسلامی تہذیب کا ایک اہم مسئلہ خواہشات کی شدت اور کمزوری کا بھی ہے۔کیونکہ عین ممکن ہے کہ کوئی خواہش نہایت مختصر اور کم ہواور ممکن ہے کہ بعض خواہشات بھڑک کر شدت اختیار کرلیں ۔ چنانچہ اگر یہ مختصر ہوگی تو اس پر عقل حاکم ہوگی اور آدمی،انسان کامل بن جائے گا اوراگر یہی خواہشات شدت اختیار کرلیں تو پھر ان کا تسلط قائم ہوجاتا ہے اور انسان،حیوانیت کی اس پستی میں پہنچ جاتا ہے جہاں صرف اور صرف خواہشات کا راج ہوتاہے اور عقل وشعور نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہ جاتی ہے ۔

انسان چاہےاس حالت کے ماتحت ہو یا اس حالت کے ماتحت ہو ہر صورت میں خواہشات کی کمی یا زیادتی کا دارومدار خود انسان کے اوپر ہی ہوتا ہے کہ جب وہ خواہشات کا تابع ہوتاہے اور ان کے تمام مطالبات کو پورا کرتاہے تو خواہشات اور بھڑک اٹھتی ہیں اور انسان کو مکمل طور پر اپنا اسیر بنالیتی ہیں اور انسانی زندگی میں ایک مضبوط قوت کے روپ میں ابھرتی ہیں اور انسان کی زندگی میں ان کاکردار بہت اہم ہوتا ہے۔اوراسی کے برعکس جب انسان اپنی خواہشات پرپابندی لگاتارہے اوران کوہمیشہ حداعتدال میں رکھے اور خواہشات پرانسان کا غلبہ ہواور وہ عقل کے ماتحت ہوں تو پھر اسکی خواہشات ضعیف ہوجاتی ہیں اور انکا زور گھٹ جاتاہے ۔

ایک متقی کے اندر بھی وہی خواہشات ہوتے ہیں جو دوسروں کے اندر پائے جاتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ متقی افراد خواہشات کو اپنی عقل و فہم کے ذریعہ اپنے قابو میں رکھتے ہیں جبکہ بے عمل افرادپر ان کے خواہشات حاکم ہوتے ہیں اورخواہشات ان کو قابو میں کر لیتے ہیں۔ اس دور اہے پر انسان کوکوئی ایک راستہ منتخب کرناہے وہ جسے چاہے اختیار کرے۔

خواہشات کو کچل کر ان کا مالک و مختار بن جائے یا انکی پیروی کرکے ان کا غلام ہوجائے۔آئندہ صفحات میں ہم خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے کے کچھ طریقے ذکر کریں گے لیکن فی الحال آیات وروایات کی روشنی میں ان باتوں کا تذکرہ کر رہے ہیں جن سے خواہشات کی کمزوری یاشدت اور ان صفات کے اسباب کا علم حاصل ہوتاہے۔سب سے پہلے قرآن کریم کی آیات ملاحظہ فرمائیں۔اللہ تعالیٰ ارشادفرماتاہے:(ولکن اللہ حبَّب إلیکم الایمان وزیّنہ فی قلوبکم وکرّہ إلیکم الکفروالفسوق والعصیان[1])

''لیکن خدا نے تمہارے لئے ایمان کو محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں میں آراستہ کردیا ہے اور کفر،فسق اور معصیت کو تمہارے لئے ناپسندیدہ قرار دیدیا ہے'' فسوق (برائی) کی یہ نفرت خداوند عالم نے مومنین کے دلوں میں پیداکی اور اہل تقویٰ اس سے ہمیشہ متنفر رہتے ہیں مگر فاسقین اس پرلڑنے مرنے کو تیار رہتے ہیں اسکے واسطے جان توڑ کوشش کرتے ہیں اور اس کی راہ میں بیش قیمت اشیاء کو قربان کردیتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتاہے کہ کس ذات نے اس برائی کو مومنین کی نظروں میں قابل نفرت بنادیا؟کون ہے جس نے فاسقوں کی نگاہ میں اسے محبوب بنادیا؟یقیناً خدا وند عالم ہی نے مومنین کو اس سے متنفر کیا ہے۔کیونکہ مومن کا دل خداکے قبضۂ قدرت میں رہتا ہے لیکن برائیوں کو فاسقوں کیلئے پسندیدہ بنانے والی چیز خود ان برائیوں اور خواہشات کی تکمیل نیزان کوہرقیمت پر انجام دینے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے جسکی بناپر وہ ان کی من پسند چیز بن جاتی ہے ۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت ہے:(المداومة علیٰ الخیرکراهیة الشر[2]) ''کار خیر کی پابندی برائیوں سے بیزار و متنفر کرتی ہے''یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ اگر مسلسل کارخیر کی پابندی کی جاتی رہے تو خود بخود شر اور برائی سے نفرت پیدا ہوجاتی ہے شر سے مراد انسان کی وہ خواہشات اور لذتیں ہیں جن کے پیچھے لوگ دوڑتے رہتے ہیں۔یعنی فاسق اور گمراہ لوگ انھیں حرام خواہشات ولذائذ کے متلاشی رہتے ہیں۔اس کے برعکس ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح کارخیر کی پابندی کے باعث برائی سے نفرت ہوجاتی ہے اسی

[1] سورۂ حجرات آیت۷۔
[2] بحارالانوار ج۱ص۱۱۷۔

طرح یہ بھی ایک فطری بات ہے کہ ''برائیوں کی پابندی سے برائیوں کی محبت پیدا ہوجاتی ہے ''خطبہ متقین جو خطبہ ہمام کے نام سے مشہور ہے اس میں امیر المومنینؑ کا یہ ارشاد ہے: (تراہ قریباً أملہ، قلیلاً زللہ، خاشعاً قلبہ، قانعۃنفسہ، منزوراً أکلہ، سھلاً أمرہ، حریزاً دینہ، میتۃ شھوتہ، مکظوماً غیظہ[1]) ''متقین کی پہچان یہ ہے کہ ان کی آرزوئیں بہت مختصر، لغزشیں کم، دل خاشع، نفس قانع، غذا معمولی، معاملات آسان، دین محفوظ، خواہشات مردہ اور غیظ و غضب اور غصہ ٹھنڈا رہتا ہے''بیشک تقویٰ شہوات اور خواہشات کو مختصر اور سادہ بنا دیتا ہے جسکے نتیجہ میں حریص اور لالچی نفوس بھی متقی اور قانع ہو جاتے ہیں اور انکی خواہشات گھٹ کر گویا مردہ ہوجاتی ہیں۔

البتہ اس طرح کی روایات نقل کرنے سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ تقویٰ خواہشات کو لگام لگاکر ایک دم روک دیتا ہے (اگر چہ یہ بات اپنی جگہ پر کسی حد تک درست ہے)۔بلکہ نفس کے اوپر تقوی کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ خواہشات کو بہت ہی ہلکا اور سادہ بنا دیتا ہے اور اسی مقصد کے تحت ہم نے مذکورہ روایات بیان کی ہیں اب حضرت علیؑ سے مروی مندرجہ ذیل روایات ملاحظہ فرمائیں جنہیں ہم بغیر کسی تبصرہ کے پیش کررہے ہیں: (کلما قویت الحکمۃ ضعفت الشھوۃ[2]) ''جس قدر حکمت قوی ہوگی خواہش اتنی ہی کمزور ہوجائے گی'' (اذا کثرت المقدرۃ قلت الشھوۃ[3]) ''جب قدرت زیادہ ہوگی تو شہوت کم ہوجائے گی'' (العفۃ تضعف الشھوۃ[4]) ''عفت اور پاکدامنی شہوت کو کمزور بنا دیتی ہے'' (من اشتاق الیٰ الجنۃ سلا من الشھوات[5]) ''جو جنت کا مشتاق ہوا وہ خواہشات سے بری ہوگیا'' (واذکر مع کل لذۃ زوالھا، ومع کل نعمۃ انتقالھا، ومع کل بلیۃ کشفھا فإن ذلک أبقیٰ للنعمۃ وأنفیٰ للشھوۃ، وأذھب للبطر، وأقرب للفرج، وأجدر بکشف الغمۃ ودرک المأمول[6]) ''ہر لذت کے ساتھ اسکے زوال پر، ہر نعمت کے ساتھ اسکے منتقل ہونے اور ہر بلا کے ساتھ اسکے رفع ہونے پر بھی نظر رکھو کیونکہ یہ نعمت کو تادیر باقی رہنے، شہوت کو صاف و پاکیزہ بنانے، نعمت پر اترانے اور اسکی ناشکری کو ختم کرنے، آسانی اور کشادگی کو قریب کرنے، مشکلات اور پیچیدگیوں کو دور کرنے نیز آرزووں کی تکمیل کے لئے

[1] نہج البلا غہ خطبہ ۱۹۵(ہمام)
[2] غرر الحکم ج۲ص۱۱۱۔
[3] بحار الانوار ج۷۲ص۶۸ونہج البلاغہ حکمت ۲۴۴۔
[4] غرر الحکم ج۱ص۱۱۸۔
[5] نہج البلاغہ حکمت ۳۱۔
[6] غرر الحکم۔

سب سے زیادہ مناسب ہے۔ ''تقویٰ اور ضبط نفس کا تسلط انسانی خواہشات اور آرزووں پر اس حد تک ہوتا ہے کہ وہ انسانی خواہشات کو حدود الٰہیہ کے سانچہ میں ڈھال دیتے ہیں جسکے بعد انسان صرف وہی چاہتا اور پسند کرتا ہے جو خداوند عالم پسند کرتا ہے اور صرف اسی سے نفرت اور کراہت محسوس کرتا ہے جس سے خداوندعالم نفرت کرتاہے اور یہ انسانی نفس اور حدود الٰہیہ کے آپسی رابطہ کی آخری حد ہے اسی عجیب و غریب انقلاب کی طرف اس آیۂ کریمہ نے اشارہ کیا ہے: (وکرّہ إلیکم الکفر والفسوق والعصیان[1]) ''اور کفر،فسق اور معصیت کو تمہارے لئے ناپسندیدہ قرار دیدیا ہے'' اس مرحلہ میں تقویٰ کاانسان پر صرف یہی اثر نہیں ہوتا ہے کہ وہ کفر،فسق وفجور اور گناہ سے دوررہتا ہے بلکہ تقویٰ انسان کو ان باتوں سے متنفر بھی کردیتا ہے۔

انسانی زندگی میں خواہشات کا مثبت کردار

انسانی زندگی میں اسکی خواہشوں کی تباہ کاریوں کو دیکھنے کے بعد ہر انسان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ ان کی اتنی تباہ کاریوں کے باوجود بھی خداوند عالم نے انسان کے اندر ان خواہشات کو کیوں پیدا کیا ہے؟اور ان کا کیا فائدہ ہے ان میں ایسا کونسا مثبت پہلو پایاجاتا ہے جسکی بناپر انہیں خلق کیا گیا ہے؟اگر چہ آئندہ ہم خواہشات کی تباہ کاریوں اور اسکے منفی اثرات کا جائزہ لیں گے لیکن فی الحال اسکے مثبت اثرات اور فوائد کا تذکرہ کررہے ہیں۔

۱۔انسانی زندگی کا سب سے طاقتور محرک:انسانی خواہشات اس کی زندگی میں سب سے بڑا محرک ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حیات انسانی کے اہم ترین پہلوؤں کو انہیں خواہشات سے جوڑدیا ہے اوریہی خواہشات اسکی بنیادی ضرورتوں کی فراہمی کی ضامن ہیں۔جیسے تولید نسل، انسانی زندگی کی ایک بنیادی ضرورت ہے جس کے بغیر انسان صفحہ ہستی سے نابود ہوکر رہ جائے گا۔لہٰذا افزائش نسل اوراسکی بقاکے لئے کوئی ایساذریعہ یا جذبہ درکار تھا جسکی بنا پر نسل انسانی باقی رہے۔چنانچہ اس اہم مسئلہ کو خداوند عالم نے جنسی خواہشات سے جوڑکر بقائے انسانیت کا سامان فراہم کردیا۔اسی طرح جسمانی نشوونما کو کھانے پینے سے جوڑ دیا اگر آب ودانہ کی یہ

[1] سورۂ حجرات آیت۷۔

خواہش نہ ہوتو انسانی جسم نمو نہیں پاسکتا اور مسلسل جد و جہد کی وجہ سے اسکے بدن میں جو کمزوری پیدا ہوجاتی ہے اس کی کمی پوری نہیں ہوسکتی تھی اور اسکے بدن میں جو خلیے مردہ ہوجاتے ہیں ان کی جگہ زندہ خلیے حاصل نہ ہوپاتے۔اسی طرح خدا وند عالم نے اجتماعی زندگی کے لئے نفس میں سماج کی جانب رغبت اور رجحان کا جذبہ رکھا ہے اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو سماجی زندگی انتشار کا شکار ہوجاتی اور انسانی تہذیب و تمدن تارتار ہوجاتا ۔انسانی زندگی کے اقتصادی اور معاشی حصہ میں ملکیت اور مالکیت کا جذبہ کار فرما رکھا ہے۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو پھر اقتصادی نظام بالکل برباد ہوجاتا ۔جان ،مال،ناموس اور عزت و آبرو کے تحفظ کیلئے قوت غضب رکھی گئی ہے اگر انسان کے اندر یہ قوت نہ رہے تو پھر ہر سمت دشمنی کارواج ہوگا اور کہیں بھی امن وامان کا نام ونشان باقی نہ رہے گا اسی طرح انسان کے وہ دوسرے تمام ضروریات جن کے بغیر اسکے لئے روئے زمین پر زندگی گذار نا ممکن نہیں ہے ان کے لئے بھی خداوند عالم نے کوئی نہ کوئی جذبہ اور خواہش ضرور رکھی ہے اور اسی خواہش کے ذریعہ ان ضروریات کی فراہمی کا انتظام کیا ہے۔

۲۔خواہشات ترقی کا زینہ:خواہشات انسانی زندگی میں ترقی کا زینہ ہیں اسی کے ساتھ یہ وہ پھسلن بھرا راستہ بھی ہے جس پر چل کرانسان پستیوں میں بھی پہنچ سکتا ہے۔اوراسی زینہ کے ذریعہ خدا تک بھی پہونچ سکتا ہے یہی زینہ انسان کی ترقی اور تکامل میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جسکی تفصیل کچھ یوں ہے۔قرب خدا کی جانب انسان کا سفر اور اسی طرح انسان کی نشو ونما کادارو مداراس کے ''ارادہ''پر ہے جبکہ جمادات،حیوانات اورنباتات کی نشو و نما اور ان کاتکاملی سفر ایک فطری اور قہری انداز میں انجام پاتاہے۔اور اس میں ان کے کسی ارادہ کا دخل نہیں ہوتا ہے لیکن انسان کو خداوند عالم نے ''ارادہ''کے ذریعہ یہ خاص شرف بخشا ہے کہ اس کی ہر حرکت ،ہر کام اسکے اپنے ارادہ واختیار کے تحت انجام پاتاہے ۔ انسان اور کائنات کی دوسری تمام اشیاء مشیت وارادۂ الٰہی کے تابع ہیں اس اعتبار سے ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے فرق صرف اتنا ساہے کہ انسان اپنے ارادہ و اختیار کے ساتھ مشیت الٰہی کا تابع ہوتا ہے اوربقیہ کائنات فطری اورقہری طور پر یعنی اپنے ارادہ و اختیار کے بغیر مشیت الٰہی کے مطابق چلتی رہتی ہے۔احکام الٰہی دراصل خدا کی مشیت اور اس کے ارادہ کا مظہر ہیں جن پر بندہ اپنے اختیار سے چلتا ہے اسی طرح سنن الٰہی بھی

مشیت و ارادہ الٰہی کا مظہر ہیں جن پر جمادات نباتات اور حیوانات اپنے ارادہ و اختیار کے بغیر رواں دواں ہیں۔ اسی لئے انسان کو قرآن مجید میں: (خلیفۃ اللہ) قرار دیا گیاہے[1] اور اسکے علاوہ پوری کائنات کو (مسخرات بأ مرہ) ''اسکے حکم کی تابع ''کہا گیا ہے[2]۔ خلافت اور تسخیر کے درمیان ایک چیز مشترک ہے اور ایک لحاظ سے ان کے درمیان اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ ان کا مشترک پہلو یہ ہے کہ دونوں ہی مشیت و ارادۂ الٰہی کے تابع اور مطیع ہیں البتہ اس لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں کہ خلیفہ خدا (انسان) اپنے ارادہ و اختیار سے حکم الٰہی کی پابندی کرتا ہے اور (والمسخرات بامرہ) تقریباً مشینی انداز میں اپنے کسی ارادہ و اختیار کے بغیر حکم خدا پر چلتے رہتے ہیں۔ اور یہی نکتہ انسان کی عظمت و بلندی کا راز ہے کیونکہ اگر وہ بھی اپنے قصد و ارادہ سے خداوند عالم کی اطاعت نہ کرتا اور مجبور ہوتا تو پھر اسکے اور بقیہ پوری کائنات کے عمل میں کوئی فرق نہ ہوتا اور اس کے عمل کو کسی قسم کا امتیاز یا برتری حاصل نہ ہوتی۔ اسی ارادی اور اختیاری اطاعت نے دیگر مخلوقات کے مقابل انسان کو خلافت الٰہیہ کا اہل بنایا ہے اور اسی بناء پر اسکے ہر عمل کی قدر و قیمت بھی اسکی محنت و مشقت کے متناسب ہوتی ہے۔

چونکہ ارادی عمل میں جسمانی زحمت کے ساتھ نفسیاتی اور روحانی زحمت و مشقت بھی برداشت کرنا پڑتی ہے لہٰذا خدا کے نزدیک اس عمل کی قدر و قیمت زیادہ ہونی ہی چاہئے۔ ارادی عمل سے پیدا ہونے والی حرکت میں سرعت و استحکام بھی زیادہ ہونا چاہئے لہٰذا یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ ایک انسان تو کسی عمل کیلئے باقاعدہ زحمتیں اٹھائے اور دوسرا شخص بغیر کسی مشقت کے کوئی عمل انجام دے اور قدر و قیمت کے اعتبار سے دونوں برابر قرار دیدئے جائیں۔ جیسے ''کھانے پینے'' اور ''روزہ رکھنے'' کے درمیان زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے جبکہ چاہے کھانا پینا ہو اور یا روزہ ہو یہ سب اعمال قصد و ارادہ اور حکم الٰہی کی اطاعت کے جذبہ سے انجام پاتے ہیں لیکن کھانے پینے میں چونکہ انسان کے ارادہ پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا اور اس میں اسے کسی قسم کی زحمت و مشقت نہیں ہوتی ہے اور چونکہ ہر عمل کی قیمت کا اندازہ اس عمل کی راہ میں ہونے والی اس محنت و مشقت کو دیکھکر لگایا جاتا ہے جو اس عمل کو پایۂ

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ۳۰۔
[2] سورۂ اعراف آیت ۵۴ وسورۂ نحل آیت ۱۲ و ۷۹۔

تکمیل تک پہنچانے کیلئے درکار ہوتی ہے اور کیونکہ کھانے پینے میں ایسی کوئی خاص زحمت نہیں ہے لہٰذا روزہ کے برخلاف اس عمل کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں ہے۔ جس عمل میں زحمت و مشقت کی مقدار جتنی زیادہ ہوگی اس عمل کی قدر و قیمت بھی اسی اعتبار سے بڑھتی رہے گی۔ اور ایسا عمل انسانی ترقی اور قرب الٰہی کے سفر میں زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔

لہٰذا اصل حیثیت عمل پر صرف ہونے والی محنت و مشقت کی ہے اور اگر یہ محنت و مشقت نہ ہو تو پھر عمل بالکل بے قیمت ہوکر رہ جاتاہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ زحمت و مشقت کیا ہے؟یہ کیسے حاصل ہوتی ہے؟اور اسکے درجات مختلف کیوں ہوتے ہیں؟اس زحمت و مشقت کو دینی اصطلاح میں ''ابتلا''یعنی امتحان اور آزمائش کہا جاتا ہے اور یہ زحمت و مشقت خواہشات اور آرزوؤں کے وقت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ اگر ہمارے وجود میں خداوند عالم کی ودیعت کردہ یہ خواہشات نہ ہوتیں یا اسی طرح ان خواہشات کی مخالفت کے بغیر اطاعت ممکن ہوتی تو پھر ہمارے کسی عمل کی کوئی قیمت باقی نہ رہ جاتی اور کوئی عمل بھی قرب الٰہی کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا۔

اس ابتلاء اور مشقت کے درجات میں تفاوت در اصل خواہشات اور آرزوؤں کی شدت و ضعف یا کمی وزیادتی کا نتیجہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ خواہشات جتنی زیادہ طاقتور ہونگی ان پر قابو پانے کیلئے انسان کو اتنی ہی مشقت اٹھا ناپڑے گی[1] اور عمل کو انجام دینے کیلئے خواہشات نفس کی جتنی زیادہ مخالفت درکار ہوتی ہے وہ عمل قرب خداکیلئے اتنا ہی بیش قیمت ہوتاہے اور اسی کے مطابق خداوندعالم اسے جنت میں ثواب عنایت فرما تاہے ۔ا۔ (عن أبی الجحیر،وکان من أصحاب النبی(ص) قال:اصاب النبی (ص) یوماجوع شدید،فوضع حجراً علیٰ بطنہ ثم قال: ''ألاربّ طاعمۃ،ناعمۃ،فی الدنیا جائعۃ،عاریۃیوم القیامۃ،ألاربّ مکرم لنفسہ،وھولھا مھین،ألاربّ مھین

---

[1] خواہشات کے بارے میں اسلام کا نظریۂ اعتدال واضح ہے اوراسے تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔مختصر یہ کہ: اسلام نہ تومکمل طورپر خواہشات کا گلا گھو ٹنے کی اجازت دیتاہے اور نہ وہ انھیں مطلق العنا ن چھوڑنے کاقائل ہے بلکہ اسلام کا ہر انسان سے صرف اتنا مطالبہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو شرعی احکام کے دائر ہ میں پورا کرتا رہے ۔
اس وضاحت کے بعد بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اپنے پروردگار کی جانب انسان کے ارتقائی سفر میں خواہشات کی کیا قدر وقیمت ہے کیونکہ قرب الٰہی کے ہر راہرو کو خواہشات اور آرزوؤں کے اس دلدل سے گذرناپڑے گاجسے خداوندعا لم نے ہر انسان کے وجود کا حصہ قرار دیا ہے ۔
اس وضاحت سے یہ نتیجہ اخذ ہوتاہے کہ جسطرح خواہشات پستی اور ہلاکت کا باعث ہیں اسی طرح خداوندعالم تک پہونچنے کا زینہ بھی ہیں یہ نظریہ اسلامی فکر کی امتیازی جدت کا ایک نمونہ ہے ۔
جس کی طرف متعدد روایات میں اشارہ پایاجا تا ہے مگرہم اس مقام پر بطور نمونہ صرف دوروایات ذکر کر رہے ہیں:

لنفسہ،وھولھا مکرم،ألا یارب متخوض،متنعم،فیما أفاء اللّٰہ علیٰ رسولہ،مالہ عنداللّٰہ من خلاق،ألاوإن ''عمل الجنۃ''حَزْنۃ بربوۃ، ألاوإن '' عملالنار '' سھلۃ بشھوۃ،ألایارب شھوۃ ساعۃٍأورثت حزناً طویلا) ''پیغمبر اکرم ﷺ کے ایک صحابی ابی بجیر کا بیان ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ کو بے حد بھوک لگی تھی تو آپ نے اپنے شکم مبارک پر پتھر رکھ لیا اور فرمایا : نعمتوں کے خواہشمند کتنے ایسے افراد ہیں جنہیں دنیا میں نعمتیں مل جاتی ہیں لیکن وہ قیامت کے دن بھوکے اور برہنہ ہونگے یا د رکھو! بظاہر اپنے نفس کی عزت کرنے والے نہ جانے کتنے لوگ خود نفس کی توہین کرتے ہیں ۔

اور نفس کو رسوا کرنے والے کتنے افراد ہیں جو دراصل نفس کی عزت افزائی کرتے ہیں ۔یاد رکھو! کتنے لوگ ان نعمتوں سے سرشار ہیں جو خداوندعالم نے اپنے رسول کو عنایت فرمائی ہیں مگر خدا کے نزدیک ان کا کوئی مرتبہ نہیں ہے یادرکھو!کہ جنت والا عمل ''حزنہ بربوۃ' (ناہموار پہاڑی پر چڑھنے کے مثل)ہےاور جہنمی اعمال خواہشات کے عین مطابق اور آسان ہیں یا د رکھو!بسا اوقات ایک ساعت کی شہوت ،طویل حزن و ملال کا سبب ہوتی ہے ۔''

اس روایت میں متعدد قابل توجہ فکر انگیز نکات پائے جاتے ہیں جن سے بےحد مفید نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں جیسے کتنے نفس ایسے ہیں کہ جب انہیں کسی چیز کی خواہش ہوتی ہے تو انہیں وہ نعمت مل جاتی ہے مگر وہ اپنی خواہشات کی بناء پر حرام وحلال کی کوئی فکر نہیں کرتے ۔ایسے لوگ روز قیامت بھوکے اوربرہنہ لائے جائیں گے۔اور اسی طرح بعض اپنی خواہشات اور آرزووں کو پورا کرنے کے بعد یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح اپنے نفس کی عزت و احترام میں اضافہ کررہے ہیں جب کہ در حقیقت وہ نفس کی توہین کرکے اسے تکلیف پہنچا رہے ہیں۔کچھ لوگ اپنے نفس کے ساتھ شدت اور سختی سے پیش آتے ہیں اور جب وہ کسی شہوت اور خواہش کی طرف آگے بڑھنا چاہتاہے تو صرف اسے روکتے ہی نہیں بلکہ اسکے ساتھ ساتھ اسکی توہین و تذلیل بھی کرتے ہیںیہ عمل در حقیقت اپنے نفس کی عزت افزائی اور احترام ہے۔اور کچھ ایسے ہیں جو بالکل اندھا دھنداپنی خواہشات میں ڈوبے رہتے ہیں انھیں صرف دنیاوی لذت سے مطلب ہے ایسے لوگوں کو آخرت میں کچھ ہاتھ آنے والانہیں ہے۔یہ لوگ آخرت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔

حدیث کے ان الفاظ پرمزید توجہ فرمائیں: (ألا وإن عمل الجنة حزنة بربوة)''حزنة ربو ة'' والاعمل جنت میں لے جاتا ہے۔''

''حزنہ'' ناہموار پتھریلی زمین اور '' ربوۃ'' اس پر چلنے کو کہا جاتا ہے۔جو شخص ناہموار اور پتھریلی پہاڑیوں پر چڑھتا ہے اسکا سانس پھول جاتا ہے اور ہمت جواب دینے لگتی ہے۔

اور آخری منزل تک پہنچنے تک اسکو بیحد مشقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جیسے دریا کے بہاؤ کے خلاف تیرنے میں انسان کی ہمت جواب دینے لگتی ہے لیکن ہموار راستہ پر چلنا یا دریا کے رخ کے مطابق تیرنا نہایت ہی آسان کام ہے یہی حال جنت اور جہنم کے اعمال یعنی اطاعت و معصیت کا بھی ہے کہ گناہ کرتے وقت تو انسان آسانی کے ساتھ خواہشات کے بہاؤ میں بہتا رہتا ہے لیکن اطاعت خدا کرتے وقت اسے اپنے نفس کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۲۔نہج البلاغہ میں منقول ہے کہ مولائے کائنات نے پیغمبر اکرمؐ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہؐ برابر یہ فرمایا کرتے تھے:(إن الجنة حفت بالمکارہ،وإن النار حفت بالشھوات،واعلموا :إنہ مامن طاعة اللہ شئ إلایأتی فی کرہ،وما من معصیة اللہ شئ إلایاتی فی شھوة،فرحم اللہ امرأ نزع نفسہ عن شھوتہ،وقمع ھویٰ نفسہ،فإن ھذہ النفس أبعد شی منزعا،وإنھا لاتزال تنزع إلی معصیة فی ھویٰ[1]) ''جنت کے چاروں طرف مشکلات اور زحمتوں کا حصار ہے اور جہنم کے چاروں طرف شہوتوں (خواہشات)کا گھراؤ ہے اور یہ یاد رکھو کہ خدا کی کوئی اطاعت ایسی نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ زحمت اور ناگواری کا پہلو نہ ہو اور اسکی کوئی معصیت ایسی نہیں ہے جس میں شہوت اور ہوی وہوس شامل نہ ہو۔ اللہ اس بندے پر رحمت نازل کرے جو اپنے نفس کو ہویٰ وہوس سے دور کرلے اور اپنی ہوس کو بالکل اکھاڑ پھینکے کہ یہ نفس خواہشات میں بہت دور تک کھینچ لے جانے والا ہے اور ہمیشہ گناہوں کی خواہش کی طرف ہی کھنچتا رہتا ہے''یہ حدیث ہمارے اس نتیجہ کی بہترین دلیل ہے جسے ہم نے روایات سے اخذ کرکے یہاں پیش کیا ہے کیونکہ جنت و جہنم ہی ہر انسان کی آخری منزل ہے جو انسان خداوند عالم کی طرف محو حرکت ہے وہ جنت میں جائے گا اور جو اسکی نافرمانی کرے گا وہ انتہائی

[1] نہج البلاغہ خطبہ۱۷۶

پستیوں میں پہنچ کر جہنم کا نوالہ بن جائے گا۔جنت کے چاروں طرف مشکلات اور ناگواریوں کے حصار کا مطلب یہ ہے کہ اس تک پہونچنے کے لئے انسان کو ہر طرح کی مشکلات سے گذر ناپڑتا ہے یعنی خواہشات اور ہوی وہوس پر قابو پانے ،تسلط حاصل کرنے اوراسے کچلنے کے لئے سخت زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جبکہ جہنم کے ہر طرف خواہشات اور ہوی و ہوس کا بسیرا ہے انسان خواہشات اور ہوی وہوس کے درمیان پھسل کرہی تنزلی اور پستیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی اس حدیث کی روشنی میں امیر المومنینؑ نے ایک عام اصول ہمارے حوالے کردیا ہے:(مامن طاعۃ اللہ شیء إلایاتیفی کرہ ،ومامن معصیۃ اللہ شیءإلایاتی فی شھوۃ) ''ہر اطاعت خدا کے وقت کچھ نہ کچھ ناگواری ضرور محسوس ہوتی ہے اور ہر گناہ میں ہوس کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور پایا جاتا ہے '' اطاعت الٰہی کرتے وقت نفس کو اسکی خواہشات و لذات اور ہویٰ و ہوس سے دور رکھنے کے لئے انسان کو ناگواری کا احساس ہوتاہے جبکہ وہ گناہوں میں لذت محسوس کرتا ہے کیونکہ اس سے نفس کی ہوس اور خواہشات پوری ہوتی ہیں اور اسے کسی قسم کے اندرونی ٹکراؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

ان تمام تفصیلات کے بعد یہ حقیقت بآسانی قبول کی جاسکتی ہے کہ انسان کے لئے خداوندعالم تک پہونچنے کی راہیں خواہشات اور لذتوں کی دشوار گذاروادیوں سے ہوکر ہی گذرتی ہیں اورانسان خواہشات کے زینہ سے ہی ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا خداوند عالم تک پہونچتا ہے۔ اگرانسانی وجود میں یہ خواہشات نہ ہوتیں تو انسان کے لئے اس منزل معراج وکمال تک پہونچنا ہرگز آسان نہ ہوتا جس کااسے اہل قرار دیاگیا ہے۔

عمل اور رد عمل کا سلسلہ

خداوند عالم نے انسانی وجود میں خواہشات کو ودیعت فرماکر اسکے لئے درحقیقت ایک ایساذخیرہ فراہم کردیا جس سے انسان اپنی ہر ضرورت پوری کر سکتاہے ۔جیسے پروردگار نے انسان کے لئے زمین کے اندر کھانے پینے اور لباس کی جملہ ضروریات،سمندروں

میں پینے اور سینچائی کے لئے پانی فضا میں ہوا اور سانس کے لئے مختلف اقسام کے ذخائر فراہم کردئیے کہ انسان ان تینوں عناصر سے حسب ضرورت آب و غذایا دوسرے خام مواد حاصل کرتاہے۔اسی طرح خداوند عالم نے ان خواہشات کے ضمن میں نفس انسانی کے اندر علم ومعرفت ،یقین اور بندگی کے خزانے بھی ودیعت فرمائے ہیں۔نفسانی خواہشات در حقیقت حیوانی وجود کا مقدمہ ہیں اوران خواہشات کا اکثر حصہ حیوانات کے اندر پایا جاتا ہے صرف انسان ایک ایسی مخلوق ہے جسکو خداوند عالم نے ''ارادہ'' کے ذریعہ ان خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے ،انہیں روکنے یا محدود رکھنے کی صلاحیت بھی عنایت فرمائی ہے اوراسی ارادہ کے ماتحت ہوجانے کے بعد یہ اڑیل اور خود سر حیوانی خصلتیں بھی بہترین روحانی اور اخلاقی فضائل و اقدار ،بصیرت ویقین، عزم واستقلال اور تقوی وپرہیزگاری جیسی حسین شکل اختیار کر لیتی ہیں۔وہ خواہشات جن سے انسان کے اندر حیوانی اور جسمانی پہلو کی تشکیل ہوتی ہے یہ جب کنٹرول اور قابو میں رکھنے والے اسباب کے ماتحت آتی ہیں تو اخلاقی اقدار میں تبدیل ہوجاتی ہیں اور وہی خواہشات اس کے ''انسانی'' پہلو کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتاہے کہ یہ خود سر حیوانی خواہشات تقویٰ اور پرہیزگاری کے ذریعہ کس طرح ان بلند وبالا انسانی اقدار میں تبدیل ہوتی ہیں اور تقوی و پرہیزگاری کی بنا پر نفس کے اندرکس قسم کے تغیرات اورتبدیلیاں رونما ہوتے ہیں جو اس حیوانی خصلت کو علم ویقین اور صبر و بصیرت میں تبدیل کردیتے ہیں؟اسکا جواب ہمیں نہیں معلوم ہے۔بلکہ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتاہے کہ ایک تو یہ کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے۔ اور مزید افسوس یہ کہ علم ومعرفت کا یہ وسیع باب انسان کیلئے آج تک نہ کھل سکا اور قدیم وجدید ماہرین نفسیات یہاں تک کہ اسلامیات کے ماہرین میں سے کوئی بھی آج تک اس گتھی کو سلجھانے میں کامیاب نہیں ہوسکاہے۔لیکن جب ہم خود اپنے نفس کے اوپر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اسکے اندر بڑے پیمانہ پر رونما ہونے والے عمل اور رد عمل کے سلسلہ کا صاف اشارہ ملتاہے جیسے حیاء،جنسی خواہشات پر غلبہ حاصل کرنے کا ''ذریعہ''ہی نہیں ہے بلکہ حیاء ان خواہشات کو کچلنے کا ''نتیجہ''بھی ہے۔چنانچہ انسان ادب،فن اور ذوق کے غیر اخلاقی مواقع پر جس حد تک جنسی خواہشات کو کچلتا رہتاہے اس کی حیامیں اتنا ہی

اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ادب سے ہماری مراد ،ہرگز بدکاری نہیں ہے البتہ وہ بلندپایہ ادب ،فن اور ذوق جس کی بناء انسان حیوانیت سے ممتاز ہوتاہے وہ اسی قوت برداشت اور تقوی کی بناء پر حاصل ہوتا ہے۔اس سلسلہ میں جب ہم قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اسکے اندر بھی ہمیں واضح طورپر اشارے ملتے ہیں جو ہمیں اپنے نفس کے بارے میں غور کرنے سے حاصل ہورہے تھے ۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے :(۔واتقوااللہ و یعلمکم اللہ ۔[1])''یعنی تم پر ہیزگار اور متقی بن جاؤاور خداوند عالم تم کو دولت علم عطا فرمائے گا''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس آیت کا دوسرا جملہ (و یعلمکم اللہ) پہلے جملہ پر بغیر کسی رابطہ کے عطف کیا گیاہے اوران دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہے؟یا ایسا نہیں ہے،بلکہ علم و تقویٰ میں گہرا رابطہ ہےاور یہ دونوں جملے در حقیقت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں ۔

اور ایک ترازو کے دوپلڑوں کی طرح ہیں؟جو شخص بھی قرآن مجید کے اسلوب سے باخبر ہے وہ اسمیں کوئی شک وشبہ نہیں کرسکتا اوروہ یقینی طورپر جانتاہے کہ یہ دونوں جملے ایک ہی ترازو کے دوپلڑوں کی مانند ہیں۔ خداوند عالم نے اپنے بندوں کے لئے یہاں جس علم کاتذکرہ فرمایا ہے وہ علم تقوی کا ہی نتیجہ اور اثر ہےاور یہ علم اس علم سے بالکل مختلف ہے جسے ہم تعلیم کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ یہ علم،نور ہے جو خداوند عالم اپنے جس بندے کو چاہتا ہے عطا فرمادیتا ہے۔

اس نور کی طرف سورۂ حدید کی یہ آیۂ کریمہ بھی اشارہ کر رہی ہے:(یاأیھاالذین آمنواا تقوااللہ وآمنوابرسولہ یؤتکم کفلین من رحمتہ و یجعل لکم نوراً تمشون بہ[2])''ایمان والو اللہ سے ڈرو اور رسول پر واقعی ایمان لے آؤ تاکہ خدا تمہیں اپنی رحمت کے دوہرے حصے عطا کردے اور تمہارے لئے ایسا نور قرار دیدے جسکی روشنی میں چل سکو''اس نور سے مراد علم ہے لہٰذا سورۂ بقرہ اور سورۂ حدید دونوں مقامات پرعلم اور تقویٰ کے درمیان ایک جیسارابطہ پایا جاتا ہے۔تقویٰ خواہشات کے طوفان کے سامنے بند باندھنے کا نام ہے اور خواہشات کے سامنے لگائی جانے والی یہی بندش ایک دن نور علم و بصیرت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔جناب یوسف کے

[1] سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲۔
[2] سورۂ حدید آیت۲۸۔

واقعہ کے ذیل میں ارشاد الٰہی ہے: (ولمابلغ أشده آتیناه حکماً وعلماً وکذٰلک نجزی المحسنین[1]) ''اور جب یوسفؑ اپنی جوانی کی عمر کو پہونچے تو ہم نے انہیں حکم اور علم عطا کردیا کہ ہم اسی طرح نیکی کرنے والوں کو جزا دیا کرتے ہیں''جناب موسیٰ کے قصہ میں بھی بعینہ یہی تذکرہ موجود ہے: (ولمابلغ أشده واستویٰ آتیناه حکماً وعلماً وکذٰلک نجزی المحسنین[2]) ''اور جب موسی جوانی کی توانائیوں کو پہونچے اور تندرست ہوگئے تو ہم نے انہیں علم اور حکمت عطا کردی اور ہم اسی طرح نیک عمل کرنے والوں کو جزا دیا کرتے ہیں''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے جناب موسیؑ اور جناب یوسفؑ کو اس خاص انعام سے کیوں نوازا دوسرے لوگوں کو یہ نعمت کیوں نہیں ملی؟کیاخدا یوں ہی بلاسبب اپنے بعض بندوں کو ایسے اعزاز سے نوازدیتاہے اور دوسروں کو محروم رکھتاہے؟یا ایسا نہیں ہے بلکہ یہ سب تبدیلیاں ثابت واستوار الٰہی سنتوں کے تحت انجام پاتی ہیں۔جو لوگ قرآنی لہجہ سے واقف ہیں انھیں اس بات میں ذرہ برابر بھی شک وشبہ نہیں ہوسکتا کہ ان دونوںآیتوں میں علم وحکمت کا تعلق ''احسان''سے قراردیا گیا ہے۔

''وکذٰلک نجزی المحسنین''اور ہم احسان کرنے والوں کو اسی طرح جزادیا کرتے ہیں''

تو جب وہ علم وحکمت جو جناب موسیؑ اور جناب یوسفؑ کو خدا کی طرف سے عطا کی گئی ہے وہ سنت الٰہی کی بناء پر احسان سے مربوط ہے تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ محسنین اپنے احسان اور حسن عمل کی وجہ سے ہی رحمت الٰہی کے مستحق ہوتے ہیں اور اسی بناء پر ان کو اسکی بارگاہ سے علم وحکمت کی دولت سے نوازا جاتا ہے۔لہٰذا اس استدلال کی درمیانی کڑیوں کو چھوڑتے ہوئے ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ'' درحقیقت وہ احسان،علم وحکمت میں تبدیل ہوگیا ہے۔''اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ تقوی اور خواہشات نفس کی مخالفتؑاحسان کا واضح ترین مصداق ہیں۔فی الحال ہم اس موضوع کو مزید طول نہیں دے سکتے کیونکہ اس اہم موضوع کے لئے ہمارے پاس مناسب مقدار میں علمی مواد موجودنہیں ہے۔خدا وند عالم سے یہی دعا ہے کہ کوئی ایسا صاحب علم و کمال پیدا ہوجائے جو بہترین انداز سے اس مسئلہ کی گتھیاں سلجھا دے۔کیونکہ یہ بات توطے شدہ ہے کہ نفس کے اندر عمل اور رد عمل

---

[1] سورۂ یوسف آیت ٢٢
[2] سورۂ قصص آیت ١۴

کا سلسلہ بالکل اسی طرح رونما ہوتا رہتا ہے جس طرح فیزکس، کیمسٹری اور زولوجی وغیرہ کے میدانوں میں دکھائی دیتا ہے مثلاًحرارت حرکت میں تبدیل ہوجاتی ہے اور حرکت حرارت میں بدل جاتی ہے یا بجلی کی طاقت حرکت پیدا کردیتی ہے اور اسی حرکت سے بجلی بنائی جاتی ہے بالکل اسی طرح نفس کے اندر بھی عمل اور رد عمل کا سلسلہ پایا جاتا ہے جسکی طرف قرآن مجید کی بعض آیتوں میں سرسری اشارہ موجود ہے ،لہٰذا اسلام سے تعلق رکھنے والے علم النفس کے ماہرین کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نفس کے اسرار سے پردہ ہٹاکر ان کے اصول وقوانین کو تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

خواہشات کا تخریبی کردار

خواہشات اور طاغوت: انسانی زندگی میں بربادی کاایک مرکز انسانی ہویٰ و ہوس اور خواہشات ہیں اور دوسرا مرکز طاغوت ہے انکے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ ہویٰ وہوس نفس کے اندر رہ کر تخریبی کا رروائی کرتی ہے اور طاغوت یہی کام نفس کے باہرسے انجام دیتا ہے اس طرح یہ دونوں انسان کو فتنہ وفسا داورتباہی کی آگ میں جھونک دیتے ہیں۔بس ان کاانداز جدا ہوتا ہے۔شیطان ان خواہشات کے ذریعہ انسان کے اندرداخل ہوکر اس پر اپنا قبضہ جما لیتا ہے جبکہ سماج یا معاشرہ اور قوموں کے اوپر طاغوت کے ذریعہ اپنی گرفت مضبوط رکھتا ہے۔اسی لئے خداوند عالم نے قرآن مجید میں نفس کی پیروی کرنے سے بار بار منع کیا ہے اور اسکی مخالفت کی تاکید فرمائی ہے ۔نمونہ کے طورپر مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:(فلا تتبعوا الھویٰ[1]) ''لہٰذا ہوی وہوس کی پیروی نہ کرنا''(ولاتتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ[2]) ''اور خواہشات کا اتباع نہ کرو کہ وہ راہ خدا سے منحرف کردیں''(ولاتتبع اھوائہم عما جائک من الحق[3]) ''اور جوکچھ حق تمہارے پاس آیا ہے اسکے مقابلہ میں ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو''ہویٰ و ہوس کی پیروی سے بچنے کی مانند خداوند عالم نے ہمیں ''طاغوت''کا انکار کرنے اور اس سے دور رہنے کا بھی حکم دیا ہے:(یریدون ان

[1] سورۂ نساء آیت ۱۳۵۔
[2] سورۂ ص آیت ۲۶۔
[3] سورۂ مائدہ آیت ۴۸۔

یتحاکموا إلی الطاغوت وقد أمروا أن یکفروا بہ[1]) ''وہ یہ چاہتے ہیں کے سرکش لوگوں (طاغوت) کے پاس فیصلہ کرائیں جبکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ طاغوت کا انکار کریں'' (والذین اجتنبوا الطاغوت أن یعبدوھا وأنابوا الی اللہ لھم البشریٰ[2]) ''اور جن لوگوں نے طاغوت کی عبادت سے علیٰحدگی اختیار کی اور خدا کی طرف متوجہ ہوگئے ان کے لئے ہماری طرف سے بشارت ہے''

(ولقد بعثنا فی کل أمۃ رسولاً أن عبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت[3]) ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو''

عقل اور دین

ہویٰ وہوس اور طاغوت کے مقابلہ میں انسان کو راہ راست پر ثبات قدم عطا کرنے کیلئے خداوند عالم نے دو راستے کھول دئے ہیں ایک عقل اور دوسرے دین۔ عقل انسان کے اندر رہ کر اسکی اصلاح کرتی ہے اور دین باہر سے اسکی ہدایت کا کام انجام دیتا ہے۔اسی لئے حضرت امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے: (العقل شرع من داخل،والشرع عقل من خارج[4]) ''عقل اندرونی ریعت ہے اور شریعت بیرونی عقل کا نام ہے''امام کاظمؑ کا ارشاد ہے: (ان للہ علی الناس حجتین حجۃ ظاھرۃ وحجۃ باطنۃ فأما الحجۃ الظاھرۃ فالرسل والانبیاء والائمۃ وأما الباطنۃ فالعقول[5]) ''لوگوں کے اوپر خداوند عالم کی دو حجتیں اور دلیلیں ہیں جن میں ایک ظاہری اور دوسری پوشیدہ اور باطنی حجت ہے۔ظاہری حجت انبیاء،مرسلین اور ائمہ ہیں اور پوشیدہ اور باطنی حجت ''عقل'' ہے۔'' عقل اور دین کے سہارے انسان داخلی وخارجی سطح پر بخوبی ہویٰ و ہوس اور طاغوت کا مقابلہ کرسکتاہے۔جیسا کہ مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے: (قاتل ھواک بعقلک[6]) ''اپنی عقل کے ذریعہ اپنی خواہشات سے جنگ کرو''خواہشات کی تباہ کاریاں یہ بے لگام قوت جسکے

---

[1] سورۂ نساء آیت ۶۰۔
[2] سورۂ زمر آیت ۱۷۔
[3] سورۂ نحل آیت ۳۶۔
[4] مجمع البحرین للطریحی مادہ عقل۔
[5] بحار ج۱ص۱۳۷۔اصول کافی ج۱ص۱۶۔
[6] نہج البلاغہحکمت۴۲۴

مطالبات کی بھی کوئی حد نہیں ہے یہ انسان کے اندر تخریب کا ری اور فساد وانحراف کی اتنی زیادہ قوت و طاقت رکھتی ہے کہ اس کی طاقت کے برابر شیطان اور طاغوت جیسی طاقتوں کے اندر بھی قوت وطاقت نہیں پائی جاتی ہے۔اور سب سے زیادہ خطرناک بات تو یہ ہے کے انسان کو نیست ونابود کرنے والی یہ طاقت انسان کے وجود میں ہی سمائی ہوئی ہے اور انسان کے پاس اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کو اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ جن دوچیزوں کا خوف لاحق تھا ان میں سے ایک ''خواہشات نفس'' ہے جیسا کہ آپؐ کا ارشادگرامی ہے: (إن أخوف ماأخاف علیٰ أمتي:الھویٰ وطول الأمل،أماالھویٰ فانہ یصد عن الحق،وأماطول الأمل فینسي الآخرة[1]) ''مجھے اپنی امت کے بارے میں دو چیزوں کا سب سے زیادہ خوف لاحق رہتا ہے ہویٰ وہوس، لمبی لمبی آرزوئیں،کیونکہ خواہشات، حق تک پہنچنے کے راستے بند کردیتی ہیں اور لمبی لمبی آرزوئیں آخرت کا خیال ذہن سے نکال دیتی ہیں''اور اس کی وجہ یہی ہے کہ ہوی وہوس انسان کے اندر رہ کر اسے گمراہ کرتی ہے اسی لئے مولائے کائناتؑ نے فرمایا ہے: (اللذات مفسدات[2]) ''لذتیں تباہ کن ہیں''

تباہ کا ری کے مراحل حیات انسانی میں خواہشات کے منفی اور تخریبی کردارپر بھی ہمیں غور کرنا چاہئےکہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ انسانی وجود میں کچھ ایسے بنیادی محرکات پائے جاتے ہیں جن کی بناپر علم و معرفت پیدا ہوتی ہے اورانہیں کے ذریعہ انسان کی مادی اور معنوی زندگی پروان چڑھتی ہے اسی طرح اسکے انسانی اور حیوانی دونوں پہلووں کی انہیں محرکات کے ذریعہ تکمیل ہوتی ہے ۔ مگر ان تمام محرکات کے درمیان خواہشات اور ہویٰ وہوس ایسا محرک ہے کہ اگر خواہشات اپنی رو میں ہوں اوران میں طغیانی آجائے تو پھریہ انسان کے اندر موجود دوسرے محرکات کو بالکل معطل اور ناکارہ بنا دیتے ہیں اور عقل،دل، ضمیر،فطرت اورارادہ کی حیثیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔وسیع پیمانہ پر ان محرکات کی معطّلی کے بعد انسانی پہلو بالکل نیست و نابود ہوجاتاہے اور انسانی نفس میں محرک کی حیثیت سے خواہشات کے علاوہ کچھ اور باقی نہیں رہتاہے جبکہ تمام حیوانی پہلووں کی تشکیل انہیں خواہشات سے ہوتی ہے۔اس طرح

---

[1] بحارالانوار ج۷۰ص۸۸حدیث ۱۹ ج۷۰ص۷۵ حدیث ۳وح۷۰ص۷۷ح۹و۷۔
[2] غررالحکم ج۱ص۱۳۔

انسانی زندگی کے اندر یہ مفید اور کارآمد عنصرہلاکت اور بربادی کا موجب ہوجاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے:

(ولاتطع من أغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان أمرہ فرطا[1]) ''اور ہرگز اس کی اطاعت نہ کرنا جسکے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے محروم کردیا ہے اور وہ اپنے خواہشات کا پیرو کار ہے اور اس کا کام سراسر زیادتی کرنا ہے'' فرط تفریط سے بنا ہے جسکے معنی ضائع و برباد کرنا ہیں۔انسانی زندگی میں ہویٰ و ہوس کے تخریبی کردار کی طرف قرآن وحدیث میں خصوصی توجہ دلائی گئی ہے تا کہ لوگ خواہشات کے خطرات سے بخوبی آگاہ رہیں اور اسکی تباہ کاریوں کاشکار نہ ہونے پائیں ۔ذیل میں ہم اسلامی نکتہ نظر سے خواہشات اورہویٰ و ہوس کی تباہیوں اور بربادیوں کا جائزہ پیش کررہے ہیں ۔ ہمیں آیات اورروایات کے مطابق خواہشات کی تخریبی کارروائی کے دو مرحلے دکھائی دیتے ہیں پہلے مرحلہ میں توخواہشات،انسان کے اندر علم ومعرفت اور خداوندعالم کی طرف لے جانے والے تمام ذرائع کو معطل اور نیست ونابود کرکے رکھ دیتی ہیں۔

دوسرے مرحلہ میں ان تمام ذرائع کو معطل کرنے کے بعد خواہشات انسان کو مکمل طورپر اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور اس پر خواہشات کی حکمرانی ہوتی ہے انسان ہر اعتبار سے ان کی حکومت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتا ہے اورخواہشات کا اسیربن کررہ جاتاہے جسکے نتیجہ میں خداوندعالم نے انسان کو جوکچھ طاقتیں، صلاحیتیں اور فہم و فراست عطا فرمائی تھی وہ سب ہویٰ و ہوس کا آلۂ کار بن جاتی ہیں۔اب آپ قرآن وحدیث کی روشنی میں خواہشات کے ان دونوں مرحلوں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

خواہشات کی تخریبی کارروائیوں کا پہلا مرحلہ

ہم یہ عرض کر چکے ہیں کہ پہلے مرحلہ میں ہویٰ و ہوس علم و عمل کی تمام خدا داد صلاحیتوں کو معطل کردیتی ہے۔اسکے علاوہ بھی یہ انسان کے اندربہت خرابیاں پیدا کرتی ہے آیات و روایات میں مختلف عناوین کے تحت ان خرابیوں کا تذکرہ موجودہے ہم موضوع کی مناسبت سے صرف چند نمونے پیش کررہے ہیں ۔ ا۔خواہشات ،قلب پر ہدایت کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد

[1] سورۂ کہف آیت۲۸۔

ہے: (أفرأيت من اتخذ إلٰهه هواه وأضله الله علىٰ علم وختم علىٰ سمعه وقلبه وجعل علىٰ بصره غشاوة فمن يهديه من بعد الله أفلا تذكّرون[1])

''کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنا لیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑدیا ہے اور اسکے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اسکی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کر سکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو''

دوسرے مقام پر خداوندعالم کا ارشاد ہے: (فإن لم یستجیبوا لک فاعلم أنما یتبعون أهوائهم ومن أضل ممن إتبع هواه[2]) ''پھر اگر یہ آپ کی بات کو قبول نہ کریں تو سمجھ لیجئے کہ یہ صرف اپنی خواہشات کا اتباع کرنے والے ہیں اور اس سے زیادہ گمراہ کون ہے جو خدا کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کا اتباع کرے'' ان آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ خواہشات انسان کے دل کے اوپر خدا،رسول،خدائی آیات ودلائل اور ہدایت کے تمام راستے مکمل طورپر بند کر دیتے ہیں اور قلب سے خدا ورسول کی دعوت پر لبیک کہنے کی صلاحیت کوسلب کر لیتے ہیں ۔

مزید تائید کے لئے مولائے کائناتؑ کے یہ ارشادات ملاحظہ فرمائیے: (من اتبع هواه أعماه،وأصمّه،وأذلّه[3]) ''جو اپنی خواہشات کی پیروی کرے گا خواہشات اس کو اندھا بہرابنادیں گی اوراس کوذلیل ورسواکردیں گی ۔ (الهوی شریک العمی[4]) 'خواہشیں نابینائی کے شریک کار ہوتی ہیں ۔'' (إنک إن أطعت هواک أصمّک وأعماک[5]) ''اگر تم اپنے خواہشات کی پیروی کروگے تو وہ تم کو بہرا اور اندھا بنا دینگے '' (اوصیکم بمجانبۃ الهویٰ،فإن الهویٰ یدعوإلی العمی وهوالضلال فی الآخرۃوالدنیا[6]) میں تم کوخواہشات سے دور رہنے کی وصیت کرتاہوں کیونکہ خواہشات اندھے پن کی طرف لیجاتی ہیں اور وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کی گمراہی ہے ۔''

---

[1] سورۂ جاثیہ آیت٢٣۔
[2] سورۂ قصص آیت٥٠۔
[3] غررالحکم ج٢ص٢٤٢۔
[4] نہج البلاغہ مکتوب ٣١۔
[5] غررالحکم ج ١ص٢٦٠ ۔
[6] مستدرک ومسائل الشیعہ ٢؍٣٤٥طبع قدیم ۔

۲۔خواہشات گمراہی کا ذریعہ: خدا وند عالم کا ارشادہے: (فخلف من بعد ھم خلف أضاعوا الصلاۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیّا[۱]) ''پھر ان کے بعد ان کی جگہ پر وہ لوگ آگئے جنھوں نے نماز کو برباد کردیا اور خواہشات کا اتباع کرلیا پس عنقریب یہ اپنی گمراہی سے جا ملیں گے''اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: (ولا تتبع الھویٰ فیضلک عن سبیل اللہ ان الذین یضلون عن سبیل اللہ لھم عذاب شدید[۲]) ''اور (اے داؤد)! خواہشات کی پیروی نہ کرو کہ وہ راہ خدا سے منصرف کردیں بیشک جو لوگ راہ خدا سے بھٹک جاتے ہیں ان کیلئے شدید عذاب ہے ''رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے: (إن أخوف ماأخاف علیٰ اُمتي،الھویٰ،وطول الأمل،أماالھویٰ فإنہ یصد عن الحق،وأماطول الأمل فینسی الآخرۃ[۳]) ''مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ دو چیزوں کا خوف ہے ۔خواہشات نفس اور لمبی لمبی آرزوئیں کیونکہ خواہشات اور ہویٰ و ہوس حق تک پہونچنے کے راستے بند کردیتی ہیں اور لمبی لمبی آرزوئیں آخرت کا خیال ذہن سے نکال دیتی ہیں''

۳۔خواہشات ایک مہلک زہر: امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:(الشھوات سموم قاتلات[۴]) ''خواہشات مہلک زہر ہیں''

۴۔خواہشات آفت اور بیماری: اس سلسلہ میں حضرت علیؑ کے یہ اقوال ملا حظہ فرمائیں: (من تسرّع الیٰ الشھوات تسرّعت الیہ الآفات[۵]) ''جو خواہشات کی طرف جتنی تیزی سے بڑھے گا اسکے اوپر اتنی ہی تیزی سے آفتیںآن پڑیں گی''(احفظ نفسک من الشھوات،تسلم من الآفات[٦]) ''اپنے نفس کو خواہشات سے بچاکر رکھو تو آفتوں سے محفوظ رہوگے'' (رأس الآفات الولہ باللذات[۷]) ''آفتوں کی اصل وجہ لذات و خواہشات کا دلدادہ ہوناہے۔''(قرین الشھوۃ مریض النفس معلول العقل[۸]) ''شہوتوں اور

---

[۱] سورۂ مریم آیت۵۹۔
[۲] سورۂ ص آیت ۲۶۔
[۳] خصال صدوق جلد ۱صفحہ ۲۷ ،بحارالانوار ج۷۰ص۷۵حدیث۳وج۷۰ص۷۷حدیث۷وج۷۰ ص ۸۸ حدیث۱۹۔
[٤] غررالحکم ج۱ص۴۴ ۔
[٥] غررالحکم ج۲ص۲۰۱۔
[٦] گذشتہ حوالہ۔
[٧] غررالحکم ج۱ص۳۷۲۔
[٨] غررالحکم ج۲ص۷۷و۷۸۔

خواہشوں کے دلد اد ہ کا نفس مریض اور عقل بیمار ہو تی ہے'' (الشھوات أعلال قاتلات،وأفضل دواءھااقتناء الصبر عنھا[1])''خواہشات مہلک بیماریاں ہیں اور ان سے پرہیز کر نا ہی ان کی بہترین دوا ہے''(أول الشھوۃطرب وآخرھا عطب[2]) ''خواہشات کاآغاز لطف انگیز اور انجام زحمت خیز ہوتاہے ۔''

۵ ۔خواہشات آزمائشوں کی بنیاد حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:(الھویٰ اُس المحن[3]) ''ہوس آزمائشوں کی بنیاد ہے''

٦۔خواہشات فتنوں کی چراگاہ حضرت علیؑ کا ارشادہے:(الھویٰ مطیۃالفتن[4])

''خواہشات فتنوں کی چراگاہ ہیں ۔ ''آپ ہی کا ارشاد ہے:(انّمابدء وقوع الفتن أھواء تتّبع[5]) ''فتنوں کے واقع ہونے کی ابتدا ان خواہشات سے ہوتی ہے جنکی پیروی کی جائے ۔'' (ایاکم وتمکّن الھویٰ منکم،فان أوّلہ فتنۃ،وآخرہ محنۃ) ''ذرا سنبھل کر،کہیں تمہاری خواہشات تم پر حاوی نہ ہو جائیں کیونکہ انکی ابتداء فتنہ اور انتہا آزمائش طلب ہوتی ہے ۔''

۷۔خواہشات ایک پستی حضرت علیؑ: (الھویٰ یُردی[6]) ''ہویٰ و ہوس پستی میں گرادیتی ہے ۔ ''آپؑ ہی کا یہ ارشاد بھی ہے: (الھویٰ ھوی الیٰ اسفل السافلین[7]) ''انسانی ہوس پستیوں کی آخری تہوں میں گرا دیتی ہے'' امام جعفر صادقؑ کا قول ہے: (لاتدع النفس وھواھا،فان ھواھا رداھا) ''نفس کو اس کی خواہشات کے اوپر نہ چھوڑ دو کیونکہ اس کی خواہشات ہی اس کی پستی ہیں

۸ ۔خواہشات موجب ہلاکت حضرت علیؑ کاارشادہے:(أہلک شئ الھویٰ[8]) ''سب سےزیادہ مہلک چیز خواہشات ہیں''(الھویٰ قرین مہلک[1]) ''خواہشات مہلک ساتھی ہیں ۔

---

[1] غررالحکم ج۱ص۹۰۔
[2] غررالحکم ج۱ص۱۹۵۔
[3] غررالحکم ج۱ص۵۰ ۔
[4] غررالحکم ج۱ص۵۱۔
[5] نہج البلا غہ خطبہ ۵۰ ۔
[6] غررالحکم ج۱ص۱۲۔
[7] غررالحکم ج۱ص۶۵۔
[8] غرر الحکم ج ۱ ص ۱۸۰۔

۹۔خواہشات انسان کی دشمن حضرت امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے:(أحذروا اھوائکم کما تحذرون أعدائکم، فلیس شی ءأعدیٰ للرجال من اتباع أھواءھم[۲]) ''اپنی خواہشات سے اسی طرح ڈرو جس طرح تم اپنے دشمنوں سے ڈرتے ہو کیونکہ لوگوں کے لئے ان کی خواہشات سے بڑا کوئی دشمن نہیں ہے''

۱۰۔عقل کی بربادی حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:(آفۃ العقل الھویٰ[۳]) ''خواہشات عقل کو برباد کرنے والی آفت ہیں۔ ''(من لمیملک شھوتہ لم یملک عقلہ[۴])''جس کا اپنی خواہشوں کے اوپر اختیار نہیں رہتا وہ اپنی عقل کا اختیار بھی کھو بیٹھتا ہے'' (زوال العقل بین دواعی الشھوۃوالغضب) ''عقل دو چیزوں میں زائل ہوتی ہے :شھوت اور غضب'' ہویٰ و ہوس اور خواہشات کا عالم یہ ہے کہ جب ان میں طغیانی پیدا ہوتی ہے تو یہ مفید اور کار آمد عنصر، تعمیر کے بجائے تخریب اور دوسرے اہم بنیادی منابع و محرکات کی بربادی کا سبب بن جاتاہے یہ تھا خواہشات کی کارروائی کا پہلا مرحلہ ،جس میں انسانی زندگی پر خواہشات کا منفی اور تخریبی کردار بخوبی واضح ہوگیا۔خواہشات کی تباہ کاری کا دوسرا مرحلہ خواہشات کی جن تباہ کاریوں کی طرف ہم نے ابھی اشارہ کیا ہے بات اسی مرحلہ پر تمام نہیں ہوتی بلکہ خواہشات فتنہ و فساد برپا کرنے میں دو چار قدم اور آگے نظر آتے ہیں چنانچہ پہلے مرحلہ میں یہ خواہشات انسان کے ارادہ ،عقل ،ضمیر ،دل اور فطرت کوناکارہ اور معطل کر دیتی ہیں اس مرحلہ کو قرآن مجید نے 'اغفال قلب '(دل کو غافل بنا دینے)کا نام دیا ہے ۔لیکن جب خواہشات ان تمام اہم محرکات کو نیست و نابود کر دیتے ہیں اور انسان کو ہر لحاظ سے اپنی گرفت میں لے کر اس پر غلبہ اور تسلط حاصل کر لیتے ہیں تو پھر انسان خواہشات کا تابع اور فرماں بردار ہو کر رہ جاتا ہے اس مرحلہ کو قرآن مجید نے ''اتباع ہویٰ'' کا نام دیا ہے ۔

---

[۱] غرر الحکم ج ۱ ص۴۷۔
[۲] بحا رالانوار ج ۷۰ ص ۸۲ حدیث ۱۲۔
[۳] غرر الحکم ج ۱ ص۲ ۲۷۔
[۴] مستد رک و سائل الشیعہ ج ۲ ص ۲۸۷ طبع قدیم ۔

مندرجہ ذیل آیۂ کریمہ میں آپ دونوں مراحل بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں: (ولاتطع من أغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان أمرہ فُرطا[1]) 'اور ہرگز اسکی اطاعت نہ کرنا جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے محروم کر دیا ہے۔

وہ اپنے خواہشات کا پیرو کا رہے ۔اور اسکا کام سراسر زیادتی کرنا ہے'' پہلے مرحلہ میں خواہشات نے انسانوں کے دل کو بالکل غافل بنا دیا اور اسمیں علم و معرفت اور ہدایت و بصیرت کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا اور دوسرے مرحلہ میں ہویٰ و ہوس نے اسے مکمل طورپراپنی گرفت میں لے لیا نتیجتاً انسان خواہشات کا تابع محض بن کر رہ گیا اور جب یہ سب کچھ ہوجائے کہ ایک طرف اسکا دل غافل رہے اور دوسری جانب وہ ہوس کا غلام بن جائے تو اسکا آخری انجام واقعاً وہی تلخ حقیقت ہے جسکی طرف قرآن مجیدنے اشارہ کیاہے۔ ''وکان أمرہ فرطا''

خواہشات کا قیدی

دوسرے مرحلہ میں انسان ہر اعتبار سے خواہشات کے قبضہ میں چلا جاتا ہے اورواقعاً ''خواہشات'' کا اسیر بن کر رہ جاتاہے بلکہ اپنے اسیر پر خواہشات کا اختیارو تسلط جنگی قیدی کے بالمقابل کہیں زیادہ ہوتاہے کیونکہ قیدی پر فاتح کااختیار و تسلط محدودحد تک ہوتاہے ۔مثلاًوہ اسے فرار نہیں ہونے دیتایا مقابلہ سے معذور کردیتاہے ،اسے کسی خاص راہ و روش کا پابند بنادیا جاتاہے ،اوراسے غلامی کی زنجیروں میں جکڑدیا جاتاہے اسے اپنی مرضی کے مطابق بولنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی مگر ان تمام باتوں کے باوجود یہ قیدی تین اعتبار سے بالکل آزاد رہتاہے۔ ا۔اپنے احساسات اور سماعت و بصارت میں آزاد ہوتاہے اور دوسروں کے احساسات سے قطع نظر وہ اپنے طورپر مستقل سنتاہے دیکھتا ہے اور کسی بھی چیز کا احساس کر سکتا ہے اور قید کرنے والا چاہے جتنی بڑی حکومت اور اقتدار کا مالک ہو پھر بھی وہ اسکے احساسات پر پابندی نہیں لگا سکتا جیسے اسکے اوپر یہ پابندی نہیں لگا سکتا کہ وہ اچھی چیز کو برا دیکھنے لگے ۔یا بری چیز کو اچھا محسوس کرے۔

---

[1] سورۂ کہف آیت۲۸۔

۲۔اسکی عقل بھی بالکل آزاد رہتی ہے اوروہ جس طرح چاہے سوچ سکتا ہے اور اپنی عقل کے مطابق فیصلہ کرتا ہے نہ کہ قید کرنے والوں کی عقل کے مطابق اسے اسیر کرنے والے اسکی عقل کو قیدی بنا کر اپنی مرضی کے مطابق اسکے لئے کوئی خاص طرز تفکر معین نہیں کر سکتے ہیں ۔

۳۔اسی طرح اسکا دل بھی بالکل آزادہوتا ہے یعنی اس کا دل جس سے چاہے محبت یا نفرت کر سکتا ہے یہ اسے اختیار ہے اور اسے قیدی بنانے والے اسمیں کوئی مداخلت نہیں کر سکتے بلکہ وہ جن کی قید میں ہوتا ہے انھیں سے نفرت کرتا ہے اور انکے دشمنوں سے محبت کرتا ہے کیونکہ اسکے دل پران کا کوئی اختیار نہیں ہوتا ہے۔

بقول شاعر

''مجھے اسیر کرو یا مری زباں کاٹو

مرے خیال کو بیڑی پنہا نہیں سکتے''

لیکن خواہشات کے قیدیوں میں معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے کیونکہ خواہشات اپنے اسیر کے احساسات اسکی عقل اور دل سب کو مکمل طورپر اپنے قابومیں کرلیتی ہیں اوران کے اندر اپنے مطابق مداخلت کرتی ہیں اور اسیر پر ان کی مکمل حکمرانی ہوتی ہے۔ اب وہ خواہشات ہی کے مطابق فیصلہ کرتاہے برائی کو اچھائی اور اچھائی کو برائی، نیک و طیب کو خبیث اور خبیث کوطیب سمجھتا ہے۔اور ہر چیز کے بارے میں اسکا انداز فکر وہی ہوجاتا ہے جواس کے خواہشات چاہتے ہیں گویا اسکی عقل و منطق اور فہم و ادراک سب تبدیل ہوجاتے ہیں۔

پھریہ خواہشات انسان کے قلب پر حملہ آور ہوتے ہیں اور اسے بھی اپنے قبضہ میں لے لیتے ہیں اور پھر اسکا انداز محبت ونفرت خواہشات کے اشاروں پر تبدیل ہوتا رہتا ہے۔چنانچہ خداوند عالم کے جن دشمنوں سے نفرت ضروری ہے وہ ان سے محبت کرنے

لگتا ہے اور خدا کے جن محبوب بندوں سے محبت ضروری ہے ان سے اسے نفرت ہوجاتی ہے۔ان خواہشات کا آخری حملہ انسان کے ضمیر کے اوپر ہوتا ہے کیونکہ انسانی وجود میں ضمیر ہی ان کے مقابلہ میں سب سے زیادہ ثبات قدم کا مظاہرہ کرتا ہے اور آخرکار اس جنگ میں انسان کا ضمیر بھی پیچھے ہٹنے لگتا ہے اور جب یہ خواہشات انسان سے اسکا ضمیر بھی چھین لیتے ہیں تو پھر انسان اپنی خواہشات، شیاطین اور طاغوت کے مقابلہ میں بالکل بے یارومددگار ہوکر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ خواہشات کی زنجیریں بدن کو قید کرنے والی زنجیروں اور سلاخوں سے کتنی زیادہ مؤثر اور کاری ہوتی ہیں ،ایک انسان کی قید اور خواہشات کی اسیری کے اس فرق کی جانب مولائے کائنات، کی اس حدیث میں بھی اشارہ موجود ہے: (عبدالشھوۃ أذل من عبدالرق[1]) ''خواہشات کا اسیر ہونا کسی انسان کے ہاتھوں اسیر ہونے سے کہیں زیادہ ذلت و رسوائی کا باعث ہے''اگر چہ بظاہر ان دونوں کو ہی اسیری کہا جاتا ہے اور دونوں طرح کی اسیری میں انسان ذلیل ہوتا ہے اوردونوں صورتوں میں قیدی دوسرے کا محکوم ہوتا ہے لیکن پھر بھی کسی انسان کی قید میں رہنا اتنا دشوار نہیں ہے جتنی دشوار اور باعث ذلت خواہشات کی اسیری ہوتی ہے۔

خواہشات کی قید قرآن و حدیث کی روشنی میں

مندرجہ ذیل آیۂ کریمہ کے بارے میں غوروفکر کرنے کے بعد انسانی وجودپر قابض اس اسیری کی گہرائیوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔خداوند عالم کا ارشاد ہے:(أفرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ وأضلہ اللّٰہ علیٰ علم وختم علیٰ سمعہ وقلبہ وجعل علیٰ بصرہ غشا وۃفمن یھدیہ من بعد اللّٰہ أفلاتذکّرون[2]) ''کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑدیا ہے اور اسکے کان اوردل پر مہر لگادی ہے اور اسکی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کرسکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو؟''

---

[1] غرر الحکم ج۲ص۴۰۔
[2] سورۂ جاثیہ آیت۲۳۔

اس طرح خداوند عالم ایسے انسان سے سماعت ،بصارت اور دل سب کچھ چھین لیتاہے اور وہ دوسروں کے اشاروں پر اس طرح حرکت کرتاہے کہ اس کو اپنے اوپر ذرہ برابر اختیار نہیں رہ جاتااور وہ ہر معاملہ میں خواہشات کا ہی تابع رہتا ہے یہاں تک کہ اسکے خواہشات ہی اسکا خدا بن جاتے ہیں جوکہ خواہشات کی غلامی کی آخری منزل ہے ۔

مزید وضاحت کے لئے مولائے کائنات ؑکے مندرجہ ذیل اقوال ملاحظہ فرمائیے:(مَن ملک نفسہ علا امرہ،ومن ملکتہ نفسہ ذل درہ[1]) ''جو اپنے نفس کا مالک و مختار ہووہ باوقار اور بلند مرتبہ ہے اور جس کا مالک و مختار اسکا نفس ہے وہ ذلیل اورر سوا ہوتاہے''(أزری بنفسہ من ملکتہ الشھوۃ واستعبدتہ المطامع[2]) ''اس نے اپنے نفس کو معیوب بنا لیاجو شہوت کا محکوم ہوگیااورلالچوں نے اسے غلام بنا لیا''(عبدالشھوۃٔ سیرلا ینفک أسرہ[3]) ''خواہشات کا غلام ایک ایسا قیدی ہے جو کبھی آزاد نہیں ہوسکتا ہے''(کم من عقل أسیر تحت ہویٰ أمیر[4]) ''کتنی عقلیں ،خواہشات کی فرما نروائی میں اسیر ہیں''(الشھوات تسترق الجھول[5]) ''خواہشات جاہلوں کو غلام بناکر رکھتی ہیں''یہ بہترین تعبیر ہے کہ جاہل جب خواہشات کے پیچھے چلتا ہے تو وہ اسے نفس کے اختیار سے نکال کر اپنی سلطنت کے ماتحت لے لیتی ہیں اور انسان اپنی عقل ،ارادہ اور ضمیر کے دائرۂ اختیار سے باہر نکل کر خواہشات کی حکومت اور اختیار میں چلا جاتا ہے جس طرح چورتاریکی میں بڑی خاموشی کے ساتھ گھر کے سامان کا صفایاکردیتا ہے اسی طرح جہالت کی تاریکی میں خاموشی سے انسان پر اسکے خواہشات کی حکمرانی ہوجاتی ہےاوراسے خبر بھی نہیں ہوپاتی ہے۔

انسان اور خواہشات کی غلامی

جب اس حد تک انسان کے اوپر خواہشات کی حکمرانی ہوجاتی ہے توانسان خواہشات کا غلام بن جاتاہے کیونکہ خواہشات کاایسا غلبہ ایک قسم کی بندگی ہے۔

---

[1] مستدرک الو سائل ج٢ص٢٨٢۔
[2] غررالحکم ج١ص١٩٥۔
[3] غررالحکم ج٢ص٤٠۔
[4] نہج البلاغہ حکمت ٢١١۔
[5] غررالحکم ج١ص٤٥۔

قرآن مجید کی یہ دونوآیتیں ہمیں بیحد غور وفکر کی دعوت دیتی ہیں: (أفرأیت من اتخذ الٰھہ ھواہ وأضلہ اللہ علیٰ علم وختم علیٰ سمعہ وقلبہ وجعل علیٰ بصرہ غشاوۃ فمن یھدیہ من بعد اللہ أفلا تذکّرون[1]) ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنا لیا ہے اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کر اسے گمراہی میں چھوڑدیاہے اور اسکے کان اوردل پر مہر لگادی ہے اور اسکی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کرسکتا ہے کیا تم اتنا بھی غور نہیں کرتے ہو''

(أرأیت من اتخذ إلٰھہ ھواہ أفأنت تکون علیہ وکیلا[2]) ''کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے کہ جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنا لیا ہے کیا آپ اسکی بھی ذمہ داری لینے کے لئے تیار ہیں''بات اگر چہ بہت عجیب وغریب محسوس ہوتی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک منزل وہ آتی ہے کہ جب انسان پر وردگار عالم کو چھوڑکر اپنی خواہشات کو خدا بنالیتا ہے اور انھیں کی عبادت کرتا ہے۔ رسول اکرمؐسے منقول ہے: (ماتحت ظل السماء من الٰہ یعبد من دون اللہ أعظم عنداللہ من ھویٰ متّبع[3]) ''اس آسمان کے نیچے خداوندعالم کے بعد سب سے زیادہ جس معبود کی عبادت کی گئی ہے وہ خواہشات کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے''۔

حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے:(الجاہل عبد شھوتہ[4]) ''جاہل اپنی خواہش کا غلام ہوتاہے''اللہ نے بھی اسے نظر انداز کردیاجب انسان خداوندعالم کی بندگی اور عبودیت سے نکل کر خواہشات نفس سے رشتہ جوڑدیتا ہے اور اطاعت الٰہی کے بجائے اپنے نفس کا تابع ہو جاتاہے تو پھر وہ عملی اعتبار سے اس حدتک پستی میں چلا جاتا ہے کہ رب العالمین کی اطاعت وبندگی چھوڑکر اپنے خواہشات نفس کی پرستش شروع کردیتا ہے۔لہٰذاایسے افراد کے بارے میں یہ کہنا بالکل بجا ہے(نسوااللہ فنسیھم)کہ ''انھوں نے خداوندعالم کو بھلا دیا تو اس نے انھیں فراموش کردیا ۔''اسکی وجہ بھی صاف ظاہر ہے کیونکہ جب وہ خود خدا کی عبودیت وبندگی اوراسکی اطاعت کے حدود سے باہر نکل گئے اور انھوں نے خدا سے اپنا رابطہ توڑکر اسے بھلا دیا تو پروردگار عالم نے بھی ان کو بھلادیا

---

[1] سورۂ جاثیہ آیت۲۳۔
[2] سورۂ فرقان آیت ۴۳۔
[3] درمنثور ج۵ص۷۲۔
[4] غررالحکم ج۱ص۲۸۔

۔۔۔ان کے بھلادینے کا جواب انہیں بھلاکر دیااور انہیں ان کے حوالہ کردیا اور جس لمحہ بھی خداوند عالم کسی بندے سے اپنی نظر کرم موڑکر اسے اسکے نفس کے حوالہ کر دیتا ہے اسی لمحہ وہ شیطان کا شکار بن جاتاہے ۔

خواہشات کی تباہیاں قرآن مجید کی روشنی میں

بنی اسرائیل کے ایک بہت بڑے عالم ''بلعم بن باعورا''[1]کا قصہ قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: (واتل علیھم نبأالذی آتیناہ آیاتنا فانسلخ منھا فأتبعہ الشیطان فکان من الغاوین ولوشئنا لرفعناہ بھا ولکنہ أخلد إلیٰ الارض واتبع ھواہ فمثلہ کمثل الکلب إن تحمل علیہ یلھث أوتترکہ یلھث ذلک مثل القوم الذین امشہورروایات کی بنیادپر ان آیات میں بلعم باعورا کی ہی مذمت کی گئی ہے۔اگر چہ دیگر اقوال بھی موجود ہیں جن کے مطابق وہ شخص صیفی راہب تھا جس نے پیغمبر اکرمؐ کو فاسق کہا تھا ۔بعض حضرات کے نزدیک اس سے مراد امیہ بن ابی الصلت ہے وغیرہ وغیرہ ۔کذّبوا بآیاتنا فاقصص القصص لعلھم یتفکّرون) ''اور انھیں اس شخص کی خبر سنا ئیے جسکو ہم نے اپنی آیتیں عطا کیں پھر وہ ان سے بالکل الگ ہوگیا اور شیطان نے اسکا پیچھاپکڑلیا تو وہ گمراہوں میں ہو گیااور ہم چاہتے تو اسے انھیں آیتوں کے سبب بلند کردیتے لیکن وہ خود زمین کی طرف جھک گیا اور اس نے خواہشات کی پیروی اختیار کر لی تو اب اسکی مثال اس کتے جیسی ہے کہ اس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالے رہے اور چھوڑدو تو بھی زبان نکالے رہے یہ اس قوم کی مثال ہے جس نے ہماری آیات کی تکذیب کی،تواب آپ ان قصوں کو بیان کریں کہ شاید یہ غور وفکر کرنے لگیں''

ان آیات کی تفسیر یہ ہے کہ ''بلعم بن باعورا''بنی اسرائیل کا ایک بہت ہی بڑا اور مشہور عالم تھا اسکو خداوندعالم نے اپنی روشن آیات نیز علم ومعرفت سے اس حد تک نوازا تھا کہ اسے مستجاب الدعوات قرار دے دیا تھا اور جناب موسیٰ بعض معاملات میں اس سے مدد لیتے تھے۔۔۔مگر وہ اپنی ہویٰ وہوس کا اسیر ہو گیا ۔چنانچہ ایسے افراد جب اپنی خواہشات کا شکار ہوتے ہیں تو عام طور سے اسکے دوہی اسباب ہوتے ہیں یا تو وہ اپنے علم کو ذاتی فائدہ کیلئے استعمال کرنے لگتے ہیں مثلاً علم کے ذریعہ شہرت وعزت یا

[1] سورۂ اعراف آیت۱۷۵۔۱۷۶۔

عہدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لوگوں کے درمیان علم کے ذریعہ اپنی شخصیت کا اظہار کرتے ہیں یا یہ کہ دولت کی لالچ میں اپنے علم سے اہل حکومت اورطاغوت کی خدمت شروع کردیتے ہیں اور علم کے بدلہ مال دنیا کماتے ہیں اس طرح دونوں صورتوں کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ علم ہویٰ وہوس اور خواہشات کا شکار ہو جاتا ہے ۔کیونکہ کسی بھی عالم کی اہمیت کا معیار دراصل اسکے علم کی کثرت نہیں ہے ،جیسے اکثر کتب خانوں میں اتنی زیادہ کتابیں ہوتی ہیں کہ علماء کی ایک کثیر تعداد مل کر بھی انہیں نہ اٹھا سکے مگر اسکی کوئی اہمیت نہیں ہے ۔

علم کی قدروقیمت دراصل صاحب علم اور اس علم کے مصرف اور محل استعمال کو دیکھ کر لگائی جاتی ہے ۔ اگر عالم انبیاء کے دین اوراخلاق سے مزین ہو اور اس کا علم لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی نیز انکی خدمت میں کام آئے تو یہ اس عالم کی قدروقیمت کا سبب ہے اور اگر خدا نخواستہ ایسا کچھ نہیں ہے تو پھراس عالم کی کوئی حیثیت نہیں ہے ۔مولائے کائناتؑ نے خطبہ شقشقیہ میں عالم کی منزلت اور اسکی ذمہ داریاں ان الفاظ میں بیان فرمائی ہیں:(وما أخذ اللّٰہ علی العلماء أن لایقاروا علی کظة ظالم ولاسغب مظلوم) ''اللّٰہ کا اہل علم سے یہ عہد ہے کہ خبردار ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر چین سے نہ بیٹھنا ۔''لہٰذااگرعالم خدا سے کئے ہوئے عہد کو پوار کرنے کیلئے اٹھ کھڑا ہو تو اسکی قدر ومنزلت اور مقام ومرتبہ میں اضافہ ہوتاہے ۔

بلعم بن باعور(اگر ان آیات کی تفسیربیان کرنے والی روایات کے مطابق بلعم باعوراہی مراد ہو)ان لوگوں میں سے تھا جنھوں نے اپنے علم کی لگام خواہشات کے سپرد کر دی اور انھیں کے پیچھے چل پڑے اب قرآن مجید کے الفاظ میں اس شخص کا انجام ملاحظہ فرمائیے: اگران روایات کو تسلیم کر لیا جائے تو آیۂ کریمہ میں اگر چہ بلعم باعور کے قصہ کی طرف ہی اشارہ ہے لیکن یہ باتیں ہراس شخص کیلئے ہیں جو اپنے نفس کے اوپر اپنے خواہشات کو حاکم بنادے ۔جیسا کہ امام محمد باقرؑ کا ارشاد گرامی ہے: (إن الاصل فی ذلک بلعم،ثم ضرب اللّٰہ مثلاًلکل مؤثرھواہ علی ہدیٰ اللّٰہ،من أہل القبلة[1]) ''یعنی یہ تذکرہ تو دراصل بلعم کا ہی ہے لیکن خداوندعالم نے اسمیں

[1] مجمع البیان تفسیرسورۂ اعراف آیت ۱۷۵۔۱۷۶۔

ہر اس مسلمان کی مثال بیان کر دی ہے جو اپنی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر ترجیح دیتا ہو'' ایسے لوگوں کا انجام کیا ہوتا ہے ہمیں قرآنی بیانات کی روشنی میں اس پر بھی غور کرنا چاہئے۔ ا۔زمین کی جانب رغبت زمین کی طرف رغبت ،دنیاوی زندگی سے دلبستگی کو کہتے ہیں یعنی انسان دنیا کا ہو کر رہ جائے۔کیونکہ زمین دنیا ہی کا دوسرا نام ہے اور زمین کی طرف جھکاؤ ،رغبت اس سے بیزاری کے ذریعہ رفعت و بلندی کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ آیۂ کریمہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (ولوشئنا لرفعناہ بھا ولکنہ اخلد الیٰ الارض) ''اگر ہم چاہتے تو اسے انھیں آیات کے ذریعہ بلند کردیتے لیکن وہ خود زمین کی طرف جھک گیا'' یعنی اس نے خود دنیا وی ذلت کو گلے لگا لیا ۔کیونکہ جس طرح سطح زمین سے بلندی کی طرف اوپر جاتے ہوئے زمین کی قوت جاذبہ اور کشش کا مقابلہ کر نے میں زحمت و مشقت ہوتی ہے مگر اس کے برعکس اوپر سے زمین کی طرف آتے وقت زمین کی کشش کا سہارا مل جاتاہے ۔بالکل یہی حال زندگانی دنیا کی پستی اور بلندی کا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی بلندیوں کا خواہاں ہے تو اسے اتنی ہی مشقتیں برداشت کرنا ہونگی لیکن اگر کوئی پستیوں میں جانا چاہتاہے تو اس میں کوئی زحمت نہیں ہے ۔

۲۔آیات خدا سے محرومی (فانسلخ منہا)آیات الٰہیہ سے ''انسلاخ'' یعنی اسکے پاس آیات کی جومعرفت اور علم و حکمت و بصیرت کی جو دولت تھی وہ اس سے واپس لے لی گئی۔ ''انسلاخ'' ''التصاق'' کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے التصاق اس وقت کہا جاتاہے کہ جب دوچیزیں آپس میں ملی ہوئی یاچپکی ہوتی ہیں اور جب ان کے درمیان مکمل علاحدگی یابالکل جدائی ہو جائے تو اہل عرب اسکو ''انسلاخ '' کہتے ہیں لہٰذا جو لوگ اپنی شہوتوں اور خواہشات کے تحت ،قدم اٹھاتے ہیں انکا رابطہ علم ومعرفت اور آیات الٰہیہ سے بالکل ختم ہو جاتا ہے اور جس طرح کسی مریض کا معدہ کھانے کوقبول کرنے کے بجائے اسے رد کردیتا ہے اسی طرح انکا نفس علم وحکمت جیسی پاکیزہ اور نفیس اشیاء کوقبول نہیں کر پاتا ہے ۔

کیونکہ اگراسکا وجود ہوس اور خواہشات کا دلدادہ ہو جائے تو پھر اسمیں آیات الٰہیہ، علم و حکمت اور بصیرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی اور نہ ہی اسکے وجود میں اخلاقی اقدار وفضائل کا گذر ہوسکتا ہے ۔رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے: (حرام علیٰ کل قلب

متولّہ بالشھوات أن یسکنہ الورع[1]) ''یعنی جو دل بھی خواہشات کا دلدادہ ہو اسکے اندر ورع و پرہیزگاری کا بسیرا حرام ہے''آپ کا ہی ارشاد ہے: (حرام علیٰ کل قلب أغری بالشھوات أن یحل فی ملکوت السمٰوات[2]) ''جودل خواہشات کا فریب خوردہ ہو اس کیلئے ''ملکوت السمٰوات''کی سکونت حرام ہے'' (حرام علی کل قلب مغلول بالشھوۃ أن ینتفع بالحکمۃ[3]) ''جو دل خواہشات کی زنجیروں سے جکڑا ہوا سکے لئے حکمت سے استفادہ کرنا حرام ہے ۔''کیونکہ دل ایک ظرف کی مانند ہے اور ایک ظرف میں خواہشات نفس اوریاد الٰہی ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ہیں لہٰذا اسکے اندریا ذکر الٰہی رہے گا یا خواہشات رہیں گے کیونکہ (ما جعل اللّٰہ لرجل من قلبین فی جوفہ[4]) ''خداوندعالم نے ایک انسان کے جسم میں دو قلب نہیں بنائے ہیں'' لہٰذا جب انسان اپنی خواہشات کا اتباع کرتا ہے تو پھر خود بخود اسکے دل سے یادخدا نکل جاتی ہے اور اگر اسمیں یاد خدا آجاتی ہے تو پھر خواہشات کاامکان نہیں رہ جاتاہے۔

لہٰذا جس دل سے یاد خدا نکل جائے وہ خواہشات کے راستے پر چل پڑتا ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: (ولاتطع من أغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ہواہ وکان أمرہ فرطا[5]) ''اور ہرگز اس کی اطاعت نہ کرنا جس کے قلب کو ہم نے اپنی یادسے محروم کردیا ہے وہ اپنی خواہشات کا پیرو کار ہے اور اسکا کام سراسر زیادتی کرنا ہے ۔'' خواہشات کی پیروی کایہ دوسرا انجام ہے۔

۳۔شیطان کا تسلط ارشاد رب العزت ہے :(فأتبعہ الشیطان) ''اور شیطان نے اسکا پیچھا پکڑلیا ۔'' پہلے شیطان اس تک پہنچنے یا اس پر قبضہ کرنے سے عاجز تھا مگرخواہشات کی پیروی انسان پر شیطان کے قبضہ کو مستحکم بنادیتی ہے اور انسان جتنی زیادہ خواہشات کی پیروی کرے گا اس پر شیطان کا تسلط اور غلبہ بھی اتنا ہی زیادہ مستحکم ہو جائے گا اور یہ خواہشات کی پیروی کا تیسرا نتیجہ ہے ۔

---

[1] مجموعہ ورام تنبیہ خواطرص ۳۶۲۔
[2] گذشتہ حوالہ۔
[3] غرر الحکم ج۱ص۳۴۴۔
[4] سورۂ احزاب آیت ۴۔
[5] سورۂ کہف آیت۲۸۔

۴۔ضلالت و گمراہی (فکان من الغاوین) ''تو وہ گمراہوں میں ہوگیا''ایسے لوگوں کے سلسلہ میں یہ ایک فطری چیز ہے کیونکہ جب انسان ہویٰ وہوس میں مبتلا ہو جاتاہے اور اس کے دل سے یاد الٰہی نکل جاتی ہے اس پر شیطان کا تسلط قائم ہوجاتاہے تو پھر اسکی ہدایت کا بھی کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا اور اسکی زندگی میں اصلاح کا امکان نہیں ہے لہٰذا وہ جس مقدار میں ہاتھ پیر مارتا ہے اتنا ہی پستیوں میں اترتا چلا جاتا ہے ۔اوریہ خواہشات کی پیروی کا چوتھا نتیجہ ہے۔

۵۔لالچ ان لوگوں کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے: (فمثلہ کمثل الکلب اِن تحمل علیہ یلہث او تترکہ یلہث) ''تو اب اسکی مثال اس کتّے جیسی ہے کہ اس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالے رہے اور چھوڑدو تو بھی زبان نکالے رہے''زبان باہر نکلی رہنا یہ کتوں کی ایک مشہور بیماری ہے اور اسمیں کتے کو ہر وقت پیا س لگی رہتی ہے چنانچہ اسے چاہے جتنا پانی پلایا جائے اسکی پیاس نہیں بجھ پاتی اور اسی لئے وہ ہمیشہ اپنی زبان باہر نکالے رہتا ہے اورچاہے کوئی اس پر حملہ کرے یا اسے اسی طرح چھوڑ دیا جائے ہر وقت اسکا ایک ہی حال رہتا ہے چنانچہ بالکل اسی صورتحال سے اہل ہوس بھی دوچار رہتے ہیں کہ دنیاوی لذتوں اور رنگینیوں میں غرق ہونے کے باوجود انکی پیاس نہیں بجھتی چاہے وہ مالدارہوں یا فقیرانہیں دنیا مل گئی ہو یانہ ملی ہوان سب کا حال پیاس کے مریض اس کتے کی طرح رہتا ہے جسکی پیاس بہتے دریا بھی نہیں بجھا پاتے ہیں ۔

اسی بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: (لوکان لابن آدم وادیان من ذھب لابتغیٰ وراء ھما ثالثاً[1]) ''اگر فرزند آدم کے پاس سونے سے بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تب بھی اسے تیسری وادی کی خواہش رہتی ہے''امام جعفر صادقؑ سے جب ایک آدمی نے اپنے اندر دنیا کی لالچ اور اسکی طرف توجہ رہنے کی شکایت کی تو آپ نے فرمایا :جوچیز تمہارے لئے کافی ہے اوروہ تمھیں

[1] مجموعہ ورام تنبیہ خوا طرص ۱۶۳۔

مستغنی بنادے تو اسکی معمولی مقدار بھی تمہیں مستغنی بنا سکتی ہے لیکن جو چیز تمہارے لئے کافی ہے اگر وہ تمہیں مستغنی نہ بنا سکے تو پھر پوری دنیا بھی تمھیں مستغنی نہیں بنا سکتی ہے اور یہ اس کا پانچواں نتیجہ ہے[1] ۔

خواہشات کا علاج ہوس کی تخریبی طاقت

انسانی خواہشات اس کیلئے جس مقدار میں مفید ہیں اس کے مطابق انکے اندر قدرت اور طاقت بھی پائی جاتی ہے چنانچہ اگر یہ غلط راستے پر لگ جائیں تو پھر یہ اپنی طاقت کے اعتبار سے ہی انسانی زندگی کو تہہ وبالا کر کے رکھ دیتی ہیں ۔انسانی نفس کے اندر اسکے یہ دونوں (مثبت اور مفید منفی اور مضر)پہلو بالکل طے شدہ ہیں اور اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ خواہشات ہی دراصل انسان کی زندگی کے پہیوں کو گردش دینے والی قوت ہیں اور اگر خداوندعالم نے انسان کے نفس میں جنسیات ،مال ،خودی (حب ذات)،کھانے پینے اور اپنے دفاع کی محبت نہ رکھی ہوتی تو قافلۂ انسانی ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا .

لہٰذا خواہشات کے اندر جتنے فائدے ہیں انکے اندر اتنی ہی طاقت موجود ہے اور انکے اندر جتنی طاقت پائی جاتی ہے انکے بہک جانے کی صورت میں انکے نقصانات بھی اسی کے مطابق ہونگے جیسا کہ مولائے کائناتؑ نے ارشاد فرمایا ہے:(الغضب مفسد للالباب ومبعد عن الصواب [2])''غصہ عقلوں کو برباد اور راہ حق سے دور کر دینے والی چیز ہے'' آپؑ نے یہ بھی فرمایا ہے (أکثر مصارع العقول تحت بریق المطامع [3])'' عقلوں کی اکثر قتل گاہیں طمع کی جگہوں کی چمک دمک کے آس پاس ہیں''

خواہشات کی پیروی پر روک اور انکی آزادی کے درمیان یہی وجہ ہے کہ خواہشات کو ایکدم کچل کر رکھ دینا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ خواہش انسانی زندگی کیلئے ایک مفید طاقت ہے جس کے سہارے کا روان حیات انسانی رواں دواں ہے اور اس کو معطل اور ناکارہ بنا دینا یا اسکی مذمت کرنا اور اسکی اہمیت کا اعتراف نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی شخصیت کے ایک بڑے حصہ کا انکار

[1] اصول کافی ج۲ص۱۳۹
[2] غرر الحکم ج۱ص۶۷ ۔
[3] غرر الحکم ج۱ص۱۹۸۔

کردیا جائے اور اسکو نقل و حرکت میں رکھنے والی اصل طاقت کو ناکارہ قرار دیدیا جائے ۔اسی طرح خواہشات اور ہوس کی لگام کو بالکل ڈھیلا چھوڑ دینا اور انکے ہر مطالبہ کی تکمیل کرنا اور ان کی ہر بات میں ہاں سے ہاں ملانا بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر ان کی رسی ڈھیلی چھوڑدی جائے تو یہ فائدہ مند ہونے کے بجائے انسان کیلئے مضر بن جاتے ہیں ۔لہٰذا ہمیں یہ اعتراف کرنا پڑیگا کہ شرعی اعتبار سے خواہشات کی محدود تکمیل کی بہت اہمیت ہے اور جس طرح انکو بالکل آزاد چھوڑ دینا صحیح نہیں ہے اسی طرح ہر بات میں انکی تکمیل بھی صحیح نہیں ہے ۔اسی معیار پر اسلام نے خواہشات کے بارے میں اپنے احکام بنائے ہیں یعنی پہلے وہ خواہشات کو انسان کیلئے ضروری سمجھتا ہے اور اسے فضول چیز قرار نہیں دیتا جیسا کہ قرآن کریم میں پروردگار عالم کاارشاد ہے: (زُیّن للناسِ حبُ الشھواتِ من النساءِ والبنین والقناطیرِالمقنطرۃمن الذھبِ والفضۃِ والخیلِ المسومۃِ والأنعام والحرثِ[1]) ''لوگوں کے لئے خواہشات دنیا ،عورتیں،اولاد،سونے چاندی کے ڈھیر،تندرست گھوڑے یا چوپائے کھیتیاں سب مزین اور آراستہ کردی گئیں ہیں ''دوسری آیت میں ارشاد ہے: (ألمالُ والبنون زینۃالحیاۃِ الدنیا[2]) ''مال اور اولاد، زندگانی دنیا کی زینت ہیں'' ان آیات میں نہ صرف یہ کہ خواہشات کی مذمت نہیں ہے بلکہ اسکو زینت اور جمال زندگانی قرار دیا گیاہے اور اسی اہم نکتہ سے خواہشات کے بارے میں اسلام کا واضح نظریہ بھی معلوم ہوجاتا ہے ۔

دوسرے مرحلہ پر اس نے ہمیں اپنی خواہشات کو پورا کرنے اور دنیاوی لذتوں سے بہرہ مند ہونے کا حکم دیا ہے: (کلوا من طیبات مارزقناکم[3]) '' تم ہمارے پاکیزہ رزق کو کھاؤ'' یایہ ارشاد الٰہی ہے: (ولا تنس نصیبک من الدنیا[4]) ''اور دنیا میں اپنا حصہ بھول نہ جاؤ ''اور اسی طرح یہ بھی ارشاد ہے: (قل من حرم زینۃاللہ التی أخرج لعبادہِ والطیبات من الرزق[5]) ''پیغمبر آپ ان سے پوچھئے کہ کس نے اس زینت کو جس کو خدا نے اپنے بندوں کیلئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام کردیا ہے''خواہشات کے

[1] آل عمر ان آیت۱۴۔
[2] سورۂ کہف آیت۴۶ ۔
[3] سورۂ طہٰ آیت۸۱ ۔
[4] سورۂ قصص آیت۷۷ ۔
[5] سورۂ اعراف آیت ۳۲ ۔

بارے میں اسلام نے یہ دوسرا نظریہ پیش کیا ہے جس کے اندر نہ اپنی خواہشات کی تکمیل کی کھلی چھوٹ ہے کہ جس کا جس طرح دل چاہے وہ اپنی خواہشات کی پیاس بجھاتا رہے اور کسی قاعدہ وقانون کے بغیر سر جھکا کر انھیں کے پیچھے چلتا رہے ۔امام جعفر صادقؑ نے فرمایا ہے: (لاتدع النفس وهواها فإن هواها رداها[1]) ''اپنے نفس کو اسکے خواہشات کے اوپر نہ چھوڑدو کیونکہ اسکے خواہشات میں اسکی پستی اور ذلت ہے'' ان تمام پابندیوں اور سختیوں کے باوجود اسلام نے انسانی خواہشات کی تسلی کیلئے ایک نظام بنا کر خود بھی اس کے بیحد مواقع فراہم کئے ہیں جیسے اسلام نے جنسیات کو حرام قرار نہیں دیا ہے اور نہ اس سے منع کیا ہے اور نہ ہی اسے کوئی برا یا پست کام کہا ہے بلکہ خود اسکی طرف رغبت دلائی ہے اور اسکی تاکید کی ہے البتہ اسکے لئے کچھ شرعی قواعد و ضوابط بھی بنائے ہیں اسی طرح مال سے محبت کرنے کو نہ اسلام منع کرتا ہے اور نہ اسے برا کہتا ہے بلکہ یہ تمام انسانوں کیلئے مباح ہے البتہ اسکے لئے بھی کچھ قواعد وقوانین مرتب کردئے گئے ہیں تاکہ مالی یا جنسی خواہشات وغیرہ کی تسلی کیلئے ہر شخص کے سامنے مواقع موجود رہیں اور کوئی شخص بھی بے راہ روی کا شکار نہ ہونے پائے یہ خواہشات کے بارے میں اسلامی نظریہ کا تیسرا نکتہ ہے۔

خواہشات کو قابو میں رکھنے کے لئے ''عقل''کا کردار

خواہشات کو بغاوت اور سرکشی سے روکنے اور ہر لحاظ سے انکی تکمیل سے منع کرنے اور اسی طرح انکی تسلی کی معقول حدبندی کیلئے انسانی عقل میدان عمل میں ہمیشہ فعال رہتی ہے اور شاید اسی لئے عربی زبان میں عقل کو عقل کہا جاتا ہے کہ عقل کسی کو لگام لگانے یا پھندے کو کہتے ہیں اور خدا نے عقل کو یہی ذمہ داری سونپی ہے کہ وہ خواہشات کو لگام لگا کر اپنے قابو میں رکھے جیسا کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: (إن العقل عقال من الجهل،والنفس مثل أخبث الدواب[2]) ''عقل جہالت سے بچانے والی لگام ہے اور نفس خبیث ترین چوپائے کی طرح ہے'' روایات میں اسی مضمون کی طرف کثرت سے اشارے موجود ہیں بطورنمونہ

[1] اصول کافی ج۲ص۳۳۶۔
[2] بحارالانوار ج۱ص۱۱۷ ۔

حضرت علیؑ کے مندرجہ ذیل اقوال ملاحظہ فرمائیں*: (فکرک یھدیک إلی الرشاد[1]) "تمہاری فکر تمہیں رشد و ہدایت کی طرف رہنمائی کرتی ہے*" (للنفوس خواطر للھویٰ والعقول تزجر وتنھیٰ[2]) "نفس کے اندر مختلف قسم کی خواہشات ابھرتی رہتی ہیں اور عقل ان سے منع کرتی رہتی ہے*" (للقلوب خواطر سوء والعقول تزجر منھا[3]) "دلوں کے اندر برے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور عقل ان سے باز رکھتی ہے*" (النفوس طلقة لکن أیدی العقول تمسک اعنتھا[4]) "نفس تو بالکل آزاد ہوتے ہیں لیکن عقلوں کے ہاتھ انکی لگام تھامے رہتے ہیں*" (ثمرۃ العقل مقت الدنیا وقمع الھویٰ[5]) "عقل کا پھل دنیا کی ناراضگی اور خواہشات کی تاراجی ہے" مختصر یہ کہ انسانی زندگی میں اسکی عقل کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ خواہشات کو اپنے محدود تقاضوں کے تحت کنٹرول کرتی ہے اور اس کی ہوس کو سرکشی اور بغاوت سے روکتی رہتی ہے اور انسان کو اس کی خواہشات کی تکمیل میں بے لگام نہیں رہنے دیتی لہٰذا جس کی عقل جتنی کامل اور پختہ ہوتی ہے وہ اپنی خواہشات پر اتنی ہی مہارت اور آسانی سے غلبہ حاصل کر لیتا ہے ۔

حضرت علیؑ: (العقل الکامل قاھر الطبع السوء[6]) "عقل کامل بری طبیعتوں پر غالب رہتی ہے" اور یہی نہیں بلکہ خواہشات پر کنٹرول ہی انسان کی عقل سلیم کی پہچان ہے ۔ حضرت علیؑ: (حفظ العقل بمخالفة الھویٰ والعزوف عن الدنیا[7]) "خواہشات کی مخالفت اور دنیا سے بے رغبتی کے ذریعہ عقل محفوظ رہتی ہے" امام محمد باقرؑ: (لاعقل کمخالفة الھویٰ[8]) "خواہشات کی مخالفت سے بہتر کوئی عقل نہیں ہے"، حضرت علیؑ: (من جانب ھواہ صح عقلہ[9]) "جس نے اپنی خواہشات سے کنارہ کشی اختیار کرلی اسکی عقل صحیح و سالم ہو جائے گی" ان احادیث سے بھی یہ روشن ہوتا ہے کہ عقل اور خواہشات دونوں ہی انسان کی زندگی کے دو اہم ستون ہیں ان میں سے خواہشات، انسانی حیات کے سفینہ کی نقل و حرکت اور اسکی تعمیر و ترقی میں پتوار کا فریضہ ادا کرتے ہیں اور عقل اسکو بغاوت و سر

[1] غرر الحکم ج۲ص۵۸۔
[2] تحف العقول ص۹۶۔
[3] غرر الحکم ج۲ص۱۲۱۔
[4] غرر الحکم ج۱ص۱۰۹۔
[5] غرر الحکم ج۲ص۳۲۳۔
[6] بحار الانوار ج۷۸ص۹۔
[7] غرر الحکم ج۱ص۳۴۵۔
[8] بحار الانوار ج۷۸ص۱۶۴۔
[9] بحار الانوار ج۱ص۱۶۰۔

کشی اور فتنہ وفساد کے خطرناک نشیب وفراز سے نکال کر ساحل تک پہنچانے کی اہم ذمہ داری ادا کرتی ہے لہٰذا ہر انسان کے لئے جس طرح جسم وروح ضروری ہیں اسی طرح اس کے لئے ان دونوں کا وجود بھی ضروری ہے ۔

عقل اور دین

انسانی زندگی میں دین بھی وہی کردار ادا کرتا ہے جو عقل کا کردار ہے یعنی جس طرح عقل، خواہشات کو مختلف طریقوں سے اپنے قابو میں رکھتی ہے اسی طرح دین بھی انھیں بھکنے سے بچاتا رہتا ہے یعنی عقل اور دین کے اندر ہر طرح کی فکری اور عملی یکسانیت اور مطابقت پائی جاتی ہے کیونکہ دین ایک الٰہی فطرت ہے جیسا کہ آیۂ کریمہ میں ارشاد ہے: (فطرۃاللّٰہ التی فطرالناس علیھا لاتبدیل لخلق اللّٰہ ذلک الدین القیم[1]) ''دین وہ فطرت الٰہی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے اور خلقت الٰہی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے یقیناًیہی سیدھا اور مستحکم دین ہے'' وہ فطرت جو انسان کے اوپر حکمراں ہوتی ہے اور عقل بھی اسی کے ساتھ ساتھ چلتی ہے وہ ''دین'' ہے جسکے ذریعہ اللہ تعالی نے حیات بشری کو دوام بخشا اور حیات بشری کے ذریعہ اسے قائم ودائم فرمایا لہٰذا دین بھی خواہشات کو کنٹرول کرنے کے سلسلہ میں عقل کی امداد کرتاہے اور خود بھی اسی ذمہ داری کو ادا کرتاہے مختصر یہ کہ عقل اور دین ایک ہی سکے کے دورخ ہیں ۔

حضرت علی: (العقل شرع من داخل،والشرع عقل من خارج[2]) ''عقل بدن کی اندرونی شریعت اور شریعت بدن کے باہر موجودعقل کا نام ہے''امام موسیٰ کاظم: (إن للّٰہ علی الناس حجتین :حجۃ ظاھرۃ وحجۃ باطنۃ، فاماالظاھرۃ فالرسل والانبیاء والائمۃ(ع)واماالباطنۃ فالعقول[3]) ''لوگوں پر خدا وندعالم کی دو حجتیں (دلیلیں)ہیں ایک ظاہری حجت اور دوسری پوشیدہ اور باطنی حجت و دلیل۔ ظاہری دلیل انبیاء اور ائمہ ہیں جبکہ باطنی حجت عقل ہے'' امام جعفر صادق کا ارشاد ہے: (حجۃ اللّٰہ علیٰ

---

[1] سورۂ روم آیت ۳۰۔
[2] کتاب جوان :آقا ئے محمد تقی فلسفی ج۱ص۲۶۵۔
[3] بحارالانوار ج۱ص۱۳۷۔

العباد النبی،والحجۃ فیما بین العباد وبین اللہ العقل[1]) ''بندوں کے اوپر خدا وندعالم کی حجت اسکے انبیاء ہیں اور خداوندعالم اور اسکے بندوں کے درمیان، عقل حجت ہے''

عقل کے تین مراحل

انسانی زندگی میں عقل کے تین اہم کردار ہوتے ہیں: ١۔ معرفت الٰہی۔ ٢۔خداوندعالم نے جو کچھ اپنے بندوں پر واجب کیا ہے اسکی اطاعت کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت کا نتیجہ اسکی اطاعت اور بندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

٣۔تقوائے الٰہی: یہ خداوندعالم کی اطاعت وبندگی کا دوسرا رخ ہے کیونکہ خداوندعالم کی اطاعت وبندگی کی بھی دو قسمیں ہیں واجبات کو بجالانا اور محرمات سے پرہیز کرنا اور تقویٰ درحقیقت نفس کو محرمات سے باز رکھنے کا نام ہے ۔اور شاید مندرجہ ذیل روایت میں بھی عقل کے مذکورہ تینوں مرحلوں کی وضاحت موجود ہے:رسول اکرم ﷺ: (قُسم العقل علیٰ ثلاثۃ أجزاء،فمن کانت فیہ کمل عقلہ،ومن لم تکن فیہ فلا عقل لہ:حسن المعرفۃ باللہ عزوجل،وحسن الطاعۃ للہ،وحسن الصبر علیٰ أمرہ[2]) ''عقل کے تین حصے کئے گئے ہیں لہٰذا جسکے اندر یہ تینوں حصے موجود ہوں اسکی عقل کامل ہے اور جسکے اندر یہ موجود نہ ہوں تو اسکے پاس عقل بھی نہیں ہے! ١۔حسن معرفت الٰہی (خداوندعالم کی بہترین شناخت ومعرفت اور حجت آوری)۔

٢۔اللہ کی بہترین اطاعت وبندگی۔

٣۔اسکے احکامات پر اچھی طرح صبر کرنا'' خدا کے احکام پر صبر کرنے کا دوسرا نام خواہشات پر قابو پانا ہے اور اس کو تقویٰ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ خواہشات پر قابو پانا اور انھیں اپنے کنڑول میں رکھنے کیلئے جتنا زیادہ صبر درکار ہے اتنا صبر کسی اور کام کیلئے درکار نہیں ہوتا ہے ۔اب ان تینوں مراحل کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں: ١۔معرفت اور حجت آوری عقل کی پہلی ذمہ داری معرفت اور

---

[1] اصول کافی ج١ص٢٥۔
[2] بحارالانوار ج١ص١٠٦۔

شناخت ہے ۔کیونکہ اس دنیا کے حقائق اور اسرار سے پر دہ اٹھانے کا ذریعہ (آلہ) عقل ہی ہے اگرچہ اہل تصوف اسکے مخالف ہیں اور وہ عقل کی معرفت اور شناخت کے قائل ہی نہیں ہیں انکا کہنا ہے کہ اس دنیا کے حقائق اور خداوند عالم اور اسی طرح غیب کی معرفت کے بارے میں عقل کا کوئی دخل نہیں ہوتاہے ۔جبکہ اسلام عقل کی قوت تشخیص کا قائل ہے اور وہ اسے علم ومعرفت کا ایک آلہ قرار دیتا ہے اور دنیا کے مادی یا غیر مادی تمام مقامات پریا اس دنیا کے خالق یا واجبات اور محرمات جیسے تمام مسائل میں اس کی مزید تائید کرتا ہے ۔

رسول اکرم ﷺ نے اس سلسلہ میں یہ ارشاد فرمایا ہے: (إنمایدرک الخیر کلہ فی العقل[1]) ''ہر خیر کو عقل میں تلاش کیا جاسکتا ہے ''آپ ہی کا یہ ارشاد بھی ہے: (استرشدوا العقل ترشدوا ولا تعصوہ فتندموا[2]) ''عقل سے رہنمائی حاصل کرو تو راستہ مل جائے گا اوراسکی نافرمانی نہ کرنا ورنہ شرمندگی اٹھانا پڑے گی'' حضرت علی: (العقل أصل العلم وداعیۃ الفھم[3]) ''عقل ،علم کی بنیاد اور فہم (غوروفکر)کی طرف دعوت دینے والی ہے''امام جعفر صادق: (العقل دلیل المؤمن[4])

''عقل مومن کی رہنما ہے''دنیا کے حقائق اور اسرار ورموز کی معرفت کیلئے عقل کی قدر وقیمت اور اہمیت کیا ہے؟اسکو روایات میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''خداوند عالم اپنے بندوں پر عقل کے ذریعہ ہی احتجاج (دلیل)پیش کریگا اور اسی کے مطابق ان کو جزا یا سزا دی جائیگی ''اس مختصر سے جملہ کے ذریعہ انسانی زندگی میں عقل کی قدر وقیمت اور دین خدا میں اسکی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔امام موسی کاظم: (أن للّٰہ علیٰ الناس حجتین حجۃ ظاھرۃ وحجۃ باطنۃ،فأما الظاھرۃ فالرسل والانبیاء والائمۃ(ع)،وأما الباطنۃ فالعقول[5]) ''بندوں پر خداوند عالم کی دو حجتیں (دلیلیں)ہیں ایک کھلی ہوئی اور ظاہر ہے اور دوسری پوشیدہ ہے ظاہری حجت

---

[1] تحف العقول ص۵۴ ۔ بحارالانوا ر ج ۷۷ ص۱۵۸۔

[2] اصول کافی ج۱ص۲۵۔
[3] غررالحکم ج۱ص۱۰۲۔
[4] اصول کافی ج۱ص۲۵۔
[5] بحارالانوار ج۱ ص ۱۳۷۔

اسکے رسول، انبیاء اور ائمہ ہیں اور پوشیدہ حجت کا نام عقل ہے''آپ ہی کا یہ ارشاد گرامی ہے: (ان اللہ عزوجل أکمل للناس الحجج بالعقول،وأفضیٰ إلیھم بالبیان،ودلھم علیٰ ربوبیتہ بالادلۃ[1]) '' خداوند عالم نے عقلوں کے ذریعہ لوگوں پر اپنی سب حجتیں تمام کردی ہیں اوربیان سے ان کی وضاحت فرمادی اور دلیلوں کے ذریعہ اپنی ربوبیت کی طرف ان کی رہنمائی کردی ہے''لہٰذا عقل ،انسان کے اوپر خداوند عالم کی حجت اور دلیل ہے جسکے ذریعہ وہ اپنے بندوں کا فیصلہ کرتا ہے اوراگر فہم وادراک کی اسی صلاحیت کی بناء پر اسلام نے عقل کو اس اہمیت اور عظمت سے نہنوازا ہوتا تو وہ کبھی بھی حجت اور دلیل نہیں بن سکتی تھی اور اسکے مطابق فیصلہ ممکن نہیں تھا ۔یہی وجہ ہے کہ روایات میں آیا ہے کہ خداوند عالم عقل کے مطابق ہی جزا یا سزا دیگا ۔

٢۔اطاعت خداجب فہم وادراک اورنظری معرفت کے میدان میں عقل کی اس قدر اہمیت ہے ۔۔۔تو اسی نظری معرفت کے نتیجہ میں عملی معرفت پیدا ہوتی ہے جسکی بنا پر انسان کیلئے کچھ واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے پرہیز واجب ہوجاتا ہے ۔ چنانچہ جس نظری معرفت کے نتیجہ میں عملی معرفت پیدا ہوتی ہے اسکا مطلب یہ ہے کہ انسان خداوند عالم کے مقام ربوبیت والوہیت کو پہچان لے اور اس طرح اسکی عبودیت اور بندگی کے مقام کی معرفت بھی پیدا کرلے اورجب انسان یہ معرفت حاصل کرلیتاہے تو اس پر خداوند عالم کے احکام کی اطاعت وفرمانبرداری واجب ہوجاتی ہے۔

یہ معرفت ،عقل کے خصوصیات میں سے ایک ہے اور یہی وہ معرفت ہے جو انسان کو خدا کے اوامر کی اطاعت اور نواہی سے پرہیز (واجبات و محرمات)کا ذمہ دار اور انکی ادائیگی یا مخالفت کی صورت میں جزاوسزا کا مستحق قرار دیتی ہے اور اگر معرفت نظری کے بعد یہ معرفت عملی نہ پائی جائے تو پھر انسان کے اوپر اوامر اور نواہی الٰہیہ نافذ (لاگو)نہیں ہوسکتے یعنی نہ اسکے اوپر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور نہ ہی اسکو جزااور سزا کا مستحق قرار دیا جاسکتا ہے۔اسی بیان کی طرف مندرجہ ذیل روایات میں اشارہ موجود ہے:امام محمد باقرؑنے فرمایا ہے: (لما خلق اللہ العقل استنطقہ ثم قال لہ أقبل فأقبل،ثم قال لہ أدبرفأدبر،ثم قال لہ:وعزّتی وجلالی

[1] بحارالانوار ج١ص١٣٢۔

ما خلقت خلقاً ھوأحب إلیّ منک،ولاأکملک الافیمن احب۔أماإنی إیاک آمروإ یاکأ نھیٰ وإیاک اُعاقب وإیاک أثیب[1]) ''یعنی جب پروردگار عالم نے عقل کو خلق فرمایا تو اسے گویا ہونے کا حکم دیا پھر اس سے فرمایا سامنے آ،تو وہ سامنے آگئی اسکے بعد فرمایا پیچھے ہٹ جا تو وہ پیچھے ہٹ گئی تو پروردگار نے اس سے فرمایا کہ میری عزت وجلالت کی قسم میں نے تجھ سے زیادہ اپنی محبوب کوئی اور مخلوق پیدا نہیں کی ہے اور میں تجھے اسکے اندر کامل کرونگا جس سے مجھے محبت ہوگی۔یاد رکھ کہ میں صرف اور صرف تیرے ہی مطابق کوئی حکم دونگا اور تیرے ہی مطابق کسی چیز سے منع کرونگا اور صرف تیرے مطابق عذاب کرونگا اور تیرے ہی اعتبار سے ثواب دونگا''

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:(لما خلق اللّٰہ عزوجل العقل قال لہ ادبرفادبر،ثم قال اقبل فاقبل،فقال وعزتی وجلالی ما خلقت خلقاً احسن منک،إیاک آمروإیاک انھی،إیاک أثیب وإیاکاُعاقب[2]) ''جب اللّٰہ تعالی نے عقل کو پیدا کیا تو اس سے فرمایا واپس پلٹ جا تو وہ واپس پلٹ گئی اسکے بعد فرمایا سامنے آ،تو وہ آگئی تو ارشاد فرمایا کہ میری عزت وجلالت کی قسم : میں نے تجھ سے زیادہ حسین و جمیل کوئی مخلوق پیدا نہیں کی ہے لہٰذا صرف اور صرف تیرے ہی مطابق امرونہی کرونگا اور صرف اورصرف تیرے ہی مطابق ثواب یا عذاب دونگا''،بعینہ یہی مضمون دوسری روایات میں بھی موجود ہے[3]۔

ان روایات میں اس بات کی طرف کنایہ واشارہ پایا جاتا ہے کہ عقل، خداوند عالم کی مطیع وفرمانبردار مخلوق ہے کہ جب اسے حکم دیا گیا کہ سامنے آ،تو سامنے آگئی اور جب کہا گیا کہ واپس پلٹ جا تو وہ واپس پلٹ گئی ۔روایات میں اس طرح کے اشارے اورکنائے ایک عام بات ہے۔علم وعمل کے درمیان رابطہ کے بارے میں حضرت علیؑ کا یہ ارشاد ہے:(العاقل اذا علم عمل،واذا عمل اخلص[4]) ''عاقل جب کوئی چیز جان لیتا ہے تو اس پر عمل کرتا ہے اور جب عمل کرتا ہے تو اسکی نیت خالص رہتی ہے''اللّٰہ تعالیٰ

[1] اصول کافی ج۱ص۱۰۔
[2] بحارالانوارج۱ص۹۶۔
[3] بحارالانوار ج۱ ص ۹۷ ۔
[4] غررالحکم ج۱ص۱۰۱۔

کی اطاعت وبندگی اور اسکے احکامات کی فرمانبرداری میں عقل کیا کردار ادا کرتی ہے اسکے بارے میں اسلامی کتابوں میں روایات موجود ہیں جنمیں سے ہم نمونے کے طورپر صرف چند روایات ذکر کر رہے ہیں۔رسول اکرم ﷺ:(العاقل من أطاع اللہ [1]) عاقل وہ ہے جو خدا کا فرمانبردار ہو''روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا گیا کہ عقل کیا ہے؟قال :(العمل بطاعۃ اللہ،ان العمال بطاعۃ اللہ ھم العقلاء)''فرمایا :حکم خدا کے مطابق عمل کرنا،بیشک اطاعت خدا کے مطابق چلنے والے ہی صاحبان عقل ہیں[2]''امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا گیا کہ عقل کیا ہے؟

تو آپ نے فرمایا '': جس سے خداوند عالم (رحمن)کی عبادت کی جائے اور جنت حاصل کی جائے''راوی کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا کہ پھر معاویہ کے اندر کیا تھا؟فرمایا :وہ چال بازی اور شیطنت تھی[3]''حضرت علیؑ:(اعقلکم اطوعکم[4])''سب سے بڑا عاقل وہ ہے جو سب سے زیادہ اطاعت گذار ہو''امام جعفر صادقؑ: (العاقل من کان ذلولاً عند اجابۃ الحق[5])''عاقل وہ ہے جو دعوت حق کو لبیک کہتے وقت اپنے کو سب سے زیادہ ذلیل سمجھے''

۳۔خواہشات کے مقابلہ کے لئے صبرو تحمل(خواہشات کا دفاع)یہ وہ تیسری فضیلت ہے جس سے خداوند عالم نے انسانی عقل کو نوازا ہے ۔اور یہ عقل کی ایک بنیادی اور دشوار گذار نیزاہم ذمہ داری ہے جیسا کہ ہم پہلے عرض کرچکے ہیں کہ اسکی یہ ذمہ داری اطاعت الٰہی کا ہی ایک دوسرا رخ تصور کی جاتی ہے،بلکہ در حقیقت(واجبات پر عمل اور محرمات سے پرہیز)ہی اطاعت خدا کے مصداق ہیں اور ان کے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ پہلی صورت میں واجبات پر عمل کرکے اسکی اطاعت کی جاتی ہے اور دوسری صورت میں اسکی حرام کردہ چیزوں سے پر ہیز کرکے خواہشات سے اپنے نفس کو روک کر اوران پر صبرکر کے اسکی

---

[1] بحارالانوار ج۱ص۱۶۰۔
[2] بحارالانوار ج۱ص۱۳۱۔
[3] بحارالانوار ج۱ص۱۱۶۔
[4] غررالحکم ج۱ص۱۷۹۔
[5] بحارالانوار ج۱ص۱۳۰۔

فرمانبرداری کیجاتی ہے اس بنا پر عقل کی یہ ذمہ داری اور ڈیوٹی ہے کہ وہ خواہشات نفس کواپنے قابو میں رکھے اورانھیں اس طرح اپنے ماتحت رکھے کہ وہ کبھی اپنا سر نہ اٹھا سکیں۔خواہشات نفس کوکنڑول کرنے کے بارے میں عقل کی اس ڈیوٹی کے سلسلہ میں بیحد تاکید کی گئی ہے۔نمونہ کے طور پر حضرت علیؑ کے مندرجہ ذیل اقوال حاضر خدمت ہیں*:(العقل حسام قاطع[1]) ''عقل (خواہشات کو)کاٹ دینے والی تیز شمشیر ہے*''

(قاتل هواک بعقلک[2]) ''اپنی عقل کے ذریعہ اپنی خواہشات سے جنگ کرو *''(للنفوس خواطر للھویٰ,والعقول تزجر وتنھیٰ[3]) ''نفس کے اندر ہویٰ وہوس کی بنا پر مختلف حالات پیدا ہوتے رہتے ہیں اور عقل ان سے منع کرتی ہے *''(للقلوب خواطر سوء والعقول تزجرمنہا[4]) ''دلوں پر برے خیالات کاگذر ہوتا ہے تو عقل ان سے روکتی ہے *''(العاقل من غلب ہواہ,ولم یبع آخرتہ بدنیاہ[5]) ''عاقل وہ ہے جو اپنی خواہش کا مالک ہو اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا کے عوض فروخت نہ کرے *''(العاقل من ہجر شھوتہ,وباع دنیاہ بآخرتہ[6]) ''عاقل وہ ہے جو اپنی شھوت سے بالکل دور ہوجائے اور اپنی دنیا کو اپنی آخرت کے عوض فروخت کرڈالے *''

(العاقل عدو لذتہ والجاہل عبد شھوتہ[7]) ''عاقل اپنی لذتوں کا دشمن ہوتا ہے اور جاہل اپنی شھوت کا غلام ہوتا ہے *''(العاقل من عصیٰ ہواہ فی طاعۃ ربہ[8]) ''عاقل وہ ہے جو اطاعت الٰہی کے لئے اپنی خواہش نفس (ہوس)کی مخالفت کرے *''(العاقل من غلب نوازع أھویتہ[9]) ''عاقل وہ ہے جو اپنے خواہشات کی لغزشوں پر غلبہ رکھے *''(العاقل من أمات شھوتہ,والقوی من قمع

---

[1] نہج البلاغہ ۔
[2] گذشتہ حوالہ۔
[3] تحف العقول ص۹۶۔
[4] غررالحکم ج۲ص۱۲۱۔
[5] غررالحکم ج۱ ص ۱۰۴ ۔
[6] غررالحکم ج۱ص۸۶۔
[7] غررالحکم ج۱ص۲۸۔
[8] غررالحکم ج۲ص۸۷۔
[9] غررالحکم ج۲ص۱۲۰۔

لذتہ[1])''عاقل وہ ہے جو اپنی شہوت کو مردہ بنادے اور قوی وہ ہے جو اپنی لذتوں کا قلع قمع کردے''لہٰذا عقل کے تین مرحلے ہیں:١۔معرفت خدا ٢۔واجبات میں اسکی اطاعت ٣۔جن خواہشات نفس اور محرمات سے اللہ تعالی نے منع کیا ہے ان سے پرہیز کرنا۔اس باب (بحث)میں ہماری منظور نظر عقل کا یہی تیسرا کردار ہے یعنی اس میں ہم خواہشات کے مقابلہ کا طریقہ ان پر قابو حاصل کرنے نیز انھیں کنٹرول کرنے کے طریقے بیان کرینگے ۔لہٰذا اب آپ نفس کے اندر عقل اور خواہشات کے درمیان موجود خلفشار اور کشمکش کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:عقل اور خواہشات کی کشمکش اور انسان کی آخری منزل کی نشاندہی عقل اور خواہشات کے درمیان جو جنگ بھڑکتی ہے اس سے انسان کے آخری انجام کی نشاندہی ہوجاتی ہے کہ وہ سعادت مند ہونے والا ہے یا بد بخت ہیعنی نفس کی اندرونی جنگ دنیا کے تمام لوگوں کو دو الگ الگ حصوں میں تقسیم کردیتی ہے:١۔متقی

٢۔فاسق وفاجراس طرح بشری عادات و کردار کی بھی دو قسمیں ہیں:١۔تقویٰ وپرہیز گاری(نیک کردار)

٢۔فسق وفجور (بد کردار)تقویٰ یعنی خواہشات کے اوپر عقل کی حکومت اور فسق وفجور اور بد کرداری یعنی عقل کے اوپر خواہشات کا اندھا راج،لہٰذا اسی دوراہے سے ہر انسان کی سعادت یا بد بختی کے راستے شمال و جنوب کے راستوں کی طرح ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوجاتے ہیں اور اصحاب یمین (نیک افراد) اور اصحاب شمال (یعنی برے لوگوں)کے درمیان یہ جدائی بالکل حقیقی اور جوہری جدائی ہے جس میں کسی طرح کا اتصال ممکن نہیں ہے۔اور یہ جدائی اسی دو راہے سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ کچھ لوگ اپنی خواہشات پر اپنی عقل کو حاکم رکھتے ہیں لہٰذا وہ متقی،صالح اور نیک کردار بن جاتے ہیں اور کچھ اپنی عقل کی باگ ڈور اپنی خواہشات کے حوالہ کردیتے ہیں لہٰذا وہ فاسق وفاجر بن جاتے ہیں اس طرح اہل دنیا دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں کچھ کا راستہ خدا تک پہنچتا ہے اور کچھ جہنم کی آگ کی تہوں میں پہونچ جاتے ہیں۔امیر المومنینؑ نے اس بارے میں ارشاد فرمایا ہے:(من غلب عقلہ ھواہ افلح،ومن غلب ھواہ عقلہ افتضح[2])''جس کی عقل اسکی خواہشات پر غالب ہے وہ کامیاب وکامران ہے اور جسکی عقل کے اوپر اسکے

---

[1] غررالحکم ج٢ص٥٨۔
[2] غررالحکم ج٢ص١٨٧۔

خواہشات غلبہ پیدا کرلیں وہ رسواو ذلیل ہوگیا'' آپ نے ہی یہ ارشاد فرمایا ہے: (العقل صاحب جیش الرحمٰن،والھویٰ قائد جیش الشیطان والنفس متجاذبة بینھما،فأیھمایغلب کانت فی حیزہ[1]) ''عقل لشکر رحمن کی سپہ سالارہے اور خواہشات شیطان کے لشکر کی سردار ہیں اور نفس ان دونوں کے درمیان کشمکش اور کھنچاؤ کا شکاررہتا ہے چنانچہ ان میں جو غالب آجاتا ہے نفس اسکے ماتحت رہتا ہے''اس طرح نفس کے اندر یہ جنگ جاری رہتی ہے اور نفس ان دونوں کے درمیان معلق رہتا ہے جب انمیں سے کوئی ایک اس جنگ کو جیت لیتا ہے تو انسان کا نفس بھی اسکی حکومت کے ماتحت چلاجاتا ہے اب چاہے عقل کامیاب ہوجائے یا خواہشات۔

حضرت علیؑ: (العقل والشھوة ضدان، مؤید العقل العلم،مزین الشھوة الھویٰ،والنفس متنازعة بینھما،فأیھما قھرکانت فی جانبہ[2]) ''عقل اور شہوت ایک دوسرے کی ضد ہیں عقل کا مددگار علم ہے اور شہوت کو زینت بخشنے والی چیز ہوس اور خواہشات ہیں اور نفس ان دونوں کے درمیان متذبذب رہتا ہے چنانچہ انمیں سے جوغالبآجاتا ہے نفس بھی اسی کی طرف ہوجاتا ہے''یعنی نفس کے بارے میں عقل اور خواہشات کے درمیان ہمیشہ جھگڑا رہتا ہے ۔چنانچہ انمیں سے جوغالب آجاتا ہے انسان کا نفس بھی اسی کا ساتھ دیتا ہے۔

ضعف عقل اورقوت ہوس

شہوت(خواہشات)اور عقل کی وہ بنیادی لڑائی جسکے بعد انسان کی آخری منزل (سعادت وشقاوت) معین ہوتی ہے اس میں خواہشات کا پلڑا عقل کے مقابلہ میں کافی بھاری رہتا ہے جسکی وجہ یہ ہے کہ عقل فہم وادراک کا ایک آلہ ہے جبکہ خواہشات جسم کے اندر انسان کو متحرک بنانے والی ایک مضبوط طاقت ہے۔اور یہ طے شدہ بات ہے کہ عقل ہرقدم سوچ سمجھ کر اٹھاتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اسکو نفس کی قوت محرکہ نہیں کہاجاتا ہے۔جبکہ خواہشات کے اندر انسان کو کسی کام پر اکسانے،بلکہ بھڑکانے کے لئے

[1] غررالحکم ج١ص١١٣۔
[2] گذشتہ حوالہ ۔

اعلیٰ درجہ کی قدرت وطاقت وافرمقدار میں پائی جاتی ہے۔ حضرت علی،نے فرمایا:(کم من عقل اسیر عند ہویٰ امیر[1]) ’’کتنی عقلیں خواہشات کے آمرانہ پنجوں میں گرفتار ہیں‘‘خواہشات انسان کو لالچ اور دھوکہ کے ذریعہ پستیوں کی طرف لیجاتی ہیں اور انسان بھی ان کے ساتھ پھسلتا چلا جاتا ہے ۔جبکہ عقل انسان کو ان چیزوں کی طرف دعوت دیتی ہے جن سے اسے نفرت ہے اور وہ انھیں پسند نہیں کرتا ہے۔امیر المومنین،فرماتے ہیں:(اکرہ نفسک علی الفضائل،فان الرذائل انت مطبوع علیھا) ’’نیک کام کرنے کے لئے اپنے نفس کے اوپر زور ڈالو،کیونکہ برائیوں کی طرف تو تم خود بخود جاتے ہو‘‘کیونکہ خواہشات کے مطابق چلتے وقت راستہ بالکل مزاج کے مطابق گویاڈھلان دار ہوتا ہے لہٰذاوہ اسکے اوپر بآسانی پستی کی طرف اترتا چلاجاتا ہے لیکن کمالات اور اچھائیوں میں کیونکہ انسان کا رخ بلندیوں کی طرف ہوتا ہے لہٰذا اس صورت میں ہر ایک کو زحمت اور مشقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عقل اور شہوت کے درمیان جو بھی جنگ چھڑتی ہے اس میں شہوتیں اپنے تمام لاؤ لشکر اور بھرپور قدرت وطاقت اور اثرات کے ساتھ میدان میں اترتی ہیں اورا سکے سامنے عقل کمزور پڑجاتی ہے۔اور اکثر اوقات جب عقل اور خواہشات کے درمیان مقابلہ کی نوبت آتی ہے تو عقل کو ہتھیار ڈالنا پڑتے ہیں کیونکہ وہ اسکے اوپر اس طرح حاوی ہوجاتی ہیں کہ اسکو میدان چھوڑنے پر مجبور کردیتی ہیں اور اسکا پورا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لیکر اسے بالکل لاچار بنادیتی ہیں۔

عقل کے لشکر

پروردگار عالم نے انسان کے اندر ایک مجموعہ کے تحت کچھ ایسی قوتیں،اسباب اور ذرائع جمع کردئے ہیں جو مشکل مرحلوں میں عقل کی امداد اور پشت پناہی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور نفس کے اندر یہ خیروبرکت کا مجموعہ انسان کی فطرت،ضمیر اورنیک جذبات (عواطف)کے عین مطابق ہے اور اس مجموعہ میں خواہشات کے مقابلہ میں انسان کو تحریک کرنے کی تمام صلاحیتیں پائی جاتی ہیں اور یہ خواہشات اور ہوس کو روکنے اور ان پر قابو پانے اور خاص طور سے ہوی وہوس کو کچلنے کے لئے عقل کی معاون ثابت ہوتی

[1] مستدرک وسائل الشیعہ ج ۲ ص۳۱۰۔

ہیں۔ کیونکہ (جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں کہ) عقل تو فہم وادراک اور علم ومعرفت کا ایک آلہ ہے۔ جو انسان کو چیزوں کی صحیح تشخیص اور افہام وتفہیم کی قوت عطا کرتا ہے اور تنہا اسکے اندر خواہشات کے سیلاب کو روکنے کی صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر عقل خواہشات کو کنٹرول کرنے اور ان پر قابو پانے کے لئے ان اسباب اور ذرائع کا سہارا لیتی ہے جوخداوند عالم نے انسان کے نفس کے اندر ودیعت کئے ہیں اور اس طرح عقل کیلئے خواہشات کا مقابلہ اورانکا دفاع کرنے کی قوت پیدا ہوجاتی ہے لہٰذاان اسباب کے پورے مجموعہ کو اسلامی اخلاقیات اور تہذیب و تمدن کی زبان میں عقل کے لشکروں کا نام دیا گیا ہے۔ جو ہر اعتبار سے ایک اسم بامسمّیٰ ہے۔

نمونہ کے طور پر اسکی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں: کبھی کبھی انسان مال و دولت کی محبت کے جذبہ کے دباؤ میں آکر غلط اور نا جائز راستوں سے دولت اکٹھا کرنے لگتا ہے ۔ کیونکہ ہر انسان کے اندر کسی نہ کسی حد تک مال و دولت کی محبت پائی جاتی ہے مگر بسا اوقات وہ اس میں افراط سے کام لیتا ہے ۔ ایسے مواقع پر انسانی عقل ہر نفس کے اندر موجود ''عزت نفس'' کے ذخیرہ سے امداد حاصل کرتی ہے چنانچہ جہاں توہین اور ذلت کا اندیشہ ہوتا ہے عزت نفس اسے وہاں سے دولت حاصل کرنے سے روک دیتی ہے اگر چہ اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ جس جگہ بھی توہین اور ذلت کا خطرہ ہوتا ہے عقل اسکو اس سے اچھی طرح آگاہ کر دیتی ہے لیکن پھر بھی ایسے مواقع پر مال و دولت سمیٹنے سے روکنے کے لئے عقل کی رہنمائی تنہا کافی نہیں ہے بلکہ اسے عزت نفس کا تعاون درکار ہوتاہے جسکو حاصل کرکے وہ حب مال کی ہوس اور جذبہ کا مقابلہ کرتی ہے ۔

٢۔ جنسی خواہشات انسان کے اندر سب سے زیادہ قوی خواہشات ہوتی ہیں اوران کے دباؤ کے بعد انسان اپنی جنسی جذبات کی تسلی کے لئے طرح طرح کے غلط اور حرام راستوں پر دوڑتا چلا جاتا ہے اور اس میں بھی کوئی شک و شبہہ نہیں ہے کہ ایسے اکثر حالات میں عقل جنسی بے راہ روی کے غلط مقامات کا بخوبی مقابلہ نہیں کر پاتی اور اسے صحیح الفطرت انسان کے نفس کے اندر مو

جو ایک اور فطری طاقت یعنی عفت نفس (پاک دامنی)کی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے ۔چنانچہ جب انسان کے سامنے اس کی عفت اور پاکدامنی کا سوال پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس بری حرکت سے رک جاتا ہے ۔

۳۔کبھی کبھی انسان کے اندر سربلندی،انانیت اور غرور وتکبر کا اتنا مادہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے سامنے دوسروں کو بالکل ذلیل اور پست سمجھنے لگتا ہے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جس کو عقل ہر اعتبار سے برا سمجھتی ہے اسکے باوجود جب تک عقل، نفس کے اندر خداوند عالم کی ودیعت کردہ قوت تواضع سے امداد حاصل نہ کرے وہ اس غرور وتکبر کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہے۔

۴۔کبھی کبھی انسان اپنے نفس کے اندر موجود ایک طاقت یعنی غیظ وغضب اور غصہ کا شکار ہوجاتا ہے جسکے نتیجہ میں وہ دوسروں کی توہین اور بے عزتی کرنے لگتا ہے۔چنانچہ یہ کام عقل کی نگاہ با بصیرت میں کتنا ہی قبیح اور برا کیوں نہ ہوا سکے باوجود عقل صرف اور صرف اپنے بل بوتے پر انسان کے ہوش وحواس چھین لینے والی اس طاقت کا مقابلہ کرنے سے معذور ہے لہٰذا ایسے مواقع پر عقل، عام طور سے انسان کے اندر موجود ،رحم وکرم کی فطری قوت وطاقت کو سہارا بناتی ہے۔کیونکہ اس صفت (رحم وکرم)میں غصہ کے برابر یا بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی قوت اور صلاحیت پائی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ انسان غصہ کی بنا پر کوئی جرم کرنا چاہتا ہے تو رحم وکرم کی مضبوط زنجیریں اسکے ہاتھوں کو جکڑلیتی ہیں۔

۵۔اسی طرح انسان اپنی کسی اور خواہش کے اشارہ پر چلتا ہوا خداوند عالم کی معصیت اور گناہ کے راستوں پر چلنے لگتا ہے تب عقل اسکو ''خوف الٰہی'' کے سہارے اس گناہ سے بچالیتی ہے۔اس قسم کی اور بے شمار مثالیں موجود ہیں جن میں سے مذکورہ مثالیں ہم نے صرف وضاحت کے لئے بطور نمونہ پیش کردی ہیں ان کے علاوہ کسی وضاحت کے بغیر کچھ اور مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ جیسے نمک حرامی کے مقابلہ میں شکر نعمت، بغض و حسد کے مقابلہ کے لئے پیار و محبت اورمایوسی کے مقابلہ میں رجاء وامید کی مدد حاصل کرتی ہے۔

لشکر عقل سے متعلق روایات

معصومینؑ کی احادیث میں نفس کے اندر موجود پچھتر صفات کو عقل کا لشکر کہا گیا ہے جن کا کام یہ ہے کہ یہ ان دوسری پچھتر صفات کا مقابلہ کرتی ہیں جنہیں خواہشات اور ہوس یا حدیث کے مطابق جہل کا لشکر کہا جاتا ہے ۔چنانچہ نفس کے اندر یہ دونوں متضاد صفتیں درحقیقت نفس کے دو اندرونی جنگی محاذوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن میں ایک محاذ پر عقل کی فوجوں اور دوسری جانب جہل یا خواہشات کے لشکروں کے درمیان مسلسل جنگ کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں۔ علامہ مجلسی (رح) نے اپنی کتاب بحارالانوار کی پہلی جلد میں اس سے متعلق امام جعفر صادقؑ اور امام موسی کاظمؑ سے بعض روایات نقل کی ہیں جن کو ہم ان کی سند کے ساتھ ذکر کررہے ہیں تاکہ آئندہ ان کی وضاحت میں آسانی رہے۔

پہلی روایت:سعد اور حمیری دونوں نے برقی سے انھوں نے علی بن حدید سے انھوں نے سماعہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ :میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت موجود تھا اور اس وقت آپ کی خدمت میں کچھ آپ کے چاہنے والے بھی حاضر تھے عقل اور جہل کا تذکرہ درمیان میں آگیا تو امام جعفر صادقؑ نے ارشاد فرمایاکہ: عقل اور اسکے لشکر کواور جہل اور اسکے لشکر کو پہچان لو تو ہدایت پاجاؤگے۔ سماعہ کہتے ہیں کہ:میں نے عرض کی میں آپ پر قربان، جتنا آپ نے ہمیں سکھا دیا ہے ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں تو امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ خداوند عالم نے اپنی روحانی مخلوقات میں اپنے نور کے عرش کے دائیں حصہ سے جس مخلوق کو سب سے پہلے پیدا کیا ہے وہ عقل ہے۔

پھر اس سے فرمایا سامنے آ:تو وہ سامنے حاضر ہوگئی پھر ارشاد فرمایا :واپس پلٹ جا تو وہ واپس پلٹ گئی،تو ارشاد الٰہی ہوا، میں نے تجھے عظیم خلقت سے نوازا ہے اور تجھے اپنی تمام مخلوقات پر شرف بخشا ہے پھر آپ نے فرمایا:کہ پھر خداوند عالم نے جہل کو ظلمتوں کے کھاری سمندر سے پیدا کیا اور اس سے فرمایا کہ پلٹ جا تو وہ پلٹ گیا پھر فرمایا : سامنے آ:تو اس نے اطاعت نہیں کی تو خداوند عالم نے اس سے فرمایا : تونے غرور وتکبر سے کام لیا ہے؟پھر (خدانے) اس پر لعنت فرمائی ۔اسکے بعد عقل کے پچھتر

لشکر قرار دئے جب جہل نے عقل کے لئے یہ عزت و تکریم اور عطا دیکھی تو اسکے اندر عقل کی دشمنی پیدا ہوگئی تو اس نے عرض کی اے میرے پروردگار، یہ بھی میری طرح ایک مخلوق ہے جسے تو نے پیدا کر کے عزت اور طاقت سے نوازا ہے۔ اور میں اسکی ضد ہوں جبکہ میرے پاس کوئی طاقت نہیں ہے لہذا جیسی فوج تو نے اسے دی ہے مجھے بھی ایسی ہی زبردست فوج عنایت فرما۔

تو ارشاد الٰہی ہوا :بالکل (عطا کرونگا) لیکن اگر اسکے بعد تو نے میری نا فرمانی کی تو میں تجھے تیرے لشکر سمیت اپنی رحمت سے باہر نکال دونگا اس نے کہا مجھے منظور ہے تو خداوند عالم نے اسے بھی پچھتر لشکر عنایت فرمائے ۔چنانچہ عقل اور جہل کو جو الگ الگ پچھتر لشکر عنایت کئے گئے انکی تفصیل یہ ہے: خیر، عقل کا وزیر ہے اور اسکی ضد شر کو قرار دیا جو جہل کا وزیر ہے ۔

ایمان کی ضد کفر

تصدیق کی ضد انکار

رجاء (امید) کی ضد مایوسی

عدل کی ضد ظلم و جور

رضا (خشودی) کی ضد ناراضگی

شکر کی ضد کفران (ناشکری)

لالچ کی ضد یاس

توکل کی ضد حرص

رافت کی ضد غلظت؟

رحمت کی ضد غضب

علم کی ضد جہل

فہم کی ضد حماقت

عفت کی ضد بے غیرتی

زہد کی ضد رغبت (دلچسپی)

قرابت کی ضد جدائی

خوف کی ضد جرائت

تواضع کی ضد تکبر

محبت کی ضد تسرع (جلد بازی)؟

علم کی ضد سفاہت

خاموشی کی ضد بکواس

سر سپردگی کی ضد استکبار

تسلیم (کسی کے سامنے تسلیم ہونا) کی ضد سرکشی

عفو کی ضد کینہ

نرمی کی ضد سختی

یقین کی ضد شک

صبر کی ضد جزع فزع (بے صبری کا اظہار کرنا)

خطا پر چشم پوشی (صفح) کی ضد انتقام

غنیٰ کی ضد فقر

تفکر کی ضد سہو

حافظہ کی ضد نسیان

عطوفت کی ضد قطع (تعلق)

قناعت کی ضد حرص

مواسات کی ضد محروم کرنا (کسی کا حق روکنا)

مودت کی ضد عداوت

وفا کی ضد غداری

اطاعت کی ضد معصیت

خضوع کی ضد اظہار سربلندی

سلامتی کا ضد بلاء

حب کی ضد بغض

صدق کی ضد کذب

حق کی ضد باطل

امانت کی ضد خیانت

اخلاص کی ضد ملاوٹ

ذکاوت کی ضد کند ذہنی

فہم کی ضد ناسمجھی

معرفت کی ضد انکار

مدارات کی ضد رسوا کرنا

سلامت کی ضد غیب

کتمان کی ضد افشا (ظاہر کر دینا)

نماز کی ضد اسے ضائع کرنا

روزہ کی ضد افطار

جہاد کی ضد بزدلی (دشمن سے پیچھے ہٹ جانا)

حج کی ضد عہد شکنی

راز داری کی ضد فاش کرنا

والدین کے ساتھ نیکی کی ضد عاق والدین

حقیقت کی ضد ریا

معروف کی ضد منکر

ستر (پوشش) کی ضد برہنگی

تقیہ کی ضد ظاہر کرنا

انصاف کی ضد حمیت

ہوشیاری کی ضد بغاوت

صفائی کی ضد گندگی

حیاء کی ضد بے حیائی

قصد (استقامت) کی ضد عدوان

راحت کی ضد تعب (تھکن)

آسانی کی ضد مشکل

برکت کی ضد بے برکتی

عافیت کی ضد بلا

اعتدال کی ضد کثرت طلبی

حکمت کی ضد خواہش نفس

وقار کی ضد ہلکا پن

سعادت کی ضد شقاوت

توبہ کی ضد اصرار (برگناہ)

استغفار کی ضد اغترار (دھوکہ میں مبتلا رہنا)

احساس ذمہ داری کی ضد لاپرواہی

دعا کی ضد یعنی غرور و تکبر کا اظہار

نشاط کی ضد سستی

فرح (خوشی) کی ضد حزن

الفت کی ضد فرقت (جدائی)

سخاوت کی ضد بخل ،پس عقل کے لشکروں کی یہ ساری صفتیں صرف نبی یا نبی کے وصی یا اسی بندۂ مومن میں ہی جمع ہو سکتی ہیں جس کے قلب کا اللہ نے یمان کے لئے امتحان لے لیا ہو!البتہ ہمارے بقیہ چاہنے والوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جسمیں ان لشکروں کی بعض صفتیں نہ پائی جائیں ہاں تک کہ جب وہ انہیں اپنے اندر کامل کرلے اور جہل کے لشکر سے چھٹکارا پالے تو وہ بھی انبیاء اوراوصیاء کے اعلیٰ درجہ میں ہونچ جائے گا ۔بلا شبہ کامیابی عقل اور اسکے لشکر کی معرفت اور جہل نیز اس کے لشکر سے دوری کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے ۔خداوند عالم ہمیں اور خصوصیت سے تم لوگوں کو اپنی اطاعت اور رضا کی توفیق عطا فرمائے[1] ۔

دوسری روایت :ہشام بن حکم نے یہ روایت امام موسیٰ کاظم ؑسے نقل کی ہے اور شیخ کلینی (رہ)نے اسے اصول کافی میں تحریر کیا ہے اور اسی سے علامہ مجلسی (رہ)نے اپنی کتاب بحارالانوار میں نقل کیاہے[2] ۔یہ روایت چونکہ کچھ طویل ہے لہٰذا ہم صرف بقدر ضرورت اسکا اقتباس پیش کر رہے ہیں :امام موسیٰ کاظم ؑنے فرمایا :اے ہشام عقل اور اسکے لشکروں کو اور جہل اور اسکے لشکروں کو پہچان لو اور ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہوجاؤ :ہشام نے عرض کی ہمیں تو صرف وہی معلوم ہے جوآپ نے سکھا دیا ہے تو آپ نے فرمایا :اے ہشام بیشک خداوند عالم نے عقل کو پیدا کیا ہے اور اللہ کی سب سے پہلی مخلوق ہے۔۔۔پھر عقل کے لئے پچھتر لشکر قرار دئے چنانچہ عقل کو جو پچھتر لشکر دئے گئے وہ یہ ہیں :خیر ،عقل کا وزیر اور شر ،جہل کا وزیر ہے

ایمان،کفر

تصدیق،تکذیب

اخلاص،نفاق

رجاء،ناامیدی

---

[1] بحار الانوار ج۱ ص۱۰۹۔۱۱۱ کتاب العقل والجہل۔
[2] اصول کافی جلد۱ص۱۳۔۲۳،بحارالانوار جلد۱ص۱۵۹۔

عدل، جور

خوشی، ناراضگی

شکر، کفران (ناشکری)

طمع رحمت، رحمت سے مایوسی

توکل، حرص

نرم دلی، قساوت قلب

علم، جہل

عفت، بے حیائی

زہد، دنیا پرستی

خوش اخلاقی، بد اخلاقی

خوف، جرائت

تواضع، کبر

صبر، جلد بازی

ہوشیاری، بے وقوفی

خاموشی،حذر

سرسپردگی، استکبار

تسلیم،اظہار سربلندی

عفو،کینہ

رحمت، سختی

یقین،شک

صبر،بے صبری (جزع)

عفو،انتقام

استغنا (مالداری)

،فقر

تفکر،سہو

حفظ،نسیان

صلہ رحم، قطع تعلق

قناعت،بے انتہا لالچ

مواسات،نہ دینا (منع)

مودت،عداوت

وفاداری،غداری

اطاعت،معصیت

خضوع،اظہار سربلندی

صحت،(سلامتی)بلاء

فہم،غبی ہونا (کم سمجھی)

معرفت،انکار

مدارات،رسوا کرنا

سلامۃ الغیب،حیلہ وفریب

کتمان (حفظ راز)،افشاء

والدین کے ساتھ حسن سلوک،عاق ہونا

حقیقت،ریا

معروف،منکر

تقیہ،ظاہر کرنا

انصاف، ظلم

خود سے دور کرنا،حسد

صفائی، گندگی

حیاء،وقاحت

میانہ روی، اسراف

راحت وآسانی،زحمت (تھکن)

سہولت، مشکل

عافیت،بلا

اعتدال، کثرت طلبی

حکمت،ہویٰ

وقار،ہلکا پن

سعادت،شقاوت

توبہ،اصرار برگناہ

اصرار،خوف

دعا،غرور وتکبر کی بنا پر (دعا سے)دور رہنا

نشاط، سستی

خوشی، حزن

الفت،جدائی

سخاوت،بخل

خشوع،عجب

سچائی،چغلخوری

استغفار،اغترار (دھوکہ میں بتلا رہنا)

زیرکی،حماقت

اے ہشام!یہ خصلتیں صرف اور صرف کسی نبی یا وصی اور یا اس بندۂ مومن کے دل میں ہی جمع ہو سکتی ہیں جس کے قلب کو خداوند عالم نے ایمان کے لئے آزما لیا ہو لیکن دوسرے تمام مومنین میں کوئی ایسا نہیں ہے جس میں عقل کے لشکروں کے بعض صفات نہ پائے جاتے ہوں اوراگر وہ اپنی عقل کو کامل کرلے اور جہل کے لشکروں سے چھٹکارا حاصل کرلے تو پھر وہ بھی انبیاء اور اوصیا ئے الٰہی کے درجہ میں پہونچ جائے گا اللہ ہم اور تم کو بھی اپنی اطاعت کی توفیق عنایت فرمائے۔

روایت کی مختصر وضاحت: عقل و جہل کی مذکورہ روایات میں متعدد غور طلب نکات پائے جاتے ہیں جن میں سے بعض نکات کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ ا۔ان روایات کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن واحادیث کی طرح ان روایات میں بھی کنایہ دار اور رمزیہ زبان استعمال ہوئی ہے خاص طور سے انسان کی خلقت کے بارے میں کنایات واشارات کا پہلو بہت ہی زیادہ روشن ہے لہٰذا روایات اور ان کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے کے لئے حدیث فہمی کے ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔

٢۔دونوں روایات سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب خداوند عالم نے واپس پلٹنے (ادبار) کا حکم دیا تو عقل و جہل دونوں نے اسکی اطاعت کرلی ۔لیکن جب خداوند عالم نے سامنے آنے کا حکم دیا تواس موقع پر صرف اور صرف عقل نے اطاعت کی اور جہل نے حکم خدا سے سرپیچی کرتے ہوئے سامنے آنے سے انکار کردیا ۔اِن روایات میں جہل سے مراد خواہشات نفس ہیں جیسا کہ ان دونوں روایات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کیونکہ ان دونوں میں ہی جہل کو عقل کی ضد قرار دیا گیا ہے۔میرا خیال تو یہ ہے(اگر چہ خدا بہتر جانتا ہے)کہ یہاں(ادبار)واپس جانے کے حکم سے مراد حکم تکوینی ہے جس کی طرف اس آیۂ کریمہ میں اشارہ موجود ہے: (واذا قضیٰ أمراً فانما یقول لہ کن فیکون[1]) ''اور جب کسی امر کا فیصلہ کرلیتا ہے تو صرف ''کن'' کہتا ہے اور وہ چیز ہوجاتی ہے'' اس حکم الٰہی کی پیروی اور پابندی میں عقل اور خواہشات حتی کہ پوری کائنات سبھی اس اعتبار سے مشترک ہیں کہ جب خداوند عالم کوئی حکم دیتا ہے تو وہ سبھی اسکی اطاعت کرتے ہیں۔ (إنما قولنا لشیء إذا أردناہ أن نقول لہ کن فیکون[2]) ''ہم جس چیز کا ارادہ کر لیتے ہیں اس سے فقط اتنا کہتے ہیں کہ ہوجا اوروہ ہوجاتی ہے'' (سبحانہ إذا قضیٰ أمراً فإنّما یقول لہ کن فیکون[3]) ''وہ پاک وبے نیاز ہے جب کسی بات کا فیصلہ کرلیتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہوجا اور وہ چیز ہوجاتی ہے'' چنانچہ جس طرح عقل اورا سکے لشکر خداوند عالم کے حکم تکوینی کی اطاعت کرتے ہیں اسی طرح خواہشات نفس نے بھی اسکے حکم کے مطابق عمل کیا ہے۔

---

[1] سورۂ بقرہ آیت ١١٧۔
[2] سورۂ نحل آیت٤٠۔
[3] سورۂ مریم آیت٣٥۔

لیکن سامنے آنے کا حکم اورا سکے مقابلہ میں ادبار (واپس جانے) کا حکم اور ہوائے نفس کا اس معاملہ میں عقل کی مخالفت کرنا یہ دونوں اس بات کا قرینہ ہیں کہ اس حکم سے احکام (اوامر) تشریعی مراد ہیں اور یہی وہ احکام شرعی ہیں جن میں عقل اطاعت کرتی ہے اور ہوائے نفس انکی مخالفت کرتی ہے۔

۳۔ان دونوں روایات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عقل اور خواہشات کو دو الگ الگ مادوں سے بنایا گیا ہے ۔جیسا کہ روایات میں بھی ہے کہ عقل خدا کی روحانی مخلوق ہے جس کو خداوند عالم نے اپنے نور اور عرش کے دائیں حصہ سے خلق کیا ہے جبکہ جہل (خواہشوں) کو خداوند عالم نے تاریکیوں کے کھاری سمندر سے پیدا کیاہے اگر چہ حتمی طور پر ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ عقل اور خواہشات کا پہلا مادہ (عنصراولیہ) کیا ہے۔کیونکہ اسکا علم تو صرف انھیں ہستیوں کے پاس ہے جنھیں خداوند عالم نے تاویل احادیث کا علم ودیعت فرمایا ہے۔لیکن پھر بھی ان دونوں روایات کے مطابق اس بات میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا کہ عقل کا اصل مواد اور عنصر (پہلا میٹیریل) فہم وادراک اور معرفت سے مشتق ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا ہی ایک نور ہے خواہشات کا اصل مواد اور عنصر اس فہم وادراک اور معرفت سے خالی ہے۔بلکہ خواہشات تو حاجتوں اور مطالبات کی تاریکیوں کا ایک ایسا مجموعہ ہیں جن کے درمیان سے فہم وادراک کا گذر نہیں ہوپاتا جبکہ عقل تہ درتہ فہم اور فراستوں کے مجموعہ کا نام ہے اور یہ دونوں خداوند عالم کی طرف سے انسان کی شخصیت کے بنیادی محور قرار دئے گئے ہیں؟

۴۔روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ جب عقل نے دونوں احکام کی اطاعت کرلی تو خداوند عالم نے اسکا احترام کیا اور اسے عزت بخشی لیکن جہل نے کیونکہ خدا کے حکم کی مخالفت کی تھی لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس پر لعنت فرمائی اور لعنت یعنی رحمت خدا سے دور ہوجانا اور اسکی بارگاہ سے جھڑک دیا جانا ،گویا روایت یہ بتارہی ہے کہ انسان کی شخصیت کے دو بنیادی محور اور مرکز ہیں انمیں سے ایک اسے خداوند عالم سے قریب کرتا ہے تو دوسرا محور اسکو خدا سے دور کردیتا ہے اور یہ دونوں محور اور مرکز یعنی عقل اور

خواہشات انسان کو بالکل دو متضاد زاویوں (راستوں اور مقاصد)کی طرف کھینچتے ہیں کیونکہ خدا نے انکو اسی طرح پیدا کیا ہے ۔چنانچہ عقل انسان کو خدا کی طرف لیجاتی ہے ۔اور خواہشات اسے خداوند عالم سے دور کرتے رہتے ہیں ۔

۵ ۔دونوں روایات میں اس بات کا تذکرہ ہے کہ جب خداوند عالم نے عقل کو ۷۵ لشکر عنایت فرمائے اور جہل نے بارگاہ الٰہی میں اپنی کمزوری کی فریاد کی تو خداوند عالم نے اسے بھی اتنے ہی لشکر عنایت فرمادئے لیکن اس کے بعد اس سے یہ فرمایا: (فان عصیت بعد ذلک أخرجتک وجندک من رحمتی)''اب اگر اسکے بعد تو نے میری نافرمانی کی تو میں تجھے تیرے لشکر سمیت اپنی رحمت کے دائرہ سے باہر نکال دونگا''ہم اپنے قارئین کو ایک بار پھریاد دلانا چاہتے ہیں کہ ان روایات میں اشارہ اور کنایہ کی زبان استعمال ہوئی ہے ۔لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ یہ گفتگو واقعاً خداوند عالم اور عقل وجہل کے درمیان ہوئی ہو بلکہ ہم تو صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایت اسلامی نظریہ کے مطابق خواہشات کی قدروقیمت اور اہمیت پر عمیق روشنی ڈالتی ہے ۔یعنی روایت میں جہاں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ عقل کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ خداوند عالم سے قریب کرتی ہے اور خواہشات خدا سے دور کرتے ہیں۔وہیں روایت میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ اگر خواہشات خدا کی معصیت نہ کریں تو وہ خدا کی رحمت کے مستحق رہتے ہیں لیکن جب یہ انسان کو خدا کی نافرمانی اور معصیت پر لگادیتے ہیں تو رحمت خدا سے محروم ہوجاتے ہیں ۔لہٰذا اسلام تمام خواہشات کو برا نہیں سمجھتا ہے ۔اور نہ ان کو انسان کے اوپر عذاب الٰہی قرار دتیا ہے بلکہ جب تک انسان خداوند عالم کی نافرمانی اور گناہ نہ کرلے یہ بھی عقل کی طرح انسان کے لئے ایک رحمت الٰہی ہے ۔البتہ جب یہ انسان کو خداوند عالم کی اطاعت کے حدود سے باہر نکال دیں اوراسے اسکی معصیت پر لگادیں تو پھر یہی رحمت اسکے لئے عذاب زندگی میں تبدیل ہوجاتی ہے ۔چنانچہ دین کی طرف جو یہ نسبت دی جاتی ہے کہ وہ خواہشات ،لذتوں اور شہوتوں کا مخالف ہے ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس اسلام نے ہویٰ(خواہشات) اور اسکے لشکر کو اس عظمت اور شرف سے نوازا کہ انہیں رحمت الٰہی کا مستحق قرار دیدیا ہے اور جب تک انسان گناہ کا مرتکب نہ ہو اسکے لئے اپنے خواہشات کی تسلی اور ان کی تکمیل جائز ہے اور یہ کوئی قبیح چیز نہیں ہے ۔بلکہ اسلامی نظریہ تو یہ ہے کہ اگر شرافت

کے دائرے کے اندر اور قاعدہ و قانون کے تحت رہ کر ان شہوتوں اور خواہشات کو پورا کیا جاتا رہے تو یہی انسانی زندگی کی ترقی اور کمال کا بہترین ذریعہ بن جاتے ہیں ۔

٦۔ روایات میں اس بات کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ عقل کے دو رخ (مرحلے) ہیں۔ پہلے مرحلے میں وہ کسی چیز کا ادراک کرتی ہے ۔اور دوسرے مرحلے میں اس کو عملی جامہ پہناتی ہے لہٰذا جتنی زیادہ مقدار میں عقل کے ساتھ اسکے لشکر اور صفات جمع ہوتے رہتے ہیں اسکی عملی شکل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے لیکن جوں جوں اسکے خصائل اور لشکروں کی تعداد گھٹتی رہتی ہے اسکے عمل کی رفتار بھی اسی طرح کم ہوجاتی ہے ۔اور خواہشات پر اسکا کنٹرول بھی ڈھیلا پڑجاتا ہے ۔روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ ''یہ تمام صفات ایک ساتھ صرف کسی نبی ،وصیِ نبی یا اس مومن کے اندر جمع ہو سکتے ہیں جس کے دل کا امتحان خدا لے چکا ہے ۔لیکن دوسرے تمام مومنین کرام کے اندر انمیں سے کچھ نہ کچھ صفات ضرور پائے جاتے ہیں مگر ان بعض صفات سے کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ جب تک وہ اپنے کو ان تمام صفات کا حامل نہ بنالیں اور جہل کے لشکر وں سے مکمل نجات حاصل نہ کرلیں تب تک وہ مومن کامل نہیں ہو سکتے ہیں اور جس دن وہ اسمیں کامیاب ہوجائیں گے تو انھیں بھی انبیاء واولیاء کے ساتھ جنت کے اعلی درجات میں سکونت نصیب ہوگی'' اس میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ عقل کے تنفیذ ی رخ کی تکمیل کا اثر اسکے دوسرے رخ پر پڑتا ہے اور اسکی فہم وفراست اور بصارت وبصیرت کی تکمیل ہو جاتی ہے۔اس طرح اس سلسلہ کی تینوں کڑیاں مکمل ہو جائینگی کہ:جب انسان اپنے اندر عقل کے تمام لشکر اور صفات جمع کر لے تو پھر عقل عملی منزل میں قدم رکھنے اور خواہشات کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کر لیتی ہے اور اسی سے اسکی فہم وفراست اور بصارت وبصیرت بھی کامل ہوجاتی ہے ۔اور نتیجۃً انسان انبیاء اور اولیاء کے درجہ میں پہونچ جاتا ہے(جسکی طرف روایت نے اشارہ کیا ہے)اور یہی راستہ اور طریقہ جسکو روایت نے محدود اور مشخص کر دیا ہے یہی اسلام کی نگاہ میں تربیت کی بہترین اساس اور بنیاد نیز کردار و عمل کی تقویت کا باعث ہے ۔کیونکہ عقل،بصیرت اور تنفیذ کا نام ہے اور بصیرت کی کمزوری عقل کی تنفیذی قوت کی بنا پر پیدا ہوتی ہے اور یہ (قوت تنفیذ) عقل کی خصلتوں کی کمزوری کی وجہ سے کمزور رہتی ہے لہٰذا

جب انسان اپنے نفس کے اندر ان تمام خصلتوں کو مکمل کر لیتا ہے تو بصیرت اور تنفیذ دونوں ہی لحاظ سے اسکی شخصیت مکمل ہوجاتی ہے۔

۷۔ان روایات نے بشری کرداروں کو دو مشخص اور معین حصوں میں تقسیم کردیا ہے: ا۔تقویٰ (با عمل)

۲۔فسق وفجور (بے عملی)

تقویٰ اسے کہتے ہیں جس میں عقل کی پیروی کی جائے اور ہر قدم اسی کی مرضی کے مطابق اٹھے،اور فسق وفجور کا مطلب یہ ہے کہ خواہشات اور جہل کے لشکروں کے اشاروں پر ہر عمل انجام پائے اور اسکے اوپر انہیں کا قبضہ ہو،لہٰذا قرب خدا کی منزل تک پہنچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ انسان جہالت کے لشکروں سے نجات حاصل کرلے اور خواہشات کی سرحدوں کو روند کر عقل کی حکومت میں داخل ہوجائے اور اسکے ہر طرز عمل اور رفتار وکردار پر عقل کی حکمرانی ہو۔

۸۔مذکورہ فہرست میں بشری طرز عمل اور کردار کے طورطریقہ کے پچھتر جوڑوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جن میں سے ہر جوڑا دو متضاد اعمال سے مل کر بنا ہے ۔یعنی ان میں سے ایک عقل کے طرز عمل کی فہرست میں شامل ہے اور دوسرا شہوت کے طریقۂ کار کی فہرست کے دائرہ میں آتا ہے ۔لہٰذا اس فہرست میں پچھتر عقل کے طریقۂ کار اور پچھتر شہوت کے کرتوت ذکر ہیں جن میں پہلے باترتیب عقل کے لشکر کے صفات ذکر ہوئے ہیں اور اسکی ہر صفت کے بعد اسی کی مخالف،جہل کی صفت کا تذکرہ ہے

۹۔بشریت کے طرز عمل اور آداب وکردار کے صفات کی ان دونوں فہرستوں کو دیکھنے کے بعدیہ اندازہ ہوتا ہے کہ خداوند عالم نے انسان کے نفس میں ہرآرزو کو پورا کرنے کے لئے اور اسے ہویٰ و ہوس سے بچانے کے لئے ایک دفاعی طاقت بھی رکھی ہے ۔اور کیونکہ انسان کے تکامل اور تحرک کے لئے اسکے نفس میں خواہشات کا وجود ضروری ہے اسی لئے خداوندعالم نے ہر خواہش کو

روکنے اور اسکا مقابلہ کرنے کے لئے اسمیں ایک صفت (قوت مدافعت) ودیعت فرمائی ہے تاکہ ان کا تعادل ہمیشہ برقرار رہ سکے۔

۱۰۔ایسا نہیں ہے کہ بشری طرز عمل کے جویہ ایک سو پچاس صفات ہیں یہ ایک عام اور معمولی صفت یا سر سری خصوصیات ہوں جو کبھی کبھی اسکے نفس پرطاری ہوجاتے ہوں بلکہ انسان کے تمام اعمال کی بنیادیں بہت گہری اور انکی جڑیں بہت وسیع حد تک پھیلی ہوئی ہیں لہٰذا انسان جو اچھائی یا برائی کرتا ہے اسکا تعلق نفس کے باطن سے ضرور ہوتا ہے ۔جس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ موجود ہے: (فألهمها فجورها وتقواها[1])'' اور پھر اسے بدی اور تقوی کی ہدایت کردی ''لہٰذا تقوی اور بدی میں سے ہر ایک کا سرچشمہ نفس ہی ہے اور یہ انسان کے طرز عمل میں کہیں باہر سے نہیں آتا ہے

۱۱ ۔ عقل کے لشکر (صفات)کی فہرست میں غورو فکر سے کام لینے والا شخص بآسانی ان کی دو قسمیں کر سکتا ہے:

۱۔اکسانے اور مہمیز کرنے والی صفات ۔

۲۔روکنے والے قواعد (ضوابط)

اکسانے والے صفات ،نفس کو نیک اعمال پر ابھارنے اور مہمیز کرنے والے صفات کوکہا جاتا ہے ۔ جیسے ایمان ،معرفت ،رحمت اورصداقت ۔ضوابط وہ اسباب ہیں جن کے ذریعہ نفس کے اندر رکنے اور بازر ہنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے ۔ جیسے عفت ،زہد ،صبر ،قناعت اورحیاء ۔اکسانے والے صفات ان تمام عادات وصفات کا مجموعہ ہیں جو انسان کی شخصیت میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور کسی بھی کار خیریا رحمت ومعرفت میں اسے جو ضرورت ہوتی ہے وہ اس کوپورا کرتے ہیں لیکن ضوابط (قواعد)انسان کی

---

[1] سورۂ شمس آیت۸۔

شخصیت کو پستی میں گرنے سے محفوظ رکھتے ہیں اسطرح یہ مہمیز کرنے اور بچانے والے صفات ایک ساتھ مل کر ہی انسان کی شخصیت کی تعمیر اور اسکی حفاظت کا کام انجام دیتے ہیں اور اس سلسلہ میں عقل کے مدد گار ثابت ہوتے ہیں ۔

اب اسکی مزید تفصیل ملاحظہ فرمائیں: انسانی زندگی میں عقل دو قسم کے عمل انجام دیتی ہے ۔ ا۔انسان کو ان مقاصد اور منزلوں کی طرف تحریک اور مہمیز کرنا جو اس کی ترقی اور تکامل کے لئے ضروری ہیں ۔

۲۔پرخطر جگہوں پر انسان کو لغزشوں سے محفوظ رکھنا ۔مثال کے طور پر انسان خدا وندعالم کی طرف سیر وسلوک کی منزلیں طے کرتا ہوا منزل سعادت وکمال تک پہونچتا ہے ایسے مرحلہ میں عقل کا اہم کردار یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کو ذکرو عبادت الٰہی اور اسکی محبت کی دعوت دیتی ہے اور اپنی انا نیت سے خدا وندعالم کی طرف یہ سفر اور حرکت انسانی زندگی کی ایک اہم بنیادی ضرورت ہے۔اس طرح مومنین کی آپسی محبت اور اخوت وبرادری کے ذریعہ انسان کی شخصیت کو چار چاند لگ جاتے ہیں جس کو اسلام نے ولاء،اخوت و برادری اورپیار و محبت کا نام دیاہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں تمام مومنین ایک دوسرے سے میل محبت رکھیں اور ایک دوسرے کا تعاون کریں اور ہر شہر والے دوسرے شہر والوں کے کام آئیں تنہائی اور انفرادیت سے سماجیات اور معاشرہ کی طرف قدم اٹھا نا بھی انسان کی ایک اہم ضرورت ہے ۔یہ دونوں مثالیں تو عقل کے مثبت کاموں کے بارے میں تھیں مگر انسان ان دونوں راستوں میں خطا ولغزش کا شکار ہوتا رہتا ہے ۔چنا نچہ وہ انانیت (ذاتیات)سے خدا کی طرف بلند پر وا زی کے دوران اچانک اوپر سے نیچے کی طرف یعنی (خدا سے ذاتیات)کی طرف گرنا شروع کردیتا ہے اور یہ سب گناہ کرنے نیز خواہشات اور شیطانی وسوسوں اور ہوس کے جال میں پھنسنے کی وجہ سے ہوتا ہے اسی طرح کبھی کبھی انسان اپنے ذاتی مفاد جیسے خود پسندی یادوسروں سے بغض وحسد یا کسی چیز کی لالچ کی بنا پر سماج اور معاشرے پر فدا رہنے اورا سکے لئے بے شمار قربانیاں پیش کرنے کے باوجود قوم اور معاشرے پر اپنی ذات کو فوقیت دینے لگتا ہے،ایسے مواقع پر عقل بہت موثر کردار کرتی ہے یعنی:ا۔ ذاتیات اورانانیت سے اللہ کی طرف اور انفرادیت (تنہائی)سے سماج اور معاشرے کی طرف انسانی حرکت اور سفر میں

۔ ۲۔اللہ سے انانیت کی طرف اور امت اور قوم میں غرق رہنے کے بجائے ذاتیات (شخصی فوائد)کی جانب اسی طرح ایثار سے استیثار و خود پسندی کی طرف واپسی کے تمام مراحل میں بھی عقل انسان کو خواہشات کی پیروی اور ان کے ساتھ پھسل جانے اور گمراہ ہونے سے روکتی رہتی ہے ۔

جب انسان آزادانہ طورپر خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے ان کے دھارے میں بہہ کر خدا کی طرف جانے کے بجائے انانیت کی طرف جاتاہے،قوم کے لئے قربانی پیش کرنے کے بجائے ذاتی مفادات اور ایثار کے بجائے اپنی ذات کی طرف واپس پلٹنے لگتا ہے تبھی عقل اسکا راستہ روک لیتی ہے اگرچہ یہ دوسری بات ہے کہ تنہا عقل کے اندر اتنی صلاحیت اور طاقت نہیں ہے کہ وہ خدا اور قوم وملت کی طرف انسانی حرکت یا انانیت اورذاتیات کی وجہ سے گمراہ ہوتے وقت اپنے بل بوتے پر تنہا ان دونوں مرحلوں کو سر کرلے لہذاوہ مجبوراً ان صفات اور عادات کا سہارا لیتی ہے جن کو خداوند عالم نے انسان کی عقل کی پشت پناہی اور امداد کے لئے نفس کے اندر ودیعت فرمایا ہے ۔

ان صفتوں اور عادتوں کی دو قسمیں:ہیں کچھ صفات وہ ہیں جو انانیت سے خدا کی طرف اور ذاتی مفادات سے قوم وملت پر فدا ہونے تک انسانی سفراور حرکت کے دوران اس کی شخصیت کی معاون ومددگار ہوتی ہیں اوربعض دوسرے صفات اس کو خواہشات نفس کا مقابلہ کرنے اور ان پر قابو پانے کی قوت وطاقت عطا کرتے ہیں ۔ جیسے خدا سے فطری لگاؤ اسی طرح محبت خدا اور ذکرو عبادت الٰہی سے فطری لگاؤ اوریہ جذبہ انسان کو خدا کی طرف اسی طرح کھینچتا ہے جس طرح سماجیات اور قوم وملت سے دلچپی اور ان کی محبت اور بھائی چارگی کا جذبہ انسان کو قوم وملت کی طرف لیجاتا ہے ۔ عقل کی ان عادتوں کو کسی کام پر ''ابھارنے یااکسانے اور مہمیز کرنے والی طاقت ''کہا جاتا ہے جبکہ ان کے علاوہ کچھ ایسی صفات بھی ہیں جو انسان کی عقل کو ان معاملات میں کنٹرول کرنے اور اسے باز رکھنے والی طاقتیں کہی جاتی ہیں۔ جیسے حیاء انسان کو بد کرداری سے روکتی ہے یا علم و برد باری اسے غصہ

سے باز رکھتا ہے تو عفت اور پاکدامنی ،جنسی بے راہ روی کا سد باب کرتی ہے ۔اور قناعت ، حرص اور لالچ سے محفوظ رکھتی ہے ۔وغیرہ غیرہ ۔انھیں صفات کے مجموعہ کو انسانی حیات کے آداب (رفتار وگفتار اور کردار)میں ضوابط کا نام دیا جاتا ہے ۔

یہی ضوابط ، عصم (بچانے اور محفوظ کرنے والے) صفات بھی کہے جاتے ہیں کیونکہ یہ انسان کو گمراہی وغیرہ سے محفوظ رکھتے ہیں اور اگر یہ عصمتیں (بچانے والی قوتیں)انسان کے اندر نہ ہوتیں تو عقل کسی طرح بھی اپنے بل بوتے پر خواہشات نفس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور ان عصم (بچانے والی صفات)کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان کی قوتیں اور صلاحتیں مختلف ہیں جن کے متعدد اسباب ہیں اسکی تفصیل ہم انشاء اللہ آئندہ بیان کرینگے ۔

۱۲۔جن صفات اور خصوصیات کو ہم نے عقل کا لشکر قرار دیا ہے اور وہ عقل کی پشت پناہی کا کردار کرتے ہیں ان کا صحیح فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب یہ عقل اور دین کے تابع ہوں لیکن اگر خدا نخواستہ یہ عقل اور دین کی حکومت سے باہر نکل جائیں تو پھر یہ انسان کے لئے مفید ہونے کے جائے نقصان دہ ہوجاتے ہیں جیسے رحم دلی انسان کے لئے ایک اچھی اور بہترین صفت ہے لیکن جب یہی صفت عقل اور دین کے دائرہ سے باہر نکل جائے تو یہی نقصان دہ ہوجاتی ہے جیسے مجرمین کے ساتھ رحم دلی سے پیش آنے کو عقل اور دین دونوں نے منع کیا ہے جیسا کہ ارشا دالٰہی ہے : (ولا تأخذکم بھا رأفۃ[1]) ''اور تمھیں ان کے اوپر ہرگز ترس نہ آئے'' اسی طرح انفاق ایک اچھی صفت ہے مگر جب یہ عقل اور دین کے راستے سے منحرف ہوجا تی ہے تو تعمیر کے بجائے تخریب کرنے لگتی ہے اسی لئے دین اور عقل دونوں نے ہی ایسے مواقع پر اس سے منع کیا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: (ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوماً محسوراً[2]) ''اور نہ اپنے ہا تھوں کو بالکل کھلا ہوا چھوڑدوکہ آخر میں ملول اور خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاؤ''

۱۳۔جہل کے لشکر چاہے جتنے قوی کیوں نہ ہوں مگر اسکے باوجود وہ انسان کے ارادہ کے اوپر غلبہ حاصل نہیں کر سکتے ہیں اور اس سے اسکی قوت ارادی نہیں چھین سکتے ہیں اور بالآخر کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کے فیصلہ کا اختیار اسکے ارادہ کے ہی اختیار

[1] سورہ نور آیت۲۔
[2] سورہ اسراء آیت ۲۹۔

میں رہتا ہے البتہ کل ملا کر جہل کی فوجیں اتنا کر سکتی ہیں کہ وہ انسان کے ارادہ کے اوپر کسی طرح کا دباؤ ڈال دیں اور وہ دباؤ اتنا زیادہ ہو جو اس ارادہ کو عمل کے لئے تحریک کردے ، لیکن پھر بھی یہ انسان سے اس کی قوت ارادہ اوراسکی آزادی واختیارکو سلب نہیں کر سکتے ہیں ۔اگر چہ اس میں بھی کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ عقل یا جہل کے صفات سے ارادہ کسی حدتک متاثر ضرور ہوتا ہے

۱۴۔یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے کہ عقل کے لشکروں کی قوت وطاقت یا کمزوری کا تعلق انسان کی اچھی یا بری تربیت سے ہوتا ہے اگر واقعاً کسی کی اچھی تربیت ہو اور وہ متقی انسان ہوجائے تو عقل کی یہ خصلتیں قوی ہوجاتی ہیں اور خواہش نفس اور شہوتیں خود بخود کمزور پڑجاتی ہیں ۔

اسی طرح اسکے برعکس یہ بھی ممکن ہے کہ خواہشات کی اندھی پیروی اور غلط تربیت یا سماج کی وجہ سے جب انسان بگڑ جاتاہے توشہوتوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے اور عقل کے لشکر (صفات) کمزور پڑجاتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بعض حلال خواہشات کی تکمیل سے بھی اکثر منع کیا ہے تا کہ انسان ان لذتوں (اور خواہشات)کے بہاؤ کے ساتھ غلط راستوں پر نہ بہنے پائے جیسا کہ رسول اکرمؐ نے اسی بارے میں یہ ارشاد فرمایا ہے:(من أکل مایشتھی لم ینظر اللّٰہ الیہ حتیٰ ینزع أو یترک[1]) ''جو شخص اپنی دل پسند چیز کھاتا رہے تو جب تک اسے ترک نہ کردے یا اس سے دور نہ ہو جائے خداوند عالم اسکی طرف نظر بھی نہیں کرتا ہے''اسکی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان کھانے پینے میں اپنی ہر خواہش پوری کرتا رہے اور اپنے پیٹ کے اوپر کنڑول نہ رکھے تو حلال کھاتے کھاتے ایک نہ ایک دن وہ حرام کھانا شروع کر دیگا ۔(کیونکہ وہ اپنی پسند کا بندہ ہے)اور حرام خوری کرنے والے انسان پر رحمت الٰہی نازل نہیں ہوتی اور خدا اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا ہے ۔علماء اخلاق نے خواہشات کو لطیف اور سبک بنانے کے لئے کچھ طریقے بیان کئے ہیں جیسا کہ ابراھیم خواص نے کہا ہے کہ دل کی پانچ دوائیں ہیں:۱۔ قرآت قرآن ۔

۲۔خالی پیٹ (رہنا)

---

[1] بحارالانوار ج ۷۰ ،ص ۷۸۔ ح ۱۰۔

۳۔نماز شب ۔

۴۔سحر کے ہنگام گریہ وبکا (تضرع)

۵۔صالحین کی ہم نشینی ۔کسی اور کا یہ قول ہے کہ خداوندعالم نے دلوں کو اپنے ذکر کا مسکن (گھر)بنا یا تھا ۔مگر وہ شہوتوں کا اڈہ بن گئے اور دلوں کے اندر سے یہ خواہشات انسان کوہلاکر رکھ دینے والے خوف یا تڑپادینے والے شوق کے بغیر نہیں نکل سکتی ہیں[1]۔ خواہشات کو نرم ولطیف اور کمزور کرنے اور عقل کے لشکر وں کی امداد کرنے والی اس صفت کی طرف امیر المو منینؑ نے خطبۂ متقین میں یہ ارشاد فرمایا ہے:(قدأحیا عقلہ وأمات نفسہ)'' اس نے اپنی عقل کوزندہ کر دیا اور اپنے نفس کومردہ بنا دیا ''اسلام میں تربیت وہی ہے جس کی طرف مولائے کائناتؑ نے اشارہ فرمایا ہے کہ: اس کے ذریعہ خواہشات کی بڑی سے بڑی خصلتیں مختصراور لطیف ہوجاتی ہیں جن کی تعداد روایات میں ۷۵ بیان کی گئی ہے ۔ اسکے علاوہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ وقت ضرورت یہ عقل کی ۷۵ صفتوں اور خصلتوں کی امداد اور پشت پناہی بھی کرتی رہتی ہے ۔

۱۵۔جب عقل کو اپنی خصلتوں کی جانب سے مکمل پشت پناہی حاصل ہوجاتی ہے تو پھر خواہشات کے اوپر عقل کا کنٹرول اور حکومت قائم ہوجاتی ہے اور وہ ان کے اوپر اچھی طرح تسلط قائم کرلیتی ہے اور انسان کو محفوظ کر کے خواہشات کی طاقت کو بالکل ناکارہ بنادیتی ہے جیسا کہ حضرت علیؑ نے فرمایا ہے: (العقل الکامل قاھرللطبع السوء[2]) ''عقل کامل بری طبیعتوں پر غالب رہتی ہے''اس طرح عام لوگوں کے خیالات کے بر خلاف انسان در حقیقت صرف اپنی خواہشوں پر کنٹرول کر کے ہی قوی اور طاقتور ہوتا ہے جبکہ عام لوگ تو خواہشات اور ہویٰ و ہوس کی حکومت اور غلبہ کو طاقت اور قوت سمجھتے ہیں مگر اسلام کی نگاہ میں خواہشات کو

---

[1] ذم الہویٰ لابن الجوزی ص۷۰ ۔
[2] بحارالانوار ج۷۸ص۹۔

اپنے ماتحت رکھنے کا نام غلبہ اورقوت و طاقت ہے اور خواہشات کی حکومت اور اسکی ماتحتی میں چلے جانے کو طاقت اور غلبہ نہیں کہا جاتا ۔

رسول اکرم ﷺ: (لیس الشدید من غلب الناس،ولکن الشدید من غلب نفسہ[1]) ''طاقتور وہ نہیں ہے جو لوگوں کے اوپر غلبہ اصل کرلے بلکہ طاقتور وہ ہے جو نفس کو اپنے قابو میں رکھے'' آپؐ ہی کا یہ ارشاد گرامی ہے: (لیس الشدید بالصرعۃ،انما الذی یملک نفسہ عندالغضب[2]) ''کشتی اور پہلوانی کے ذریعہ انسان طاقتور نہیں بنتا ہے بلکہ طاقتور وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر اختیار رکھے'' آپ ہی کا یہ ارشاد گرامی ہے: (أشجع الناس من غلب ھواہ[3]) ''سب سے زیادہ بہادر وہ ہے جو اپنی خواہشات پر غلبہ حاصل کرلے''

عقل کامل کے فوائداور اثرات

جب خواہشات کے اوپر ہر اعتبار سے عقل کا تسلط قائم ہوجاتا ہے اوراسے انسان کی رہنمائی اور ہدایت کے تمام اختیارات حاصل ہوجاتے ہیں تویہی عقل بے شمار فوائد اور برکتوں کے سرچشمہ میں تبدیل ہوجاتی ہے اور یہیں سے انسانی زندگی میں بے شمار انقلابات پیدا ہوتے ہیں اب انسانی حیات میں عقل کے فوائدکیا ہیں ان کو ہم یہاں روایات کے ذیل میں اختصار کے ساتھ بیان کر رہے ہیں اور ان کی تفصیلات کو ترک کر رہے ہیں ۔

۱۔حق کے اوپر استقامت: حضرت علیؑ:(ثمرۃ العقل الاستقامۃ[4]) ''عقل کا پھل استقامت (ثابت قدمی)ہے'' (ثمرۃالعقل لزوم الحق[5]) ''عقل کا پھل حق کے ساتھ دائمی وابستگی ہے''

---

[1] ذم الہوی ۳۹۔
[2] مسنداحمد وبیہقی۔
[3] بحار الانوار ج۷۰ ص ۷۶ ح۵۔
[4] غررالحکم ج۱ص۳۲۰۔
[5] گذشتہ حوالہ۔

۲۔دنیا سے دشمنی رکھنا کامل عقل کا ثمر ہے: حضرت علیؑ: (ثمرۃ العقل مقت الدنیا،وقمع الھوی[1]) ''عقل کا پھل دنیا کو ناپسند رکھنا اور خواہشات کو اکھاڑ پھینکنا ہے''

۳۔خواہشات پر مکمل تسلط: حضرت علیؑ: (اذاکمل العقل نقصت الشھوۃ[2]) ''جب عقل کامل ہوجاتی ہے تو خواہشیں مختصر ہوجاتی ہیں'' (من کمل عقلہ استھان بالشھوات[3]) ''جسکی عقل مکمل ہوجاتی ہے وہ خواہشوں کو حقیر بنادیتا ہے'' (العقل الکامل قاہر للطبع السوء[4]) ''عقل کامل بری طبیعتوں پر کنٹرول رکھتی ہے''

۴۔حسن عمل اور سلامتی کردار (من کمل عقلہ حسن عملہ[5]) ''جسکی عقل مکمل ہوگئی اسکا عمل حسین ہوگیا'' عصمتیں روایات کے ذیل میں عقل کے صفات (لشکروں) کی وضاحت کے بعد اب ہم خواہشات کا مقابلہ کرنے کے طریقہ کے علاوہ ان کے علاج کا طریقہ بھی بیان کرینگے ۔جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں کہ عقل کے اندر اتنی قوت اور صلاحیت نہیں پائی جاتی ہے کہ وہ تن تنہا خواہشات کا مقابلہ کرسکے۔اور اگر کبھی ایسا موقع آجائے تو عقل کو ان کے سامنے بہر حال گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہونا پڑیگا ۔لیکن چونکہ خداوند عالم نے خواہشات کا مقابلہ کرنے کے لئے عقل کو اسکے معاون ومددگار صفات (اور لشکروں) سے نوازا ہے لہٰذا عقل کو ان کا مقابلہ کرنے یا انہیں کنٹرول کرنے میں کسی قسم کی زحمت کا سامنا نہیں ہوتا ہے اور یہ لشکر خود بخود بڑھ کر خواہشات کا راستہ روک لیتے ہیں اور ان کو بے راہ روی سے بچائے رکھتے ہیں ۔

جن صفات اور لشکروں کی امداد کے سہارے عقل خواہشات پر کنٹرول کرکے انہیں اپنے قابو میں رکھتی ہے انھیں اخلاقی دنیا میں عصم (محافظین عقل) کہا جاتا ہے ۔ لہٰذا عقل کے ان صفات کی صحیح تعلیم وتربیت اور پرورش اور نفس کے اندر ان کی بقاء و دوام

---

[1] غررالحکم ج۱ص۳۲۳۔
[2] غررالحکم ج۱ص۲۷۹۔
[3] غررالحکم ج۱ص۱۸۰۔
[4] بحارالانوار ج۷۸ص۹۔
[5] گذشتہ حوالہ۔

ہی خواہشات نفس کے مقابلہ اور علاج کا سب سے بہترین اسلامی ،اخلاقی اور تربیتی طریقۂ کار ہے ۔کیونکہ ان عصمتوں (محافظوں)کا فریضہ یہ ہے کہ وہ انسان کو گناہوں میں آلودہ نہ ہونے دیں اور اسے حتی الامکان خواہشات کے چنگل سے محفوظ رکھیں۔ چنانچہ اگر نفس کے اندر خداوند عالم کے عطا کردہ یہ محافظ (عصمتیں)نہ ہوتے تو عقل تن تنہا کبھی بھی خواہشات کے حملوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی،لیکن اب چونکہ اسکے ساتھ ان محافظین کی کمک اورپشت پناہی موجود ہے لہٰذا وہ آسانی کے ساتھ انسانی خواہشات کے اوپر ہر لحاظ سے قابو پالیتی ہے اور ان کو اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے ۔

یہ عصمتیں (محافظین عقل) مختلف حالات سے گذرتی رہتی ہیں یعنی کبھی یہ قوی ہوجاتی ہیں اور کبھی بالکل کمزور پڑجاتی ہیں ۔چنانچہ جب یہ بالکل طاقتور ہوتی ہیں تو انسان کو ہر قسم کی برائی سے بچائے رکھتی ہیں اور اسے گناہ نہیں کرنے دیتیں لیکن اگر خدا نخواستہ یہ کمزور ہوجائیں تو پھر انسان کی ہوس اور خواہشات نفسانی اس پر غالب آجاتے ہیں اور وہ انھیں کا ہوکر رہ جاتا ہے ۔یہ عصمتیں تقویٰ کے ذریعہ مضبوط ہوتی ہیں اور گناہوں اور برائیوں کی وجہ سے کمزور پڑجاتی ہیں بلکہ گناہوں کا اثر ان کے اوپر اس حدتک ہوتا ہے کہ یہ بالکل چاک چاک اور پارہ پارہ ہوکر رہ جاتی ہیں جسکے بعدانسانی خواہشات اسکے اوپر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں کہ وہ بالکل بے یارومددگار ہوجاتاہے اور کوئی اسکا بچانے والا محافظ اور نگہبان باقی نہیں رہ جاتا ۔جیساکہ دعائے کمیل کے اس جملہ میں اسکی طرف اشارہ موجودہے: (اللّٰھم اغفر لی الذنوب التی تھتک العصم)''بارالٰہا میرے ان گناہوں کو بخش دے جو عصمتوں کو چاک چاک کردیتے ہیں'' دوسری بات یہ کہ تقویٰ اور عصمتوں کے درمیان جو آپسی رابطہ ہے وہ طرفینی (دوطرفہ رابطہ)ہے یعنی اگر تقویٰ سے ان عصمتوں کو مدد ملتی ہے تو دوسری جانب یہ عصمتیں تقویٰ کی تقویت میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔

اس طرح گناہوں اور عصمتوں کے درمیان بھی دو طرفہ اثرات پائے جاتے ہیں یعنی جس طرح گناہ ، عصمتوں کوکمزور یا پارہ پارہ کردیتے ہیں اسی طرح اگر عصمت باقی نہ رہ جائے تو انسان بڑی آسانی کے ساتھ خواہشات کے چنگل میں گرفتار ہوجاتا ہے ۔یہ عصمتیں نفس کے اندر ہی پیدا ہوتی ہیں اور ان کی بنیادیں اور جڑیں فطرت کی تہوں میں اتری ہوتی ہیں اور خداوند عالم نے انسان کے نفس اور

اسکی فطرت کے اندر ان (عصمتوں) کے خزانے جمع کر رکھے ہیں جو خداوند عالم کی طرف سے معین کردہ فریضہ کی ادائیگی میں عقل کو سہارا دیتے ہیں ۔جبکہ کچھ ماہرین سماجیات کا یہ خیال ہے کہ یہ عصمتیں نفس کے اندر پہلے سے موجود نہیں تھیں بلکہ جس سماج اور معاشرے میں انسان زندگی بسر کرتا ہے وہ انہیں سے یہ عصمتیں بھی سیکھتا ہے اور درحقیقت یہ سماج ہی کے ذریعہ اسکے نفس کے اندر منتقل ہوتی ہیں یہی وجہ ہے کہ مختلف قسم کے سماج اور معاشروں کے اعتبار سے انکی قوت وطاقت اور مقدار کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے ۔اس نظریہ میں اتنی کمزوریاں پائی جاتی ہیں جن کا کوئی بھی جواب ممکن نہیں ہے ۔

کیونکہ ذاتی خصلتوں (اور اعمال) کا تعلق فطرت کی گہرائیوں سے ہوتا ہے البتہ ان کے اوپر معاشرتی اور سماجی ماحول اثر انداز ضرور ہوتا ہے اور ان کو معاشرہ یا سماج سے جدا کردینا ممکن نہیں ہے ۔مگر یہ سوچنا بالکل غلط ہے کہ ذاتی عادات و اطوار سماجیات سے بالکل الگ ہوتے ہیںیعنی ہم دوسری قسم کو سماج پر اثر انداز ہونے والے کے عنوان سے قبول کرلیں اور انھیں کے لئے پہلی خصلت کو چھوڑدیں کیونکہ ذاتی خصوصیات کو بالکل کالعدم قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ ہی کسی بھی اچھے یا برے معاشرے سے ان کو جدا کیا جاسکتا ہے ۔ان دونوں صلاحیتوں اور صفات (اور طرز تفکر) کے درمیان یہ فرق ہے کہ ذاتی صلاحتیں ہر دوراور ہر تمدن میں تمام انسانوں کے درمیان بالکل یکساں طورپر دکھائی دینگی جبکہ سماجی رسم ورواج ہر روز پیدا ہوتے رہتے ہیں اور مختلف اسباب کی بنا پر کچھ دن کے بعد ختم ہوجاتے ہیں حتی کہ بعض علاقویاملکوں میں کچھ ایسے رسم ورواج پائے جاتے ہیں جن کو دوسرے ممالک میں کوئی جانتا بھی نہیں ہے ۔مثال کے طورپر خداوند عالم پر ایمان رکھنا ہر انسان کے اندر ایک ذاتی اور فطری چیز ہے جبکہ کفر والحاد ایک سماجی پیداوار ہے جو فطرت ایمان اور حتی خداوند عالم کے خلاف سرکشی اور بغاوت کے بعدپیدا ہوتاہے ۔اگر چہ ایما ن اور کفر دونوں ہی کا وجود تقریباتاریخ انسانیت کے ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے ۔لیکن اسکے باوجود ان کے درمیان بے حد فرق ہے کیونکہ ایمان خدا کا وجود تو انسانی تمدن ہتاریخ اور زندگی میں ہر جگہ مل جائے گااور کوئی بشری تاریخ بھی اس سے ہرگز خالی نہیں ہے ۔

حتی کے سورج،چاند ،اور بتوں کی عبادت کا سرچشمہ بھی در اصل یہی ایمان ہے ۔یہ اور بات ہے کہ ان کا رخ صحیح فطرت کی طرف ہونے کے بجائے کسی دوسری طرف ہوگیا ہے ۔لیکن الحاد کا وجود کسی تہذیب یافتہ سماج کے اندر نہیں دکھائی دیتا چنانچہ نہ جانے انسان کے اوپر ایسے کتنے دور گذرے ہیں جن میں الحاد کا باقاعدہ کہیں کوئی وجود اور سراغ نہیں پایا جاتا جس کو کسی تہذیب و تمدن اور عقل و منطق کی پشت پناہی بھی حاصل رہی ہو۔لیکن ایمان کا وجود آپ کو پوری کائنات میں ہر جگہ نظر آئے گا مگر الحاد کبھی کبھی کچھ عرصہ تک ادھر ادھر اپنا سر ابھارتا ہے اور ایک دن خود بخود نابود ہوجاتا ہے ۔

جیسا کہ سیاست اور تہذیب و تمدن نیز فکر انسانی کی تاریخ میں اس کا سب سے زیادہ عروج مارکسیسم کے دور میں ہوا جب باقاعدہ ایک سپر پاور حکومت کی پشت پناہی نے اس نظریہ کو عام کرنے کی کوشش کی مگر دنیا نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اچانک اس کے غبارے کی ہوانکل گئی اور اب کوئی شخص مارکس کا نام لینے والا بھی نہیں ہے ۔لیکن خداوند عالم پر ایمان کی صورتحال ایسی نہیں ہے ۔لہذا جو شخص خداوند عالم پر ایمان اور الحاد (اسکے انکار)کے درمیان فرق محوس نہ کر سکے اس نے خود اپنے نفس کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ۔ عصمتوں کے بارے میں مزید گفتگو کچھ عرصہ پہلے میں نے عصمت کے بارے میں چند صفحات قلمبند کئے تھے جو ہماری اس بحث سے مربوط ہیں لہذا مناسب سمجھا کہ اسکے کچھ مفید اقتباسات اس مقام پر شامل کردئے جائیں تاکہ گذشتہ گفتگو تشنۂ تشریح نہ رہ جائے ۔ہم نے عرض کیا تھا کہ انسان کے اوپر اسکی خواہشات کی حکومت بہت مضبوط اور مستحکم ہوتی ہے جسکی وجہ سے اسکے نقصانات بھی بیحد خطرناک ہوتے ہیں لہذا جب تک انسان اپنی خواہشات کو اچھی طرح اپنے قابو میں کرکے متعادل اور محدود نہ بنادے وہ زندگی میں خواہشات کے خطرات سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہ سکتا ہے چنانچہ ہر انسان کے سرپر یہ خطرات ہمیشہ منڈلاتے رہتے ہیں لہذا کوئی نہ کوئی ایسا اخلاقی اور تربیتی نظام درکار ہے جو انسان کو اسکی انفرادی اور سماجی زندگی میں ہر جگہ خواہشات کے طوفان کا مقابلہ کرنے اور انہیں قابو میں رکھنے نیز اسکے نقصانات سے بچنے کی صلاحیت عطا کردے ۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظام تربیت کیا ہے ؟جسکی پابندی کے بعد انسان اپنے خواہشات کے فریب سے محفوظ رہ سکتا ہے؟ اہل دنیا کے درمیان اس بارے میں چند نظریات پائے جاتے ہیں: پہلا نظریہ رہبانیت کا ہے جس میں خواہشات کے مقابلہ کا یہ طریقہ بتایا گیا ہے کہ خواہشات کو نفس کے اندر اس طرح کچل دیا جائے کہ وہ اس میں گھٹ کر رہ جائیں اور اسکے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کے حصول کی خاطر فتنہ انگیز اور بھڑکانے والی باتوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی جائے ۔ رہبانیت میں یہ نظریہ بالکل عام ہے اور اسکی جڑیں ان کی قدیم تاریخ کے اندر دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں ۔اس مکتب فکر (نظریہ)کا خلاصہ یہ ہے کہ خواہشات کوہر قسم کے فتنہ سے دور رکھا جائے اور دنیاوی لذت وآرام سے پرہیز کرکے ان سے دوری اختیار کی جائے ۔کیونکہ انسان کا خاصہ یہ ہے کہ وہ برائی پر اصرار کرتا ہے اورچونکہ خواہشات اور فتنوں کے درمیان رابطہ پایا جاتاہے اور انسان کی سلامتی اسی میں ہے کہ اسے فتنوں سے دور کردیا جائے ۔ لہٰذا خواہشات سے دوری اور دنیا کے فریبوں اور لذتوں سے کنارہ کشی میں ہی انسانیت کی بھلائی ہے اور اس نظام کا ماحصل یہ ہے کہ خواہشات اور لذتوں کو بالکل ترک کرکے دنیا سے ایک دم کنارہ کشی اختیار کرلی جائے اور اسے ترک کئے بغیر اس مقصد تک رسائی ممکن نہیں ہے ۔تہذیب و تمدن کے افکار کے درمیان یہ ایک مشہور و معروف نظریہ ہے جس کے اثرات موجودہ دور کی باقی ماندہ مسیحیت میں بھی پائے جاتے ہیں ۔لیکن اسلام نے اس طرز تفکر کی بہت سختی سے مخالفت کی ہے کیونکہ اسکی نگاہ میں خواہشات کو کچل دینا یا دنیا کی لذتوں سے کنارہ کشی اختیارکرلینا انسانی مشکلات کا حل نہیں ہے ۔بلکہ خداوند عالم نے اسکی خلقت کے وقت اسکی جو فطرت بنادی ہے وہ اسی کے مطابق آگے قدم بڑھاتا ہے جس کی مزید وضاحت کے لئے قرآن مجید کی مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں: (یابنی آدمَ خذوازینتکم عند کل مسجد،وکلواواشربواولاتُسرفوااِنّہ لا یُحب المسرفین[۱]) ''اے اولاد آدم ہر نماز کے وقت اور ہر مسجد کے پاس زینت ساتھ رکھو اور کھاؤپیو مگر اسراف نہ کرو کہ خدا اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ہے ''دوسری آیۂ کریمہ: (قل من حرّم زینۃَ اللہ التی أخرج لعبادہ والطیبات من الرزق قل ھی للذین آمنوافی الحیاۃالدنیاخالصۃَ یومَ

---

[۱] سورۂ اعراف آیت ۳۱۔

القیامۃکذلک نفصّل الآیات لقوم یعلمون*قل إنّما حرّم ربیَّ الفواحشَ ماظہرَ منھا وما بطن والإثمَ والبغیَ بغیرالحقِ وأن تشرکوا باللّٰہِ مالم یُنزّل بہ سلطاناً وأن تقولوا علیٰ اللّٰہِ مالا تعلمون[۱] ''پیغمبر آپ پوچھئے کہ کس نے اس زینت کو جس کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہےاور پاکیزہ رزق کو حرام کردیا ۔

اور بتائیے کہ یہ چیزیں روز قیامت صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں ہم اسی طرح صاحبان علم کے لئے مفصل آیات بیان کرتے ہیں۔کہہ دیجئے کہ ہمارے پروردگار نے صرف بدکاریوں کو حرام کیا ہے چاہے وہ ظاہری ہوں یا باطنی اورگناہ اور ناحق ظلم اور بلا دلیل کسی چیز کو خدا کا شریک بنانے اور بلاجانے بوجھے کسی بات کو خدا کی طرف منسوب کرنے کو حرام قرار دیا ہے'' مختصر یہ کہ یہ آیۂ کریمہ :(یابنی آدم خذوا زینتکم عندکل مسجد وکلوا واشربوا ولا تسرفوا)ہر انسان کو یہ دعوت دے رہی ہے کہ وہ دنیاوی لذتوں سے خوب فائدہ اٹھائے بس شرط یہ ہے کہ اسراف نہ کرے۔ اسکے بعد دوسری آیت میں ان لوگوں کی مذمت ہے جنھوں نے خداوند عالم کی حلا ل کردہ پا ک و پاکیزہ چیزوں کو حرام (ممنوع)کردیا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: (قل من حرّم زینۃ اللّٰہ التی أخرج لعبادہ والطیباتِ من الرزق)آیت میں اس بات کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے کہ دنیا اور اسکی تمام نعمتیں اور سہولتیں دراصل مومنین کے لئے ہیں لیکن غیر مومنین کو بھی ان سے استفادہ کی اجازت دیدی گئی ہے لیکن آخرت کی تمام نعمتیں صرف اور صرف مومنین کے لئے ہیں ۔جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: (قل ہی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصۃیوم القیامۃ) آیت نے یہ وضاحت بھی کردی ہے کہ خداوند عالم نے صرف اس دنیا کی پوشیدہ اور آشکار تمام برائیوں اور گناہوں سے منع کیا ہے اور اسکے علاوہ ہر چیز جائزقراردی ہے ۔لہٰذا اسلام ،دنیا سے قطع تعلق کرنے والے نظریات کو ٹھکراکر خداکی حلال اور پاکیزہ نعمتوں سے لطف اندور ہونے کا حکم دیتا ہے اور جن لوگوں نے دنیا سے اپنا ناطہ توڑکر خدا کی حلال کردہ اور پاکیزہ روزی کو حرام کررکھا ہے ان کے اس عمل کی سخت مذمت کرتا ہے۔ اللہ کی انہیں پاک وپاکیزہ نعمتوں میں سے ایک نعمت امتحان و آزمائش بھی

[۱] سورۂ اعراف آیت ۳۲۔۳۳۔

ہے ۔جس کے ذریعہ وہ اپنے بندوں کو آزماتا رہتا ہے ۔اسکے باوجود خداوند عالم کی طرف سے یہ اجازت ہرگز نہیں ہے کہ ہم ان چیزوں سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلیں اور یا ان سے بالکل دور ہوجائیں بلکہ حکم الٰہی تو یہ ہے کہ صرف برائیوں سے محفوظ رہیں اور حدودالٰہی سے آگے قدم نہ بڑھائیں۔

چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک بار ایک آدمی یہ کہہ رہا تھا :(أللھم انّی أعوذبک من الفتنۃ) ''بارالٰہا میں فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں''اس جگہ حضرت علیؑ بھی موجود تھے جب آپ نے اس کی زبان سے یہ کلمات سنے تو فرمایامجھے محسوس ہورہا ہے کہ تم اپنی اولاداور مال سے بھی خدا کی پناہ مانگ رہے ہو کیونکہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: (إنما أموالکم وأولادکم فتنۃ) ''بیشک تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں''لہٰذا یہ نہ کہو کہ میں فتنوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں بلکہ اس طرح کہا کرو ۔ (أللھم انّی أعوذبک من مضلّات الفتن[1]) ''بارالٰہامیں گمراہ کن فتنوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں''مولائے کائناتؑ کا یہ ارشاد گرامی ہے: (لایقولن أحدکم:اللھم انّی أعوذبک من الفتنۃ،لأنہ لیس أحد الاّ و ھو مشتمل علیٰ فتنۃ،ولکن من استعاذ فلیستعذ من مضلات الفتن،فان اللّٰہ سبحانہ یقول:(واعلموا أنّما أموالکم وأولادکم فتنۃ[2]) ''تم یہ ہرگز نہ کہو !بارالٰہا میں فتنہ سے تیری پناہ چاہتا ہوں کیونکہ تمہارے درمیان کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جسکا دار ومدار فتنہ پرنہ ہو لہٰذا جس کو خدا سے پناہ چاہئے وہ گمراہ کن فتنوں سے اللہ کی پناہ طلب کرے ''کیونکہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے'':یاد رکھوبیشک تمہارے اموال اور اولاد فتنہ ہیں''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خواہشات کو قابو میں رکھنے اور کنٹرول کرنے کے بارے میں اسلام نے جو حکم دیا ہے اس کا نتیجہ کیا ہے ؟اس کا جواب یہ ہے کہ اسلام نے اس کے ذریعہ خواہشات کو کنٹرول کرنے کے لئے ایک جدید نظریہ اور نظام تربیت پیش کیا ہے اور اس نظریہ کو عصمتوں کا نظام کہا جاتا ہے ۔ کیونکہ عصمتوں (بچانے والی خصلتوں)کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بجلی یا آگ کا کام کرتے وقت ہم دستانے یا واٹرپروف کپڑے پہن لیتے ہیں اور کسی

[1] بحار الانوار ج۹۳ص۲۳۵۔
[2] سورۂ انفال آیت ۲۸۔

خطرے کے بغیر بڑی آسانی سے اسکا ہر کام کر لیتے ہیں اسی طرح اگر انسان چاہے تو عصمتوں کے سہارے دنیا کی رنگینیوں اور فتنوں کے درمیان بڑی آسانی سے زندگی گذار سکتا ہے اور ان کی موجودگی میں اسے کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا ۔

لہٰذا جس طرح صرف آگ کی حرارت یا بجلی کے کرنٹ کے خطرات کی بناء پر ان کا استعمال ترک کردینا صحیح نہیں ہے اور دوسروں کو اس سے منع کرنا بھی غلط ہے کیونکہ دستانے اور واٹر پروف لباس وغیرہ کے سہارے ان سے ہر کام لیا جاسکتا ہے ۔اسی طرح لوگوں کو دنیا کی آزمائشوں سے دور رکھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ ان کے مال واولاد بھی ایک قسم کی آزمائش اور فتنہ ہیں لہٰذا ہر شخص کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ان گمراہ کن اور آزمائش طلب مقامات پر ان عصمتوں سے اچھی طرح استفادہ کرے جو اسے ان سے محفوظ رکھیں ۔کیونکہ اگر یہ عصمتیں کسی کی ذاتی یا سماجی زندگی میں تکامل کی منزل تک پہنچ جائیں تو پھر انسان اپنی خواہشات اور ہوی وہوس کا مختار کل بن جاتا ہے جس کی طرف روایت میں صریحاً اشارہ موجود ہے کہ دنیا میں دو طرح کے انسان پائے جاتے ہیں کچھ وہ ہیں جن کی خواہش اور ہوی وہوس ان پر غالب ہے اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی خواہشات پر ان کا مکمل کنٹرول ہے لہٰذا کیونکہ خواہشات پر کنٹرول کرنا ممکن ہے اسی لئے اسلام میں دنیا کے راحت و آرام سے منع نہیں کیا گیا ہے البتہ اتنا ضروری ہے کہ جسے دنیا سے دل چسپی ہے وہ خواہشات اور ہوی و ہوس پر مکمل کنٹرول کرلے اسکے بعد چاہے جس نعمت دنیا کو استعمال کرے ہدایت اور ہوائے نفس کے درمیان یہی معیار اور حد فاصل ہے ۔ امام جعفر صادقؑ:(من ملک نفسہ اذا غضب،واذا رھب،واذا اشتھیٰ،حرم اللہ جسدہ علیٰ النار[1]) ''جو شخص غصہ،خوف اور خواہشات ابھرنے کی حالت میں اپنے نفس کوقابو میں رکھے گا خداوند عالم اسکے جسم کو جہنم پر حرام کردیگا''(من ملک نفسہ اذا رغب،واذا رھب،واذا اشتھیٰ،واذا غضب،واذا رضی حرم اللہ جسدہ علیٰ النار[2]) '' جو شخص رغبت،خوف اور خواہشات ابھرنے اور غصہ یا خوشی کی حالت میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے خداوند عالم اسکے جسم کو جہنم پر حرام کردیگا''

[1] بحار الانوار ج۷۸ص۲۴۳۔
[2] بحار الانوار ج۷۱ص۳۵۸

عصمتوں کی قسمیں

ہر انسان کے اندر تین طرح کی عصمتیں پائی جاتی ہیں:۱۔کچھ عصمتیں ایسی ہیں جن کو خداوند عالم نے انسانی فطرت کی تکوینی خلقت اور تربیت کی گہرائیوں میں ودیعت فرمایا ہے جیسے حیا، عفت اور رحم دلی وغیرہ ۔یہی وجہ ہے کہ انسان اور حیوان دونوں کے اندر یکساں طور پر جنسی خواہشات موجود ہیں البتہ ان کے درمیان اتنا فرق ضرور ہے کہ حیوانوں میں یہ جذبہ بالکل ہی واضح اور ظاہر ہے جبکہ انسان کے اس جذبہ کے اوپر حیاء وعفت کے پردے پڑے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ حیوانوں کو اسکی تسکین میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی لیکن انسان کو اسکی تسکین سے بہت ساری جگہوں پرپرہیز کرنا پڑتاہے ۔ظاہر ہے کہ یہ انسان کی جنسی کمزوری کی بناء پر نہیں ہے ۔ بلکہ حیاء وشرم وعفت جیسی عصمتیں اسکے لئے مانع ہوجاتی ہیں کیونکہ یہ جنسی خواہش کو متعادل،لطیف اور کمزوربنادیتی ہیں اور اس پر روک لگاکر اسے مختلف طریقوں سے ابھرنے نہیں دیتیں۔

اسی طرح جذبۂ رحمت(رحم دلی)سے کافی حد تک انسان کا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اگرچہ انسان اور حیوان دونوں کے اندر ہی غصہ کا مادہ پایا جاتا ہے مگر حیوان کے اندر اسکے آگے کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی لیکن انسان کے یہاں اسکے اوپر رحمت (رحم دلی)کا سائبان ہے جس سے وہ بآسانی معتدل ہوجاتا ہے۔

۲۔کچھ عصمتیں وہ ہیں جن کو انسان اپنی ذاتی صلاحیت اور محنت سے حاصل کرتا ہے اور ہر انسان کی زندگی میں اسکی تربیت ان عصمتوں کے حصول میں اہم کردار ادا کرتی ہیں ۔جیسے ذکر الٰہی ،نماز ،روزہ ،تقویٰ وغیرہ ۔کیونکہ نماز برائی سے روکتی ہے ،ذکر الٰہی سے شیطان دور ہوجاتا ہے روزہ جہنم کی سپر ہے۔اور تقویٰ ایسا لباس ہے جو انسان کو گناہوں اور برائیوں کے مہلک ڈنک سے محفوظ رکھتا ہے۔اسی لئے قرآن مجید میں ارشاد ہے:(ولباس التقوی ذٰلک خیر)[۱] ''لیکن تقویٰ کا لباس سب سے بہتر ہے''

۳۔عصمتوں کی تیسری قسم وہ ہے جسے خداوند عالم نے انسان کی معاشرتی زندگی میں ودیعت کیا ہے جیسے دیندار سماج اور معاشرہ

---

[۱] سورۂ اعراف آیت ۲۶۔

یا شادی بیاہ وغیرہ ۔کیونکہ دیندار سماج اور معاشرہ بھی انسان کو برائیوں سے محفوظ رکھتا ہے۔اور شادی (شوہر اور زوجہ)دونوں کو بے شمار برائیوں سے بچالیتی ہے۔فی الحال ہم آپ کے سامنے نفس کے اندر اللہ کی ودیعت کردہ ان عصمتوں کے دو نمونوں خوف وحیا)کی وضاحت پیش کر رہے ہیں۔

خوف الٰہی

خداوند عالم نے انسان کے اندر جو عصمتیں ودیعت فرمائی ہیں ان کے درمیان خوف الٰہی سب سے اہم اور بڑی عصمت ہے جس کو حدیث میں عقل کا ایک لشکر قرار دیا گیا ہے اور یہ خواہشات کو کنٹرول کرنے کا سب سے بہترین ذریعہ ہے ۔جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:(وأ ما من خاف مقام ربہ ونھیٰ النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی المأویٰ [1])'اور جس نے رب کی بارگاہ میں حاضری کا خوف پیدا کیا ہے اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا جنت اسکا ٹھکانا اور مرکز ہے''اس آیۂ کریمہ سے بالکل صاف روشن ہے کہ خوف الٰہی اور نفس کو خواہشات سے روکنے کے درمیان ایک قریبی رابطہ پایا جاتا ہے۔اسی آیت کے بارے میں امام صادقؑ سے روایت ہے کہ:(من علم أن اللہ یراہ ویسمع مایقول،ویعلم مایعملہ من خیر أو شر،فیحجزہ ذلک عن القبیح،فذلک الذی خاف مقام ربہ،ونھیٰ النفس عن الھویٰ [2])''یعنی جسے یہ علم ہوجائے کہ خداوند عالم اسے دیکھ رہا ہے اور اسکی ہر بات سنتا ہے اور اسکے ہر اچھے یا برے عمل پر اسکی نظر ہے تو یہی خیال اسکو برائی سے روک دیگا اور اسی انسان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے رب سے خوفزدہ ہوگیا اور اس نے اپنے نفس کو اپنی ہوس(خواہشات)سے باز رکھا ''امیر المومنینؑ:(الخوف سجن النفس من الذنوب،ورادعھا عن المعاصی[3])''خوف الٰہی انسان کے نفس کو گناہوں اور برائیوں سے بچانے والا حصار ہے''رسول اکرم ﷺ:(سبعۃ یظلھم اللہ یوم لاظل الاظلہ،الامام العادل،وشاب نشأ بعبادۃاللہ عزوجل،ورجل قلبہ معلّق فی المساجد ،ورجلان تحابا فی اللہ عزوجل اجتمعا علیہ وتفرقاعلیہ،ورجل تصدّق بصدقۃ فأخفاھا حتی لاتعلم شمالہ ماتنفق یمینہ،ورجل ذکر اللہ خالیاً ففاضت عیناہ،ورجل دعتہ امرأۃ ذات منصب

[1] سورۂ نازعات آیت۴۱،۴۰۔
[2] اصول کافی ج۲ص۷۱۔
[3] میزان الحکمت ج۳ص۱۸۳۔

وجمال فقال انّی أخاف اللہ عزّوجل[1]) ''سات افراد کے اوپر اس دن رحمت الٰہی سایہ فگن ہوگی جس دن اسکے علاوہ اور کوئی سایہ موجود نہ رہے گا:١۔امام عادل۔

٢۔وہ جوان جسکی نشو ونما عبادت الٰہی میں ہوئی ہو۔

٣۔جسکا دل مسجدوں سے وابستہ ہو۔

٤۔خداوند عالم کے لئے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے جو اسی کے نام پر جمع ہوں اور اسکی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوجائیں (یعنی ان کی ہر محبت اور دشمنی خدا کے لئے ہو) ۔٥۔جو شخص اس طرح چھپا کر صدقہ دے کہ اگر ایک ہاتھ سے دے تو دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو۔٦۔جو گوشۂ تنہائی میں ذکر الٰہی کرے اور اسکی آنکھ سے آنسو نکل آئیں۔٧۔وہ مرد جسے کوئی حسین وجمیل اور صاحب منصب عورت اپنی طرف دعوت دے اور وہ اس سے یہ کہدے کہ مجھے خدا سے ڈر لگتا ہے''۔گویا خوف الٰہی ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو اسکی سب سے خطرناک خواہش اور ہوس یعنی جنسی جذبہ سے بھی روک دیتی ہے اور انسان گناہوں اور برائیوں سے بچ جاتا ہے حضرت علی: (العجب ممن یخاف العقاب فلم یکف،ورجیٰ الثوابفلم یتب ویعمل[2]) ''اس شخص پر حیرت ہے جسے سزا کا خوف ہومگر پھر بھی برائی سے نہ رکے اور ثواب کی امید رکھتا ہو اوراسکے باوجودتوبہ کرکے نیک عمل انجام نہ دے''امام محمد باقر: (لاخوف کخوف حاجز ولارجاء کرجاء معین[3]) ''برائیوں سے روکنے والے خوف سے بہتر کوئی خوف نہیں اور نیکیوں میں معاون ثابت ہونے والی امید سے بہتر کوئی امید نہیں ہے'' مولائے کائنات: (نعم الحاجزمن المعاصی الخوف[4]) ''برائیوں سے روکنے والی سب سے بہترین چیز کانام خوف ہے''

---

[1] صحیح بخاری بحث وجوب نماز جماعت باب ٨،بحث وجوب زکات باب ١٨کتاب رقاق باب ٢٣ (بقیہ آئندہ صفحہ پر)
[2] بحارالانوارج٧٧ص٢٣٧۔
[3] بحارالانوار ج ٧٨ص١٦۴۔
[4] میزان الحکمت ج٣ص١٨٣۔

خوف ایک پناہ گاہ

یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جو خوف اور ڈر،اضطراب سے پیدا ہوتا ہے اسی خوف سے اضطراب پیدا ہوجاتا ہے اوراگرچہ یہ امن وامان کے مقابل میں بولا جاتا ہے مگراس کو اسلام نے انسان کے لئے امان اور ڈھال بنادیا ہے ۔کیونکہ خوف ،انسان کو گناہوں اور برائیوں سے نہیں روکتا بلکہ در حقیقت یہ اسے ہلاکت اور بربادی سے بچانے والی ڈھال کا نام ہے۔یہی وجہ ہے کہ جس خوف کوانسان پہلی نظر میں خطرناک محسوس کرتا ہے وہی خوف انسان کی زندگی کو امن وامان عطا کرنے والی ایک نعمت ہے ۔اسی بارے میں حضرت علی،کا ارشاد ہے: ا۔ (الخوف امان[1]) ''خوف ایک امان ہے''

۲۔ (ثمرۃ الخوف الامان[2]) ''خوف کا پھل امان ہے''

۳۔ (خف ربک وارج رحمتہ،یؤ منک ماتخاف،وینلک مارجوت[3]) ''خدا سے ڈرتے رہو اور اسکی رحمت کی امید رکھو تو جس سے بھی تم خوفزدہ ہوگے وہ تمہیں اس سے بچائے رکھے گا اور جس کی امید ہے وہ تمہیں حاصل ہوجائے گا'' (لاینبغی للعاقل ان یقیم علی الخوف اذا وجد الی الأمن سبیلا[4]) ''کسی صاحب عقل وخرد کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ امن وامان کا راستہ مل جانے کے بعد خوف کی منزل میں پڑا رہے''،روایات میں جس خوف کا تذکرہ ہے اس سے مرادعذاب الٰہی سے امان ہے،اور امان سے مراد ،عذاب خدا کا خوف ہے اور یہ اسلامی تہذیب و تمدن کے ایک متقابل اور حسین معنی میں ۔جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کا خوف آخرت کے لئے امن وامان ہے اور دنیا کا امن وامان اور بے فکری آخرت میں خوف بن جائے گا۔امیر المومنین،نے یہ مفہوم پیغمبر اسلام کے کبھی خشک نہ رہنے والے چشمۂ فیاض سے اخذ فرمایا ہے،جیسا کہ رسول اکرم ﷺ سے روایت ہے کہ خداوند عالم کا ارشاد گرامی ہے: (وعزتی وجلالی لاأجمع علی عبدی خوفین ولاأجمع لہ امنین،فاذاامننی فی الدنیااخفتہ یوم القیامۃ،واذاخافنی فی الدنیاآمنتہ

---

[1] میزان الحکمت ج۳ص۱۸۶۔
[2] گذشتہ حوالہ۔
[3] گذشتہ حوالہ۔
[4] گذشتہ حوالہ۔

یوم القیامۃ[1]) ''میری عزت وجلالت کی قسم میں اپنے کسی بندے کو دو خوف یا دو امان (ایک ساتھ)نہ دونگا پس اگر وہ دنیا میں مجھ سے امان میں رہا تو قیامت میں اسے خوف میں مبتلا کردونگا اور اگر وہ دنیا میں مجھ سے خوفزدہ رہا تو آخرت میں اسے امن وامان عطا کردونگا ''

چند واقعات

ہر انسان کو برائیوں اور گناہوں سے بچانے میں خوف الٰہی کیا کردار ادا کرتاہے؟اسکی مزید وضاحت کے لئے ہم چند واقعات پیش کر رہے ہیں جن میں سے بعض واقعات روایات میں بھی موجود ہیں۔ ا۔ابن جوزی کا بیان ہے کہ مجھ سے عثمان بن عا مرتیمی نے بیان کیا ہے کہ ان سے ابو عمر یحیی بن عاص تیمی نے بیان کیا تھا کہ : ''حی ''نامی ایک جگہ کا ایک آدمی حج کے لئے گھر سے نکلا ایک رات پانی کے ایک چشمہ پر اس نے ایک عورت کو دیکھا جسکے بال اسکے کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے وہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کی طرف سے اپنا منھ پھیر لیا تو اس نے کہا کہ تم نے میری طرف سے منھ کیوں پھرلیا ؟میں نے جواب دیا کہ مجھے خداوند عالم سے ڈرلگتا ہے ۔چنانچہ اس نے اپنا آنچل سر پر ڈال کر کہا :تم بہت جلدی خوف زدہ ہوگئے جبکہ تم سے زیادہ تو اسے ڈرنا چاہئیے جو تم سے گناہ کا خواہشمند ہے ۔پھر جب وہ وہاں سے واپس پلٹی تو میں اسکے پیچھے پیچھے ہولیا اور وہ عرب دیہاتیوں کے کسی خیمے میں چلی گئی چنانچہ جب صبح ہوئی تو میں اپنی قوم کے ایک بزرگ کے پاس گیا اور ان سے پورا ماجرا بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس جوان لڑکی کا حسن وجمال اور چال ڈھال ایسی تھی:تو وہیں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا وہ فوراًبول پڑا خدا کی قسم وہ میری بیٹی ہے۔میں نے کہا کیا آپ اس سے میری شادی کر سکتے ہیں؟اس نے جواب دیا اگر تم اسکے کفوہوئے توضرور کردونگا ۔میں نے کہا : خداکا ایک مرد ہوں اس نے کہا نجیب کفوہے چنانچہ وہاں سے چلنے سے پہلے ہی میں نے اس سے شادی کرلی اور ان سے یہ کہدیا کہ جب میں حج سے واپس

---

[1] کنز العمال ،متقی ہندی حدیث ۵۸۷۸۔

پلٹوں گا تو اسے میرے ساتھ رخصت کردینا چنانچہ جب میں حج سے واپس پلٹا تو اسے بھی اپنے ساتھ کوفہ لے آیا اور اب وہ میرے ساتھ رہتی ہے اور اس سے میرے چند بیٹے اور بیٹیاں ہیں[۱]۔

۲۔مکہ میں ایک حسین و جمیل عورت اپنے شوہر کے ساتھ رہتی تھی اس نے ایک دن آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اپنے حسن وجمال کی تعریف کرتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا ،ذرا بتائے آپ کی نظر میں کیا کوئی ایسا ہے جو اس حسن وجمال کو دیکھ کر نہ بھکنے پائے؟ شوہر نے کہا ہاں کیوں نہیں، پوچھا کون ہے؟جواب دیا عبید بن عمیر، عورت نے کہا: اگر تم مجھے اجازت دوتو میں آج اسے بہکاکر دکھاؤوں گی؟ کہا :جاؤ تمہیں اجازت ہے۔چنانچہ وہ گھر سے نکلی اور مسئلہ پوچھنے کے بہانے اسکے پاس پہونچی اس نے اسے مسجد الحرام کے اندر تنہائی میں ملنے کا موقع دے دیا ،تو اس نے اسکے سامنے چاند کی طرح چمکتے ہوئے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دی، تو اس نے کہا: اے کنیز خدا ،عورت بولی: میں آپ کے اوپر فریفتہ ہوگئی ہوں لہذا اس معاملہ میں آپ کی رائے کیا ہے؟اس نے کہا میں تم سے چند سوال کرنا چاہتا ہوں اگر تم نے میری تصدیق کردی تو میں تمھیں اپنی رائے بتادوں گا، وہ بولی جو کچھ تم پوچھوگے میں سچ سچ جواب دوں گی۔ کہا :ذرا یہ بتاؤ اگر ملک الموت تمہاری روح قبض کرنے کے لئے آئیں تو اس وقت تمہیں اچھا لگے گا کہ میں تمہاری یہ تمنا پوری کردوں؟وہ بولی بخدا ہرگز نہیں۔کہا :تم نے سچ کہا ہے۔پوچھا اگر تمہیں تمہاری قبر میں اتار دیا جائے اور سوال کرنے کے لئے بٹھایا جائے تو اس وقت تمہیں اچھا معلوم ہوگا کہ میں تمہاری یہ تمنا پوری کردوں؟وہ بولی بخدا نہیں،کہا تم نے سچ جواب دیا ۔پھر پوچھا یہ بتاؤکہ جب روز قیامت تمام لوگوں کے ہاتھ میں نامۂ اعمال دئے جا رہے ہوں گے اور تم کو یہ معلوم نہ رہے کہ تمہارا نامہ عمل دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا یا بائیں ہاتھ میں (یعنی نامۂ عمل خراب ہے یا اچھا)اس وقت کیا تم یہ پسند کروگی کہ میں تمہاری یہ حاجت پوری کردوں؟بولی بخدا نہیں۔پھر سوال کیا بتاؤ جب سب کو میزان کے اوپر کھڑا کیا جارہا ہوگا اور تمھیں یہ معلوم نہ ہوکہ تمہارا نامۂ عمل وزنی ہے یا ہلکا تو کیا تمہیں اس وقت خوشی ہوگی کہ میں تمہاری یہ تمنا پوری کردوں؟بولی بخدا

[۱] ذم الہوی لا بن جوزی ص۲۶۴۔۲۶۵۔

نہیں۔کہا تم نے صحیح جواب دیا۔پھر پوچھا اگر تمھیں سوال اور جواب کے لئے خدا کے سامنے کھڑا کیا جائے اور میں تمہاری یہ تمنا پوری کردوں توکیا اس وقت تم کو اچھا لگے گا؟بولی بخدا نہیں۔کہا تم نے سچ کہا ہے،تواس نے کہا:اے کنیز خدا ،ذرا خدا سے ڈرو اس نے تم کویہ نعمت دے کر تمہارے اوپر احسان کیا ہے یہ سن کر وہ اپنے گھر واپس آگئی شوہر نے پوچھا کہو کیا کرکے آئی ہو؟وہ بولی تم فضول ہو اور ہم سب کے سب فضول ہیں اور اسکے بعد وہ مستقل نماز ، روزہ اور عبادت میں مشغول ہوگئی وہ کہتا ہے کہ اسکا شوہر یہ کہتا رہتا تھا کہ بتاؤ عبید بن عمیر سے میری کیا دشمنی تھی ؟ جس نے میری بیوی کو برباد کردیا وہ کل تک تو ایک بیوی کی طرح تھی اوراب اس نے اسے راہبہ بناڈالا[1]۔

۳۔ابو سعد بن ابی امامہ نے روایت کی ہے ایک مرد ایک عورت سے محبت کرتا تھا ،اور وہ بھی اسے چاہنے لگی ایک دن یہ دونوں کسی جگہ ایک دوسرے سے ملے تو عورت نے اسے اپنی طرف دعوت دی ، اس نے جواب دیا :میری موت میرے قبضہ میں نہیں ہے اور تمہاری موت بھی تمہارے بس سے باہر ہے ایسا نہ ہو کہ ابھی موت آجائے اور ہم دونوں گناہکار اور مجرم کی صورت میں خداوند عالم کے دربار میں پہونچ جائیں، بولی: تم سچ کہہ رہے ہو، چنانچہ اسی وقت دونوں نے توبہ کرلی اور اسکے بعد دونوں راہ راست پرآگئے[2]۔

۴۔خارجہ بن زید کا بیان ہے کہ بنی سلیمہ کے ایک شخص نے مجھ سے اپنایہ ماجرا بیان کیا ہے کہ میں ایک عورت کا عاشق ہوگیا تھااور جب بھی وہ مسجد سے نکل کر جاتی تھی میں بھی اسکے پیچھے چل دیتا تھا اور اسے بھی میری اس حرکت کا علم ہوگیا ۔چنانچہ اس نے ایک رات مجھ سے کہا تمھیں مجھ سے کچھ کام ہے؟ میں نے کہا ہاں۔بولی: کیا کام ہے؟میں نے جواب دیا تمہاری محبت ۔اس نے

[1] ذم الہوی لابن جوزی ص۲۶۵۔۲۶۶۔
[2] ذم الہوی لا بن جوزی ص۲۶۸۔

کہا کہ اسے گھاٹے والے دن (روز قیامت) پر چھوڑدو، اسکابیان ہے کہ :خداکی قسم اس نےمجھے رلادیا جسکے بعد میں نے پھر یہ حرکت نہ کی[1]۔

۵۔بنی عبد القیس کے ایک بزرگ کی روایت ہے ،وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے قبیلہ والوں سے سنا ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کو اپنی طرف دعوت دی تو وہ بولی تم نے حدیث سنی ہے اور قرآن پڑھا ہے تم پڑھےلکھے ہو،پھر مرد نے عورت سے کہا کہ :محل کے دروازے بند کردو، تو اس نے دروازے بند کردئے مگر جب وہ مرد اسکے نزدیک ہوا تو وہ عورت بولی کہ ابھی ایک دروازہ کھلارہ گیا ہے جو مجھ سے بند نہیں ہوسکا ۔اس نے کہا کون سا دروازہ ؟جواب دیا :وہ دروازہ جو تمہارے اور تمہارے روردگار کے درمیان کھلا ہے یہ سن کر اس نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا[2]۔

٦۔ابن جوزی کا بیان ہے کہ ہمیں یہ اطلاع ملی کے بصرہ کی زاہدہ وعابدہ خاتون ایک مہلّبی مرد[3] کے چنگل میں پھنس گئی ہے،کیونکہ وہ بہت خوبصورت تھی اور جو کوئی اسے شادی کا پیغام دیتا تھاتو وہ منع کردیتی تھی چنانچہ مہلّبی کو یہ خبر ملی کے وہی عورت حج کرنے جاری ہے ،تو اس نے تین سو اونٹ خریدے اور یہ اعلان کردیا کہ جوحج کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ مجھ سے اونٹ کرائے پرلے سکتا ہے۔چنانچہ اس عورت نے بھی اس سے کرایہ پرایک اونٹ لے لیا ۔ایک دن راستہ میں وہ رات کے وقت اسکے پاس آیا اور کہا یاتم مجھ سے شادی کرو، ورنہ !عورت نے جواب دیا :تم پروائے ہو ذرا خدا کا خوف کرو، تو اس نے کہا :ذرا کان کھول کر سنو، خدا کی قسم میں کوئی اونٹوں کا ساربان (اونٹ والا) نہیں ہوں بلکہ میں تو اس کام کے لئے صرف اور صرف تمہاری وجہ سے نکلا ہوں، لہٰذا جب عورت نے اپنی آبرو خطرے میں دیکھی تو کہا کہ اچھا جاؤ یہ دیکھو کہ کوئی جاگ تو نہیں رہا ہے؟اس نے کہا کوئی نہیں

[1] ذم الہوی لا بن جوزی ص ۲ ۲۷۔
[2] ذم الہوی لا بن جوزی ص۲۷۴۔
[3] مہلّب :ایک ثروت مند قبیلہ کا نام ،ذم الہوٰی لا بن جوزی ص۲۷۷۔

جاگ رہا ہے وہ پھر بولی ایک بار اور دیکھ آؤ چنانچہ وہ گیا اور جب واپس پلٹ کر آیا تو کہا: ہاں سب کے سب سو چکے ہیں تو عورت نے کہا: تجھ پر وائے ہو،کیا رب العالمین کو بھی نیند آگئی ہے؟

حیاء

عقل کے لشکر کی ایک اور صفت ''حیاء''بھی ہے یہ بھی انسان کو تباہی اور بربادی سے بچانے میں اہم کردار کرتی ہے۔چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو خداوند عالم یا اسکے بندوں کی حیاء نہ ہوتو وہ گناہوں میں مبتلا ہوجاتاہے اور اسے اسکی عقل بھی نہیں روک پاتی ہے ۔ایسے حالات میں صرف حیاء ہی اسکو گناہ سے بچاتی ہے۔حیاء (چاہے جس مقدار میں ہو اس) کے اندر عصمت کے مختلف درجات پائے جاتے ہیں جیسے اعزاء و اقرباء سے شرم وحیاء میں جو عصمت پائی جاتی ہے وہی غیروں سے حیاء کے وقت ایک درجہ اور بڑھ جاتی ہے اسی طرح انسان جس کا احترام کرتا ہے اور اسکی تعظیم کا قائل ہے اسکے سامنے حیاء کی وجہ سے اسکے اندر اس سے اعلیٰ درجہ کی عصمت پیدا ہوجاتی ہے۔آخر کار پروردگار عالم سے حیاء کرنے کی وجہ سے انسان عصمت کے سب سے بلند درجہ کا مالک ہوجاتا ہے ۔لہٰذا اگر انسان اپنے نفس کے اندر خداوند عالم کی حیاء پیدا کرلے اور اس کو اچھی طرح اپنے وجود میں راسخ کرلے اور خدااور اسکے فرشتوں کو ہمیشہ اپنے اوپر حاضر وناظر سمجھے تواس احساس کے اندر اتنی اعلیٰ درجہ کی عصمت پائی جاتی ہے جو اس کو ہر طرح کی نافرمانی، گناہ اور لغزشوں سے بچاسکتی ہے۔اللہ تعالیٰ سے حیاء یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی انسان کے دل میں خداوند عالم کا خیال موجود ہواور وہ اسے حاضر وناظر بھی سمجھ رہا ہو اور اسے یہ بھی یاد ہو کہ خداوند عالم کے علاوہ اسکے معین کردہ فرشتے بھی اس سے اتنا نزدیک ہیں کہ خداوند عالم نے ان سے اسکا جو عمل پوشیدہ رکھتا ہے اسکے علاوہ اسکا کوئی عمل ان سے پوشیدہ نہیں ہے اورپھر بھی وہ گناہ کا مرتکب ہوجائے چنانچہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب ابوذرؓ کو جو وصیت فرمائی تھی اس میں یہ بھی ہے کہ اے ابوذر خدا وند عالم سے شرم وحیاء کرو اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے

---

[۱] مہلّب :ایک ثروت مند قبیلہ کا نام ،ذم الھویٰ لا بن جوزی ص۲۷۷۔

میرا حال تو یہ ہے کہ جب میں بیت الخلاء کے لئے جاتا ہو ں تو اپنے دونوں فرشتوں سے شرم وحیاء کی بناپر اپنے چہرے پر کپڑاڈال لیتا ہوں۔حیاء کا وہ ارفع و اعلیٰ درجہ جو خداوند عالم نے اپنے رسول کو عنایت فرمایا ہے وہ دنیا میں بہت کم افراد کو نصیب ہوا ہے۔ مختصر یہ کہ جب انسان کے نفس کے اندر اور اسکے شعور و ادراک میں اچھی طرح حیائے الٰہی جلوہ فگن ہوجاتی ہے تو پھر اسے گناہوں، برائیوں نیزہوس کے مہلک خطرات کے سامنے سپر انداختہ نہیں ہونے دیتی ہے ۔جب اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے شرم وحیاء کی بناء پرانسان نہ جانے کتنے ایسے کام نہیں کرتا ہے جنہیں ان کی عدم موجودگی یا تنہائی میں انجام دے لیتا ہے تواگر اسکے اندرخداوند عالم سے حیاء کا مادہ پیدا ہوجائے تو پھر خداوند عالم کی ناپسندیدہ چیزوں سے وہ بدرجۂ اولیٰ پرہیز کریگا اور اسکے لئے ملاء عام (علی الاعلان)اور گوشہ تنہائی میں کوئی فرق نہ رہ جائے گا۔

اس لئے کہ خداوند عالم ہر جگہ حاضر وناظر ہے ۔اور یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص ،بندوں سے کوئی بات پوشیدہ رکھ لے لیکن خداوند عالم سے اسکی کوئی بات ہرگز پوشیدہ نہیں رہ سکتی ہے۔رسول اکرم ﷺ:(یاأباذراستح من اللہ،فأنی والذی نفسی بیدہ لأظل حین أذھب الیٰ الغائط متقنّعاًبثوبی استحی من الملکین الذین معی[1]) ''اے ابوذر،خداوند عالم سے حیاء کرو،کیونکہ اس ذات کی قسم جسکے قبضہ میں میری جان ہے میں جب بھی بیت الخلاء کے لئے جاتاہوں تو اپنے ہمراہ دونوں فرشتوں سے شرم وحیاء کی وجہ سے اپنے چہرہ کو ڈھانپ لیتاہوں''رسول اکرم ﷺ:(استح من اللہ استحیاء ک من صالح جیرانک،فان فیھازیادۃالیقین[2]) ''خداوند عالم سے اس طرح شرم وحیاء کرو جس طرح تم اپنے نیک اور صالح پڑوسی سے شرماتے ہوکیونکہاس سے یقین میں اضافہ ہوتا ہے''آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے: (لیستح أحدکم من ملکیہ الذین معہ،کمایستحی من رجلین صالحین من جیرانہ،وھمامعہ باللیل والنھار[3]) ''اپنے فرشتوں سے تم اسی طرح شرم وحیا کیا کرو جس طرح تم اپنے دو صالح اور نیک پڑوسیوں سے شرماتے ہو کیونکہ یہ فرشتے رات دن تمہارے ساتھ رہتے ہیں'' خداوند عالم سے ہر حال میں شرم وحیا کے بارے میں امام کاظم ؑسے نقل ہوا ہے:(استحیوا من اللہ فی سرائرکم،کما تستحون من الناس

[1] بحارالانوار ج۷۷ص۸۳وکنز العمال ح۵۷۵۱۔
[2] بحارالانوار ج۷۸ص۲۰۰۔
[3] میزان الحکمت ج۲ص۵۶۸۔

فی علانیتکم[1]) ''تنہائی میں خداوند عالم سے اسی طرح شرم وحیا کیاکرو جس طرح لوگوں کے سامنے تمھیں حیا آتی ہے''، مختصر یہ کہ اگر کسی کے اندر خداوند عالم سے حیاکا عرفان پیدا ہوجائے تو وہ عصمت کے بلند ترین درجہ پر فائز ہوسکتا ہے اور اسکے لئے ملاء عام یاگوشۂ تنہائی میں کوئی فرق نہیں ہے اسکے لئے روایات میں مختلف تعبیرات ذکر ہوئی ہیں۔

حضرت علیؑ: (الحیاء یصدّ عن الفعل القبیح[2]) ''حیا برائیوں سے روک دیتی ہے''، آپ ہی نے یہ بھی فرمایا ہے: (علیٰ قدر الحیاء تکون العفۃ[3]) ''حیا کی مقدار کے برابر ہی عفت بھی ہوتی ہے''، رسول اکرم ﷺ: (استحیوا من اللّہ حق الحیاء، فقیل یارسول اللّہ: ومن یستحی من اللّہ حق الحیاء؟فقال: من استحییٰ من اللّہ حق الحیاء فلیکتب أجلہ بین عینیہ،ولیزھد فی الدنیاوزینتھا،ویحفظ الرأس وما حویٰ والبطن وما وعیٰ) ''خداوند عالم سے ایسی حیا کروجو حیا کرنے کا حق ہے سوال کیا گیا خداوند عالم سے حیا کرنے کا جوحق ہے اسکا کیا طریقہ ہوگا؟آپ نے فرمایا کہ جو خداوند عالم سے واقعاً حیا کرنا چاہتا ہے وہ اپنی موت کو اپنی دونوں آنکھوں کے سامنے مجسم کرلے (اپنی پیشانی پر لکھ لے)اور دنیا اور اس کی زینتوں سے اجتناب کرے اور اپنے سر اور جو کچھ اس میں ہے اور اپنے پیٹ اور جو اسکے اندر بھرا ہے ان سے محفوظ رہے[4]''امام موسیٰ کاظمؑ: (رحم اللّہ من استحییٰ من اللّہ حق الحیاء،فحفظ الرأس وما حویٰ،والبطن وماوعیٰ[5]) ''اللّہ تعالی اس بندے پر رحم کرے جسکو اس سے واقعا حیا آتی ہو اور اسی لئے وہ اپنے سر کے وسوسوں اور پیٹ کی شہوتوں سے اپنے کو محفوظ رکھے''،روایت میں سر اور معدہ کا تذکرہ اس لئے کیا گیا ہے کہ اکثر شہوتیں انہیں دونوں جگہوں سے جنم لیتی ہیں مثلاًاگر آنکھیں شہوت کا ایک دروزہ اور کان دوسرا دروازہ ہے تومعدہ (پیٹ) شہوت کی پیدائش کاپہلامرکز اور شرم گاہ دوسرا مرکزہے ۔لہٰذا جب انسان کے اندر شرم وحیاء پیدا ہوجاتی ہے تو پھر ذہن ودماغ کے برے خیالات (سر کے وسوسے)اور پیٹ کی شہوت کے سارے راستے خود بخود بند ہوجاتے ہیں اور انسان ان کے شر سے محفوظ ہوجاتا ہے ۔آپ ہی

[1] بحارالانوار ج۷۸ص۳۰۹۔
[2] میزان الحکمت ج۲ص۵۶۴۔
[3] گذشتہ حوالہ۔
[4] بحارالانوار ج۷۰ص۳۰۵۔
[5] بحارالانوار ج۷۰ص۳۰۵۔

سے مروی ہے: (من أفضل الورع أن لاتبدی فی خلواتک ما تستحی من اظہارہ فی علانیتک[1]) ''سب سے بڑا ورع اور پارسائی یہ ہے کہ جس کام کو تم کھلم کھلا کرنے سے شرماتے ہو اسے تنہائی میں بھی انجام نہ دو''

بارگاہ خدا میں قلت حیا کی شکایت

متعدد دعاؤں میں یہ ملتا ہے کہ انسان خداوند عالم کی بارگاہ میں اس سے حیا کی قلت کی شکایت کرتا ہے جو ایک بہت ہی لطیف اور عجیب بات ہے کہ انسان خداوند عالم کی بارگاہ میں یہ شکایت کرے کہ اسکے اندر خود ذات پروردگار سے شرم وحیاء کی قلت پائی جاتی ہے جس میں خدا قاضی ہے کیونکہ اسکا فیصلہ اسی کے اوپر چھوڑدیا گیا ہے شکایت کرنے والا خود انسان (انا،میں)ہے اور جس کے خلاف شکایت کی گئی ہے وہ نفس ہے اور شکایت (مقدمہ) کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ نفس اس خدا کے سامنے بے حیائی پر اتر آیا ہے جو خود اس مقدمہ میں قاضی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ گویا انسان خدا کی بارگاہ میں اپنے نفس کی یہ شکایت کررہا ہے کہ وہ خود خدا سے حیاء نہیں کرتا ہے بطور نمونہ دعائے ابوحمزہثمالی(رح) کے یہ جملات ملاحظہ فرمائیں:(أنا یارب الذی لم أستحیک فی الخلاء،ولم أُراقبک فی الملأ،أناصاحب الدواھی العظمیٰ،أناالذی علیٰ سیدہ اجتریٰ۔اناالذی سترت علیّ فااستحییت،وعلمت بالمعاصی فتعدیت،واسقطتنی من عینیک فا بالیت[2]) ''پروردگارا !میں وہی ہوں جس نے تنہائی میں تجھ سے حیا نہیں کی اور مجمع میں تیرا خیال نہیں کیا میرے مصائب عظیم ہیں میں نے اپنے مولا کی شان میں گستاخی کی ہے ۔میں وہی ہوں ۔ جس کی تونے پردہ پوشی کی تو میں نے حیا نہیں کی، گناہ کئے میں تو بڑھتا ہی چلا گیا اور تو نے نظروں سے گرا دیا تو کوئی پروا نہیں کی''

امام زین العابدین،کی مناجات شاکین (شکایت اور فریاد کرنے والوں کی مناجات) میں بھی خداوند عالم کی بارگاہ میں اپنے نفس اور گناہوں سے پرہیز نہ کرنے کی شکایت ان الفاظ میں کی گئی ہے:(الٰہی أشکوالیک نفساًبالسوء أمارۃ،والیٰ الخطیءۃ مبادرۃ، وبمعا صیک

---

[1] غررالحکم ج۲ص۲۵۳۔
[2] دعا ئے ابو حمزہ ثمالی۔

مولعۃ،ولسخطک متعرّضۃ[۱]) ''خدایا میں تجھ سے اس نفس کی شکایت کر رہا ہوں جو برائیوں کا حکم دیتا ہے اور خطاؤں کی طرف تیزی سے دوڑتا ہے اور تیری معصیتوں پر حریص ہے اور تیری ناراضگی کی منزل میں ہے''۔

[۱] مفاتیح الجنان: مناجات الشاکین ۔

دوسری فصل

جو شخص اپنی ہویٰ وہوس کو خداوند عالم کی مرضی پر ترجیح دیتا ہے۔

حدیث شریف کے پہلے فقرے کی وضاحت کے بعد اب ہم آپ کے سامنے اس حدیث کے دوسرے اور تیسرے جملے ''جو شخص خداوند عالم کی مرضی پر اپنی خواہش اور ہوس کو مقدم کرتا ہے'' اور اسکے برخلاف ''جو انسان مرضی خدا کو اپنی مرضی اوراپنی خوشی پر فوقیت اور ترجیح دیتا ہے'' کی وضاحت پیش کر رہے ہیں۔جو شخص اپنی ہوس کو خداوند عالم کی مرضی پر فوقیت دیتا ہے۔ اس (دوسرے)جملہ کی وضاحت متعلقہ حدیث قدسی میں کچھ اس طرح کی گئی ہے۔عن رسول اللّٰہ یقول اللّٰہ تعالیٰ: (وعزّتی وجلالی،وعظمتی،وکبریائی،ونوری،وعلوّی،وارتفاع مکانی لایؤثرعبد هواه علیٰ هوای إلاّ شتّت أمره،ولبّست علیه دنیاه،وشغلت قلبه بها،ولم أُوته منها إلاماقدرت له[1]) ''میری عزت وجلالت، عظمت وکبریائی،نور ورفعت اور میرے مقام ومنزلت کی بلندی کی قسم،کوئی بندہ بھی اپنی ہویٰ وہوس کو میری مرضی اور خواہش پر ترجیح نہیں دیگا مگر یہ کہ میں اسکے معاملات کودرہم برہم کردونگا اسکے لئے دنیا کو بنا سنوار دونگا اور اسکے دل کو اسی کا دلدادہ بنا دونگا اور اسکو صرف اسی مقدار میں عطا کرونگاجتنا پہلے سے اسکے مقدر میں لکھ دیا ہے''

حدیث قدسی کے اس فقرہ میں تین اہم نکات پائے جاتے ہیں:۱۔جو لوگ اپنی خواہش کو مرضی خدا پر ترجیح دینگے انہیں خداوند عالم تین قسم کی سزائیں دیگا:

الف۔ان کے معاملات مشتبہ اوردرہم برہم ہوجائیں گے۔

ب۔ دنیاان کی نگاہ میں آراستہ ہوجائے گی۔

[1] عدۃالداعی ص۷۹۔اصول کافی ج۲ص۲۳۵۔ان دونوں سے علامہ مجلسی (رح)نے بحارالانوار ج۷۰ص۷۸حدیث۱۴ اور ج۷۰ص۸۵نیزص۸۶پر اس حدیث کو نقل کیاہے۔اس سے پہلے بھی ہم نے کتاب کے مقدمہ میں اس حدیث کے بعض حوالے نقل کئے ہیں۔

ج۔ان کا دل، دنیا کا دیوانہ ہوکر رہ جائے گا۔

۲۔مذکورہ سزاؤں کے تذکرہ سے پہلے اس حدیث شریف میں متعدد طرح کی عظیم قسمیں کھائی گئی ہیں(جیسے میری عزت،جلالت، عظمت،کبریائی، نوراور میرے مقام و منزلت کی رفعت کی قسم) جن سے اُس بات کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے جسکا تذکرہ ان کے بعد کیا گیا ہے۔

۳۔حدیث شریف میں جس طرز کلام کا انتخاب کیا گیا ہے اس سے دائرہ کلام بالکل محصور اور محدود ہوجاتا ہے کیونکہ پہلے جملہ یعنی (لایؤثرعبد هواہ۔الاشتت أمرہ) میں نفی اور دوسرے جملہ (الاشتت أمرہ) میں اثبات کا لہجہ موجود ہے لہٰذا اس حصر کے معنی یہ ہیں کہ جب کبھی بھی انسان اپنی ہوس کو خداوند عالم کی مرضی پر ترجیح دیگا تو وہ کسی بھی طرح خداوند عالم کی ان سزاؤں سے نہیں بچ سکتا ہے اب آپ حدیث قدسی میں مذکور، ان تینوں سزاؤں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:ا۔اسکے امور کو درہم برہم کردوں گا جو لوگ خوداپنی مرضی کے مطابق چلتے ہیں اور خداوند عالم کی مرضی کا کوئی خیال نہیں کرتے ہیں ان کو خداوند عالم سب سے پہلی سزا یہ دیتا ہے کہ ان کے معاملات درہم برہم کردیتا ہے اور ان کے ہر کام میں بے ثباتی ،تزلزل اور بے ترتیبی آجاتی ہے کیونکہ وہ ان سے طریقۂ کار، راہ وروش، مقصد اور وسیلہ کی یکسانیت اوریکسوئی کو سلب کرلیتا ہے۔

جسکے نتیجہ میں وہ ہوا میں کٹی پتنگ یا کسی تنکے کی طرح ہر طرف اڑتے رہتے ہیں اور ہوا کا ہر جھونکا انکو ایک نئی سمت کی طرف ڈھکیل دیتا ہے۔کیونکہ لوگ عام طور سے دو طرح کے ہوتے ہیں:ا۔منظم اور ٹھوس شخصیت کے مالک۔

۲۔بے نظم اوربے ترتیب

ٹھوس شخصیت

ٹھوس اور مستحکم شخصیت ایسی شخصیتوں کو کہا جاتا ہے جو کسی ایک حاکم کے ماتحت رہتی ہیں جب کہ متزلزل، مضطرب اور بد حواس قسم کے افراد متعدد اسباب و عوامل کے آلۂ کار بنے رہتے ہیں۔ چنانچہ پہلے طریقۂ کار کو توحیدی طریقہ اور دوسرے طریقہ کو شرک کا نتیجہ کہا جاتاہے کیونکہ جو شخص توحید الٰہی کا نمونہ ہوتا ہے۔وہ ہر اعتبار سے خداوند عالم کے ارادہ، حکمت اور اسکے احکام کا تابع ہوتا ہے اور ہر لحاظ سے اسی کی مشیت اور مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہتا ہے۔اسی طرح ہر خوشی اور مصیبت میں وہ حکم الٰہی کا پابند رہتا ہے اور خداوند عالم کی خوشنودی ہی اسکا اصل مقصد ہے اور اسکے علاوہ اسے کسی دوسری چیز کی خواہش نہیں ہوتی اور وہ ہرطرح سے اس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کئے رہتا ہے اوراسکی نظر صرف اپنے اس پاک مقصد پر مرکوز رہتی ہے اور وہ اسکی طرف رواں دواں رہتا ہے ۔اور کیونکہ احکام الٰہی کا نظام صرف ایک ہی مرکز سے متصل ہے اور اس میں مکمل طور سے یکسانیت پائی جاتی ہے لہٰذا اس پر عمل کرنے کے بعد ہر انسان کی شخصیت مقدس ہو جاتی ہے اور اس میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے یعنی کبھی مختلف قسم کی سیاسی یا سماجی ردو بدل اور اتھل پتھل کی وجہ سے جنگ اور لڑائی کی نوبت آجاتی ہے

جسکی بناپرانہیں اسلحہ اٹھانا پڑتاہے ۔اور کبھی صورتحال یہ ہوجاتی ہے کہ اسلحہ کو زمین پر رکھنا پڑتا ہے مگر حالات کے اس پورے اتار چڑھاؤ کے باوجود انسان کی شخصیت کے اندر کسی طرح کا اختلاف یا ردو بدل پیدا نہیں ہوتی اور اسکی شخصیت کی یکسانیت اور توحید کے سرچشمہ سے پیدا ہونے والی ترتیب ویگانگت پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور اسی کو (توحید عملی) کہا جاتا ہے جو توحید نظری کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے کیونکہ یہ صورت حال دراصل انسان کی زندگی میں توحید نظری کے پر تو کا ہی نتیجہ ہے ۔توحید عملی کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد انسان اپنے نفس کے اندر اور باہر موجودتمام حاکموں جیسے ہوی وہوس اور طاغوت وغیرہ کی ماتحتی سے خارج ہو جاتا ہے اور احکام الٰہی کے دائرہ حکومت میں داخل ہوجاتا ہے اس طرح تنہا حکم الٰہی ہی اسکے ہر عمل کا حاکم و مختار ہوتا ہے اور اسکی رفتار وگفتار اور کردار وعمل میں ہر جگہ توحیدی رنگ نظر آتا ہے اور وہ پیغمبر ﷺ کی اس حدیث شریف کا مصداق بن جاتا ہے:

(لایؤمن أحدکم حتیٰ یکون ھواہ تبعاً لما جئت بہ[1]) ''تم میں سے کوئی شخص بھی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی ہر خواہش اس دین کی تابع نہ بن جائے جو میں لیکر آیا ہوں'' جبکہ شرک کی صورتحال اس کے برخلاف ہوتی ہے کیونکہ شرک آجانے کے بعد انسان سوفیصد خداوند عالم کے احکام کا پابند نہیں رہتا بلکہ وہ خدا کے ساتھ ساتھ خواہش نفس اور طاغوت وغیرہ کی پیروی بھی شروع کر دیتا ہے اور جب انسان توحید کے قلعہ کی چار دیواری سے باہر نکل جاتا ہے تو پھر ہوس اور طاغوت اس کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں اس کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں اور گویا اسے بالکل تباہ و برباد کر ڈالتے ہیں اس بارے میں قرآنی تعبیرات ملاحظہ فرمائیے: (اللہ ولی الذین آمنوا ۔ والذین کفروا أولیاؤھم الطاغوت[2]) ''اللہ صاحبان ایمان کا سرپرست ہے ۔اور جو لوگ کافر ہیں ان کے سرپرست طاغوت ہیں'' جسکا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مومن ہیں ان کا صرف ایک ولی و سرپرست ہے ایک ذریعہ اور ایک ہی سرچشمہ ہے اور صرف اسی سے ان کو نسبت ہے لیکن مشرکین مختلف لیڈروں اور حاکموں کے آلہ کار اور تابع ہوتے ہیں انہیں جو ذریعہ اور وسیلہ بھی نظر آجاتا ہے وہ اسی کے پیچھے لگ لیتے ہیں اسی لئے ان کے واسطے جمع کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے:

(والذین کفروا أولیاؤھم الطاغوت)

''اور جو لوگ کافر ہیں ان کے سرپرست طاغوت ہیں'' (اس میں لفظ اولیاء جمع ہے)یہاں تک یہ بالکل واضح ہوگیا کہ جو شخص ،ٹھوس شخصیت کا مالک ہوتا ہے اس پر صرف شرعی قانون کی حکومت چلتی ہے اور وہ مرضی خدا کا پابند ہوتا ہے ایسے افراد کسی غوروفکر ،شرم وحیا اور خوف وہراس کے بغیر اپنی شرعی ذمہ داریوں پر عمل کرتے ہیں کیونکہ یہ خوف وہراس ،شرمندگی اور اضطرابی حالت انسان کی اندرونی کشمکش اور تذبذب کی دلیل ہے جو نفس کے اندرونی یا بیرونی اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے لہٰذا جب انسان کسی ایک طاقت کا پابند اور پیرو ہوتا ہے اور اسکی نظر ہمیشہ ایک ہی مرکز پر رہتی ہے تو اس پر ان چیزوں کا اثر نہیں پڑتا ہے ۔ایسے افراد کی پہچان یہ ہے کہ وہ ثقہ، قابل اطمینان، ثابت قدم ،ٹھوس رائے ،پاکیزہ نفس صاف وشفاف ضمیر کے مالک

[1] جامع الکبیر طبری ۔
[2] سورۂ بقرہ آیت ۲۵۷۔

،شجاع اورتنہائی یا چاہنے والوں اور مددگاروں کی قلت اور دشمنوں کی کثرت کے باوجود اپنے موقف پر اٹل رہتے ہیں ۔امیر المومنین،نے فرمایا ہے: (لایزیدنی کثرۃ الناس عزّۃ،ولاتفرُّقھم عنی وحشۃ[1]) ''لوگوں کی کثرت سے نہ میری عزت اوراستحکام میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ان کے متفرق ہوجانے سے مجھے کوئی وحشت ہوتی ہے'' دوسرے یہ کہ ان لوگوں کے ان خصائل اور صفات پر وقتی سکون واطمینان ،زحمت ومشکلات رزم وبزم فتح ونصرت یا ناکامی اور شکست کا کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور وہ پرچم توحید کے سایہ میں سدا بہار رہتے ہیں ۔

عماربن یاسر

خداوند عالم جناب عمار یاسر پر رحمتیں نازل فرمائے وہ ایک مثالی ،ٹھوس اور عظیم شخصیت کے مالک تھے ۔جنگ صفین میں آپ نے حضرت علی،کی رکاب میں اس وقت معاویہ سے جنگ کی تھی جب آپ کی عمر ،نوے برس سے زیادہ تھی آپ نڈر،بہادر،ثابت قدم،جنگ کے شعلوں میں کودجانے والے اورامام کے ایسے جانثار ساتھی تھے جن کے دل میں حضرت علی،کی حقانیت اور معاویہ کے ناحق اور باطل ہونے کے بارے میں ایک لمحہ کے لئے بھی شک پیدا نہیں ہوا ۔یہی وجہ ہے کہ صفین کی جنگ کے دوران ہی حضرت علی،کے سامنے آپ نے پروردگار عالم سے یہ دعا کی:(اللّٰھم انکتعلم أنی لوأعلم أن رضاک فی أن اقذف بنفسی فی ھذاالبحر لفعلت،اللّٰھم انک تعلم أنی لوأعلم ان رضاک أن أضع ظُبَتھسیفی فی بطنی ثم أنحنی علیھا حتیٰ یخرج من ظھری لفعلت،اللّٰھم وانی علم ماعلّمتنی أنی لاأعمل الیوم عملاًھو أرضیٰک من جھاد ھؤلاء الفاسقین،ولوأعلم الیوم عملاً أرضیٰک منہ لفعلت[2]) ''بارالٰہا توجانتاہے کہ اگر مجھے یہ معلوم ہوجائے کہ اس سمندر میں کودجانے میں تیری خوشنودی ہے تو میں یقیناًکودجاؤں گا ۔بارالٰہا تو جانتا ہے کہ اگرمجھے معلوم ہوجائے کہ تیری خوشی اس میں ہے کہ میں اپنی تلوار اپنے پیٹ پر رکھکر اس کے اوپر اتنا جھک جاؤں کہ وہ میری کمر کے پار نکل جائے تو میں یہ کرنے کے لئے تیار ہوں ۔بارالٰہا تونے مجھے جو علم دیا ہے اسکی بنا پرمجھے معلوم ہے کہ آج تجھے ان فاسقین سے جہاد

[1] نہج البلاغہ مکتوب۳۶۔
[2] صفین:نصربن مزاحم ۳۱۹۔۳۲۰تحقیق ڈاکٹر عبدالسلام ہارون۔

کرنے سے زیادہ میرا کوئی عمل پسند نہیں ہے (لہٰذا میں ان سے جہاد کر رہا ہوں)اور اگر مجھے اس سے زیادہ تیرا پسندیدہ عمل معلوم ہوجائے تو میں اسکو ضرور انجام دونگا ''اسماء بن حکم فزاری کا بیان ہے کہ ہم صفین کے میدان میں حضرت علیؑ کے لشکر میں جناب عمار یاسر کی سپہ سالاری میں دو پہر کے وقت سرخ چادر کے سائے میں بیٹھے ہوئے تھے ۔اس وقت ایک شخص (جو سب کے چہرے غور سے دیکھ رہا تھا)آیا اور اس نے کہا کیا تمہارے درمیان عمار یاسر ہیں ؟جناب عمار نے کہا :میں عمار ہوں ۔اس نے کہا! ابوالیقظان؟

جواب دیا :جی ہاں ۔پھر اس نے کہا :کہ مجھے آپ سے کچھ کام ہے ،فرمائیے یہیں سب کے سامنے عرض کروں یا تنہائی میں،جناب عمار بولے جو تم چاہو۔اس نے کہا ٹھیک ہے سب کے سامنے ہی عرض کئے دیتا ہوں جناب عمار نے کہا بتاؤ کیا کام ہے ؟ کہا! میں جب اپنے گھر سے نکلا تھا تو مجھے اپنی حقانیت اور اس قوم (لشکر معاویہ)کی گمراہی کے بارے میں کوئی شک و شبہہ نہیں تھااور مسلسل میری یہی کیفیت تھی مگر آج رات عجیب اتفاق ہوا کہ جب صبح ہوئی تو ہمارے مؤذن نے (اشهد أن لااله الاالله وأن محمدأرسول الله)کی صدا بلند کی اور ان کے موذن نے بھی اسی طرح اذان دی جب نماز شروع ہوئی تو ہم سب نے ایک ہی طرح نماز پڑھی ایک ہی طرح دعا کی،ایک ہی کتاب (قرآن مجید)کی تلاوت کی اور ہمارے رسولؐ بھی ایک ہیں،یہیں سے میرے دل میں کچھ شک پیدا ہوا ۔

چنانچہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ میں نے بقیہ وقت کیسے گذارا ہے، صبح ہوئی تو میں امیرالمومنینؑ کے پاس گیا اور ان کی خدمت میں پورا ماجرا بیان کردیا تو انھوں نے فرمایا :کیا تم عمار بن یاسر سے ملے ہو؟میں نے عرض کی نہیں، فرمایا جاؤ ان سے ملاقات کرو اور جو کچھ وہ کہیں اس پر عمل کرنا ۔لہٰذا اسی کام کے لئے میں آپ کی خدمت حاضر ہوا ہوں تو جناب عمار یاسر (رح) نے اس سے کہا: کیا تم ہمارے مقابلہ میں موجود اس سیاہ پرچم والے لشکر کے سپہ سالار کو جانتے ہو؟وہ عمروبن عاص ہے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہ کر میں نے اس سے تین بار جنگ کی ہے اور آج اس سے یہ میری چوتھی جنگ ہے ۔اور یہ جنگ ان جنگوں سے کچھ بہتر نہیں ہے

بلکہ بد تر ہی ہے بلکہ اس کا شر و فساد ان سب سے زیادہ ہے ،کیا تم بدر واحد اور حنین میں تھے یا تمہارے والد ان میں موجود تھے کہ انھوں نے تم سے ان جنگوں کے کچھ حالات بتائے ہوں؟اس نے کہا نہیں آپ نے کہا کے بدرواحد و حنین کے دن ہم سب رسول اللہ کے پرچم تلے جمع تھے اور وہ لوگ مشرکین کے جھنڈے کے نیچے اکٹھا تھے ۔کیا تم اس لشکر اوراہل لشکر کو دیکھ رہے؟خدا کی قسم !معاویہ کے ساتھ یہ جتنے لوگ حضرت علیؑ کے مقابلہ میں ہم سے لڑنے آئے ہیں ۔ یہ سب ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں اور میرادل تو یہ چاہتا ہے کہ ان سب کو ایک ساتھ ٹکڑے ٹکڑے کرڈالوں ۔خدا کی قسم ان سب کا خون ایک چڑیا کے خون سے زیادہ حلال ہے ۔کیا تم چڑیا کا خون بہانا حرام سمجھتے ہو؟اس نے کہا :نہیں بلکہ حلال ہے تو جناب عمار نے کہا بس سمجھ لو کہ ان کا خون بھی اسی طرح حلال ہے ۔

کیا میری بات تمہارے لئے واضح ہوگئی؟اس نے کہا :جی ہاں آپ نے درست وضاحت فرمائی جناب عمار نے کہا : لہٰذا اب جسے چاہو منتخب کر سکتے ہوپھر جب وہ شخص واپس چلنے لگا تو جناب عمار نے اسے واپس بلایا اور اس سے یہ کہا کہ ان لوگوں نے ہم پر اپنی تلوار کا وار کیا تو تم میں سے بعض افراد شک وشبہ کا شکار ہوگئے اور یہ کہنے لگے کہ اگر یہ لوگ حق پر نہ ہوتے تو ہمارے خلاف جنگ کے لئے نہ نکلتے ،خدا کی قسم ان کے پاس مکھی کے ایک آنسو کے برابر بھی حق موجود نہیں ہے ۔

اللہ کی قسم اگر وہ ہم پر اپنی تلواروں سے حملہ کریں یہاں تک کہ وہ ہمیں سعفات ہجر (ایک مقام کا نام)تک پہونچا دیں تب بھی مجھے یہی معلوم ہوگا کہ میں حق پر ہوں اور وہ باطل پر ہیں اور خدا کی قسم اس وقت تک امن وامان قائم نہیں ہوسکتا ہے جب تک فریقین میں سے کوئی ایک فریق اپنے حق ہونے کا منکر نہ ہواور وہ یہ گواہی نہ دے کہ اسکا مخالف فریق بر حق ہے اور ان کے مقتولین اور مردے جنّتی ہیں اور دنیا کے دن اس وقت تک پورے نہیں ہو سکتے جب تک وہ یہ اقرار نہ کر لیں کہ ان کے مردے اور مقتولین جہنمی اور زندہ رہنے والے اہل باطل ہیں[1]۔کھوکھلااور بے ہنگم انسان(شخصیت)کھوکھلے اور بے ہنگم لوگوں کے نفس میں اندرونی

[1] صفین،نصر بن مزاحم ص۳۲۱،۳۲۲

کشمکش اور بیقراری کا آغاز سب سے پہلے عقل اور خواہشوں کی خانہ جنگی سے ہوتا ہے کیونکہ خواہشیں انسان کے نفس کو اسکی عقل کی ماتحتی اور کنٹرول سے باہر نکالنے کی درپے رہتی ہیں جس سے آدمی کا نفس دو متصادم دھڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے ۔اس داخلی جنگ کے نتیجہ میں انسان کی مشکلات اور زحمتیں بہت زیادہ ہوجاتی ہیں کیونکہ انسان کے اوپرا سکے ضمیر، فطرت اور عقل کی حکومت بہت مستحکم ہوتی ہے اور یہ اسباب اسکے اندر ہوس کے نفوذ (داخلے)کا سختی سے مقابلہ کرتے ہیں اور انکی مسلسل یہ کوشش رہتی ہے کہ وہ انسان کی شخصیت کوتقویت دیکراسے اسکی پہلی حالت اور فطرت کی طرف لوٹا دیں اس مرحلہ میں انسانی نفس کے اندر ایک خلفشار اور خانہ جنگی کی صورت حال رہتی ہے جسکی بنا پر اسے سخت زحمتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جب انسان کی عقل اس کی رفتار وکردار کو کنٹرول کرنے اور اسے استقامت عطا کرنے سے عاجز ہوجاتی ہے اور انسان کے لئے اسکے نفس کااندرونی خلفشار اور خانہ جنگی بھی ناقابل برداشت ہوجاتے ہیں تو پھر وہ اپنی فطرت سے فرار کی کوشش کرنے لگتا ہے جو ان مشکلات کا منفی اور غلط راہ حل ہے بلکہ اسکا صحیح راہ حل تویہ ہے کہ اپنی عقل وفطرت کو پھر سے زندہ کرکے اسے استحکام بخشے اور اسکے احکامات کے مطابق عمل کرے ۔

لیکن اسکے بجائے صورتحال یہ ہوجاتی ہے کہ انسان خواہشات کی سلطنت کے سامنے سپر ڈال دیتا ہے اور ان مشکلات سے نجات پانے کے لئے اپنی فطرت سے فرار کی کوشش کرتا ہے ؟اور نشہ،جوا،جرائم یا جنسیات کے دامن میں پناہ تلاش کرتا ہے ۔ مزید تعجب کی بات تویہ ہے کہ انسان اپنی ہوس سے اپنی ہوس ہی کی طرف فرار کرتا ہے اور ایک جرم سے دوسرے جرم کی طرف بھاگتا ہے ورنہ اگر وہ اپنی ہوس کے برخلاف قدم اٹھائے اور خواہش نفس اور ہوس سے خدا کی طرف آگے بڑھے توبآسانی ان سے نجات پاکرسکون حاصل کرسکتا ہے جسکی طرف قرآن مجید نے ان الفاظ میں متوجہ کیا ہے: (ففروا الیٰ اللہ انی لکم منہ نذیر مبین[1]) ''لہٰذا اب خدا کی طرف دوڑپڑو کہ میں کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں''لہٰذا جب تک انسان خداوند عالم کی پناہ حاصل نہ

[1] سورۂ ذاریات آیت ۵۰۔

کرلے وہ اپنی ہوس کے سامنے لاچار اور مجبور ہی رہتا ہے اسی لئے وہ مشکلات اور زحمتوں نیز اپنی زندگی کے دردسر سے نجات پانے کے لئے نشے اور جنسیات کارخ کرتا ہے جنکے بارے میں قرآن کریم کی یہ تعبیر کتنی صحیح ہے کہ: (نسوا اللّٰہ فأنساھم أنفسھم[1]) ''انھوں نے خدا کو بھلاڈالاتو خدا نے خود ان کو بھی نظر انداز کردیا''کیونکہ جو لوگ اپنی فطرت اور ضمیر سے فرار کرکے شراب یا جوئے وغیرہ کی طرف بھاگتے ہیں در اصل وہ اپنے کو بھلادینا چاہتے ہیں اور انسان کا یہ فرار ذکر (یاد) سے نسیان (بھول) کی طرف ہے جو خود فرار سے بدتر ہے ۔

بالآخرانسان کے نفس اور اسکی شخصیت کے اندر ہوی وہوس کا مقابلہ کرنے والی آخری طاقت کا نام ضمیر ہے جو حتی الامکان اپنی کوشش بھر انسان کواسکی ہوس اور شیطان کے خونخوار پنجوں سے بچانے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ جب ضمیر بھی خواہشات کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے تو پھر انسانی وجود کے اندر اسکے خواہشات کا مقابلہ کرنے والا آخری قلعہ بھی منہدم ہوجاتا ہے اور یہی اس جنگ کا پہلا مرحلہ ہے جسکے بعد انسان دائمی دردسر اور تشنج کا شکار ہوجاتا ہے ۔

جب خواہشات ہر اعتبار سے فتح یاب ہوجاتے ہیں اور انسان کے اوپر ان کی سلطنت کا نفوذ ہوجاتا ہے اور وہ پورے طورپر ان کے دائرہ اختیار کے اندرآجاتا ہے ۔تب بھی اسے اپنے خیالات کے برخلاف اس اندرونی خلفشاراور خانہ جنگی سے نجات نہیں مل پاتی بلکہ نفس کے اندرہی خود ان خواہشات کے درمیان ایک اور خانہ جنگی اور خلفشار شروع ہوجاتا ہے بلکہ اس بار اسکا انداز اورزیادہ خطرناک اور سخت ہوتا ہے کیونکہ انسان اس مرحلہ میں مختلف قسم کے خواہشات نفس (اور ہوس) کے درمیان تذبذب کاشکار رہتاہے لہٰذا اسکا خلفشار پہلے مرحلہ کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہوجاتا ہے اور اگر اسکی دردسری اورذہنی پریشانی گذشتہ مرحلہ سے زیادہ نہ ہو تو بہر حال اس سے کم ہرگز نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس مرحلہ میں بھی گذشتہ مرحلہ کی طرح اسکے معاملات بالکل متفرق اوردرہم برہم ہوجاتے ہیں البتہ ان دونوں کے درمیان یہ فرق ضرورہوتا ہے کہ پہلے مرحلہ میں انسان کی مشکلات کے دوران اسکی عقل اور

[1] سورۂ حشر آیت ١٩۔

خواہشات کے درمیان ٹکراؤ ہوا تھا لیکن اس مرحلہ میں خود اسکی خواہشات اور ہوس کے درمیان ٹکراؤ رہتا ہے کیونکہ اسکی ہر خواہش (ہوس) دوسری خواہشات کے مقابلہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہے اسی لئے ان کے درمیان یہ جنگ جاری رہتی ہے ۔

اس سلسلہ میں چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں: ا۔ جب کبھی انسان جذبۂ انتقام اور غصہ یا محبت دنیا اور عہدہ کی محبت کے درمیان تذبذب کا شکار ہوتا ہے تو حکومت، عہدہ اور پوسٹ کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ دشمنوں کے ساتھ نرم رویہ سے پیش آئے مگر جذبۂ انتقام یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے مقابلہ میں آنے والے ہر دشمن کا قلع قمع کردے ۔۔۔ اور ہمیں بخوبی یہ معلوم ہے کہ یہ نرمی اور مدارات، حلم کی قسم نہیں ہے (جو عقل کے لشکروں میں سے ہے) بلکہ یہ درحقیقت ایک ہوس کو دوسری ہوس پر ترجیح دینے کا نتیجہ ہے ۔

۲۔ کبھی عہدہ یا حکومت کی لالچ اور سماجی مقام یا عظمت ووقار جیسے دو جذبات اور خواہشات کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوجاتا ہے کیونکہ انسان کی سماجی عزت ووقار اس سے کچھ خاص اقدار وآداب کی پابندی کا مطالبہ کرتے ہیں جبکہ دوسرے خواہشات ان سے کنارہ کشی کے خواہاں ہوتے ہیں جیسے جنسی خواہش،لہٰذا ان سیاسی یا سماجی عہدوں اور کرسیوں تک پہونچنے کے لئے اپنے جنسیات پر کنٹرول کرنا، یہ کسی عفت کی بنا پر نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ایک خواہش (ہوس) کو دوسری ہوس پر ترجیح دی گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جنسی ہوس دوسرے خواہشات (عہدہ کی لالچ) پر غالب آجاتی ہے جسکے نتیجہ میں ارباب حکومت کے یہاں بھی جنسی اسکینڈل رونما ہوجاتے ہیں اور انہیں بدنام کرکے رکھ دیتے ہیں ۔

۳۔ کبھی انسان کسی عہدے کی محبت اوراپنی جان کے خوف کا نوالہ بن کر رہ جاتا ہے کیونکہ عہدہ کی تمنا اس سے دوسروں پر حملہ کرنے انہیں قتل وغارت کرنے اور خطرات میں کود پڑنے کا مطالبہ کرتی ہے لیکن جان کا خطرہ اس کو حفاظتی انتظامات اور احتیاطی تدابیر اور پھونک پھونک کر قدم اٹھانے پر اکساتا ہے ۔ دو مختلف قسم کی خواہشات کی بناء پر انسانی نفس کے اندرونی خلفشار اور خانہ جنگی کی یہ تین مثالیں آپکے سامنے حاضر ہیں ان کے علاوہ بھی مختلف خواہشات کے درمیان نہ جانے ایسے کتنے حادثات ہر روز رونما ہوتے رہتے ہیں جوانسانی زندگی کے لئے ایک عام بات ہیں اور اس میں متعدد خواہشات اور جذبات ایک دوسرے سے ٹکرا کر

اسے اپنی سمت کھینچنا چاہتے ہیں اور انسان خوف اور لالچ ، حب جاہ ،بخل وحسد ،جنسیات اور غصہ و انتقام نیز حب مال جیسے خواہشات کے کھنچاؤ کی بناپر،تتر بتر ہو کر رہ جاتا ہے جسکے بعد وہ اپنے ذہنی بوجھ اور مشکلات کے دلدل میں اور زیادہ دردسری کاشکار ہوجاتا ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: (انّما یریداللہ لیعذبھم بھافی الحیاۃ الدنیاوتزھق أنفسھم وھم کافرون[1])

''بس اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ انہیں کے ذریعہ ان پر زندگانی دنیا میں عذاب کرے اور حالت کفر ہی میں ان کی جان نکل جائے''

یہی معاملات کا درہم برہم ہوناہے جس کی طرف حدیث قدسی میں اشارہ کیا گیا ہے ۔

ہوس کے عذاب

جب انسان اپنی ہوس کا شکار ہو جاتا ہے تو اسکے خواہشات کا ٹکراؤ بھی اسکے لئے وبال جان بن جاتا ہے جبکہ اس کے پنجوں میں پھنسنے کے بعد انسان جس دوسرے دردسر اور زحمت میں مبتلا ہوتا ہے وہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ عذاب خود اس ہوس سے مربوط ہوتا ہے لہٰذا انسان کی ہوس اور خواہش جیسی ہوگی اسکا ویسا ہی عذاب اور دردسر سامنے آئے گا جیسے حرص،لالچ اورحسد جیسے خواہشات اگر ہمارے نفس کے اندر جگہ بنالیں تو ان کی خواہش ہمیں ایک الگ مصیبت میں مبتلا کردے گی اوریہ طے شدہ بات ہے کہ جو شخص اپنے معاملات کو ان خواہشات کے حوالے کردیگا وہ ان مصائب سے نجات نہیں پاسکتا ہے ۔خواہشات کے چنگل میں رہ کر انسان جس عذاب اور وبال جان میں مبتلا ہوتا ہے اسکی طرف اس روایت میں اشارہ موجود ہے جسے شیخ مفید علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب الارشاد[2] میں امیرالمومنین،سے نقل کیا ہے : (ماأعجب أمرالانسان،ان سنح لہ الرجاء أذلّہ الطمع،وان ھاج بہ الطمع أھلکہ الحرص،وان ملکہ الیأس قتلہ الأسف،وان سعد نسی التحفظ،وان نالہ خوف حیرّہ الحذر،وان اتسع لہ الامن أسلمتہ الغرّۃ ''الغفلۃ''وان أصابتہ۔)

''اس انسان کے معاملات کتنے تعجب آور ہیں کہ اگر اسے امید کی کرن نظر آنے لگے تو طمع اسکو ذلیل کر دیتی ہے اور اگر اسکی لالچ بھڑک اٹھے توحرص اسے ہلاک کر ڈالتی ہے اور اگر اس پر نا امیدی کا غلبہ ہوجائے تو افسوس اسے قتل کر دیتا ہے اور اگر وہ کامیاب

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۵۵۔
[2] ارشاد مفیدص ۱۵۹ ۔

اور خوشحال ہوجائے تو پھر (دین کی) پابندی کو بھول جاتا ہے،اگر اسے خوف لاحق ہوجائے تو دہشت متحیر و سرگردان کردیتی ہے اور اگر ہر طرف امن وسکون رہے تو غفلت (دھوکہ) میں گرفتار ہوجاتاہے اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہوجائے تو بے صبری اور آہ وفریاد ذلیل کردیتی ہے اگر کہیں سے مال مل جائے تودولت اسے باغی بنادیتی ہے اگر وہ فاقہ کے چنگل میں پھنس جائے توبلائیں اسکے شامل حال ہوجاتی ہیں اور اگر بھوک لاغر بنادے تو کمزوری نڈھال کردیتی ہے اور اگر کھانے پینے میں افراط کربیٹھے تو پرخوری سے اس کا سانس رک جاتا ہے ۔ مختصر یہ کہ اسکے لئے ہر تقصیر مضر ہے اور ہر زیادہ روی (افراط) مفسد ہے اور اس افراط) کے بعد ہر خیر شر بن جاتا ہے اور ہر شر اسکے لئے ایک آفت ہے''

مختصر یہ کہ دنیا کے بارے میں پرامید ہونا ہر انسان کو طمع کی ذلت کے حوالہ کردیتا ہے اور طمع (لالچ) ہلاکتوں کے سپرد کردیتی ہے کسی چیز سے مایوسی کے بعد وہ کف افسوس ہی ملتا رہتا ہے اور کوئی خوف پیدا ہوجائے تو وہ دہشت کے منہ میں جھونک دیتا ہے اس طرح ہرخواہش اور ہوس ایک نئی خواہش اور ہوس کے حوالے کردیتی ہے اور آخر کار وہ ہلاکت کے منہ میں پہونچ جاتا ہے ۔ دنیا اپنے خواہشمند کے لئے ایک وبال جان انسان کے دنیا وی عذاب کا پہلا رخ اور پہلا مرحلہ تو اسکے خواہشات (ہوس) ہیں مگر دوسری منزل میں خود یہ دنیا اسکے لئے عذاب بن جاتی ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ دنیا خواہشات (ہوس) کا کھلا میدان،ان کی آخری منزل، انکے حصول کا سرچشمہ،ان کی آماجگاہ اور انکو ابھارنے اور ان کی پرورش کی جگہ ہے لہٰذا جب خداوند عالم کسی انسان کو خواہشات نفس کی پیروی کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا کرتا ہے تواس پر یہ عذاب لا محالہ، طلب دنیا کے ذریعہ ہی ہوتا ہے کیونکہ انسانی ہوس اور دنیا طلبی کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ممکن نہیں ہے،بلکہ یہ ایک مسلم حقیقت ہے اور اسلامی افکار کے اہم مسائل کا حصہ ہے جس کی ہم یہاں وضاحت کر رہے ہیں ۔

اگر کوئی انسان اپنے ضروریات زندگی اور ضروریات دین اور تکامل کے لئے دنیا حاصل کرے تو اس حصول دنیا اور حتی دنیا میں کوئی چیز شر اور عذاب نہیں ہے جس کی تصدیق اسلام میں موجود ہے کیونکہ اسلام کا یہ کہنا ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز شر نہیں ہے،بلکہ

سب خیر ہی خیر ہے اسی لئے اس نے دنیا حاصل کرنے اور رزق تلاش کرنے کے لئے دوڑدھوپ کرنے کو شریعت کا جزء قرار دیا ہے کیونکہ اسلام کی نگاہ میں دنیا اولیاء خدا کا میدان تجارت (مڈی)اور اسکے محبین کی مسجد ہے: (متجرأولیاء اللہ،ومسجدأحباء اللہ[1]) ''(دنیا)اللہ کے اولیاء کا میدان تجارت اور اسکے محبین کی مسجد ہے''لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ دنیا شر اور عذاب ہواس دنیا میں محنت ومشقت کرنا اور رزق تلاش کرنا شریعت اسلامیہ کا جزہے جس کی تائید کے لئے قرآن مجید کی اس آیت میں مہر تصدیق ثبت ہے: (فاذا قضیت الصلوٰۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ[2]) ''جب نماز تمام ہوجائے تو روئے زمین پر پھیل جاؤ اور فضل الٰہی تلاش کرو'' لہٰذا جب یہ سب خیر ہے تو شر اور عذاب کا وجود کہاں رہے گا؟لہٰذا جب تک یہ دنیا خداوند عالم تک پہونچنے کا ذریعہ اور اسکی مرضی حاصل کرنے کاوسیلہ ہواور اس سے بڑھ کر خودخدا تک جانے کا ارادہ ہو تو یہ پوری دنیا اور اس میں ہونے والی ہر کوشش خیر ہی خیر ہے۔لیکن اگر انسان کی محنت و مشقت اوراسکی حرکت کا رخ خداوند عالم اور اسکی مرضی حاصل کرنے کے بجائے دنیا کی طرف مڑجائے تو یہ اسلام کی نظر میں ناقابل برداشت بات ہے ۔اور اسے اس نے شر قرار دیا ہےاور اسی کو خداوند عالم انسان کے لئے عذاب دنیا بنا دیتاہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ دنیا انسان کی نظر میں خدا تک پہونچنے کا ایک ذریعہ اور وسیلہ ہونے کے بجائے خودایک مستقل مقصد میں تبدیل ہوجائے تو پھر انسان اپنی گمراہی کی وجہ سے خدا کی طرف جانے کے بجائے دنیا کی طرف چل دیتا ہے اور اسکی نظریں ذات خدا کے بجائے دنیا کی رنگینیوں پر ٹکی رہتی ہیں اور جب وہ دنیا میں گھرارہ جائے تو اسکا ہر عمل باطل اور محنت بیکار نیز اسکی ترقی اور تکامل معطل ہوکر رہ جاتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ تنزلی،لغزش اور خسارہ کا شکار ہوجاتا ہے ۔بلکہ کبھی کبھی انسان خداوند عالم سے منحرف ہوکر اس حد تک آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ خداوندعالم سے جنگ کی ٹھان لیتا ہے اور کھلم کھلا خدا ورسول کی دشمنی کا اعلان کرتا ہے ۔بہر حال چاہے جو کچھ بھی ہواگر یہ دنیا انسان کے لئے خدا تک پہونچنے کا وسیلہ ہونے کے بجائے منزل مقصود میں تبدیل ہوجائے اور انسان کی کل دوڑدھوپ دنیا طلبی تک محدودرہے تو پھر

---

[1] نہج البلاغہ حکمت۱۳۱۔

[2] سورۂ جمعہ آیت ۱۰۔

یہی دنیاانسان کیلئے دردسر اور عذاب جان بن جاتی ہے ۔جودنیا، انسان کی خواہشمند ہوتی ہے اور جس دنیا کا خواہشمند انسان ہوتا ہے ان دونوں کے درمیان یہی فرق ہے کہ انسان کی خواہشمند دنیا اسے خدا تک پہونچاتی ہے لیکن جب انسان دنیا کے پیچھے بھاگتا ہے تو یہی دنیاخدا تک پہونچنے کا راستہ ہونے کے بجائے اس کے لئے سنگ راہ بن کر عذاب اور وبال جان بن جاتی ہے ۔رسول اکرم ﷺ سے روایت ہے: (لما خلق اللّٰہ الدنیا أمرھا بطاعۃ ربّھا،فقال لھا خالفی مَنْطلبکِ ووافقی من خالفکِ،فھی علیٰ ماعھد الیھا اللّٰہ وطبعھاعلیہ[1]) ''جب خداوند عالم نے دنیا کو خلق فرمایا تو اس سے ارشاد فرمایا کہ جو تجھے طلب کرے (تیرا خواہشمند ہو)اسکی مخالفت کرنا اور جو تیرا مخالف ہو اسکی موافقت کرنا لہٰذا یہ دنیا خداوند عالم سے کئے ہوئے عہد کے مطابق اپنی طبیعت پر باقی ہے''

روایت میں بطور کنایہ اس طرف اشارہ ہے کہ جو شخص فکر دنیا میں پڑجائے اور اسی کو اپنا سب کچھ سرمایہ اور مقصد قرار دیدے توخداوند عالم اسی دنیا کو اسکے لئے عذاب بنا دیتا ہے اور جو شخص دنیا سے دل نہ لگائے اور اسکی مخالفت کرتا رہے تو پروردگار اسکے لئے دنیا کو چین اور سکون میں بدل دیتا ہے ۔

رسول اکرم ﷺ: (أوحیٰ اللّٰہ الیٰ الدنیا :اخدمی من خدمنی،واتعبی من خدمکِ[2]) ''اللہ تعالی نے دنیا کی طرف یہ وحی فرمائی جو میری خدمت کرے اسکی خدمت گذار بننا اور جو تیری خدمت کرے اسکے لئے عذاب بن جانا''اس روایت میں بھی گذشتہ روایت کی طرح یہ کنایہ موجود ہے کہ اگر انسان کا مقصد خداوندعالم کو خوش کرنا ہو،تو یہ دنیا اسکی خدمت کے لئے خلق کی گئی ہے لیکن جب اسکا مقصد خدا کے بجائے دنیا ہوجائے تو پھر اسکے لئے دنیا کی خدمت کرنا ضروری ہے اور دنیا کی خدمت کرنا کسی عذاب اور درد سر سے کم نہیں ہے ۔رسول اکرم ﷺ سے ہی یہ بھی روایت ہے: (ان اللّٰہ جل جلالہ أوحیٰ(الیٰ)الدنیا أن اتعبی من خدمکِ واخدمی من رفضکِ[3]) ''خداوند عالم نے دنیا کی طرف یہ وحی فرمائی کہ جو تیری خدمت کرے اسے عذاب میں مبتلا کردینا اور جو تجھے چھوڑدے اسکی خدمت کرنا''اس روایت کا بھی انداز اور لہجہ بعینہ وہی ہے بلکہ اگر کوئی روایات کے اندازبیان سے واقف

[1] بحارالانوار ج۷۰ص۳۱۵۔
[2] بحارالانوارج۷۸ص۲۰۳۔
[3] بحارالانوار ج۷۳ص۱۲۱۔

ہوتو اسے بخوبی محسوس ہوگا کہ اس روایت میں گذشتہ روایات کے بالمقابل کچھ زیادہ صراحت موجود ہے ۔ حضرت علیؑ سے مروی ہے: (من خدم الدنیا استخدمتہ ومن خدم اللہ خدمتہ[1]) ''جو شخص دنیا کی خدمت کریگا وہ اسے اپنا نوکر بنائے رکھے گی اور جو شخص خداوند عالم کی خدمت (اطاعت) کریگا تو خداوند عالم دنیا کو اس کا خدمت گذار بنا دیگا'' اللہ تعالی نے جناب موسیٰؑ کی طرف یہ وحی فرمائی: (ما من خلقی أحد عظّمھا[2] فقرّت عینہ ،ولم یحقّرھا أحد الا انتفع بھا[3]) ''یعنی میری مخلوقات کے درمیان کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے کہ جس نے دنیا کو بڑا سمجھا ہو اور اسکی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوئی ہو اور کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے اسکو ذلیل سمجھا ہو اور اس نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا ہو''

کتب احادیث میں اس قسم کی روایات بہت زیادہ ہیں مگر یہ دوسری بات ہے کہ ان روایات میں کائنات کے بارے میں الٰہی سنتوں کی وضاحت جس انداز میں پیش کی گئی ہے اگر کوئی اس سے واقف نہ ہوتو یہ روایات اسکے لئے کچھ مبہم ہیں لیکن جولوگ زبان وبیان حدیث سے واقفیت رکھتے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ان روایات میں جس عذاب کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے مراد وہ عذاب ہے جو خدا سے روگردانی کرنے اور دنیا سے دل لگا لینے کی صورت میں اسکے سامنے آتا ہے یعنی یہ دنیا ہی اسکے لئے عذاب بن جاتی ہے لیکن اگر اسکا دل خداوند عالم کی طرف متوجہ رہے اور وہ دنیا کو خداوند عالم تک رسائی حاصل کرنے کے ذریعہ کے علاوہ کچھ اور خیال نہ کرے اور اسی نیت سے دنیا کا ہر کام کرتا رہے اور اپنا رزق کمائے تو دنیا اسے نقصان نہیں پہونچا سکتی بلکہ وہ اسکے لئے فائدہ مند اور خدمت گذار ہی ثابت ہوگی۔

خواہشات کی پیروی کے بعد انسان کی دوسری مصیبت

گذشتہ صفحات میں ہم نے دنیا داری اور خواہشات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے پہلے عذاب کا تذکرہ کیا ہے جس میں انسان کے

---

[1] غرر الحکم ج۲ ص۲۳۷۔
[2] یعنی دنیا۔
[3] بحارالانوار ج۷۳ص۱۲۱۔

معاملاتِ زندگی بکھر کر رہ جاتے ہیں اور اسکی خواہشات کے آپسی ٹکراؤ کی بناء پر اسکا نفس عجیب وغریب اندرونی خلفشار کا شکار ہوجاتا ہے ۔مگر اس تذبذب اور خلفشار کے بعد بھی یہ خواہشات انسان کو چین سے نہیں رہنے دیتیں بلکہ جب انسان خدا سے اپنا منھ پھیر کر انہیں خواہشات کے مطابق چلتا ہے تو وہ حرص اور لالچ کے عذاب میں بھی پھنس جاتا ہے کیونکہ اگر انسان کی توجہ خدا کے بجائے دنیا کی طرف ہوتو وہ کسی چیز سے سیر نہیں ہوپاتا اور اسے چاہے جس مقدار میں دنیا مل جائے یا اسکے برعکس وہ اس سے منھ پھیرے رہے تب بھی اسکی طمع کا وہی حال رہے گا کیونکہ یہ ایک نفسیاتی بات ہے اور مال ودولت وغیرہ کی کمی یا زیادتی سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ انسان کو جتنی زیادہ فراوانی کے ساتھ دولت ملتی ہے اسکے اندر دنیا کی محبت اور لالچ اتنی ہی زیادہ بڑھ جاتی ہے اور انسان دنیا کے پیچھے دیوانہ بنا رہتا ہے اور اسکا پیٹ کبھی بھی نہیں بھر پاتا اور اسکے سینہ میں محبت دنیا کی آگ پہلے کی طرح ہی جلتی رہتی ہے اور وہ کبھی سرد نہیں پڑتی ہے ۔

دنیا انسان کا ایک سایہ

جب انسان اس دنیا کو اپنا مقصد حیات بنالے تو پھر اس دنیا کے بارے میں وہی مثال مناسب ہے جو بعض روایات میں امیر المومنینؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: (مثل الدنیا کظلک،ان وقفتَ وقف،وان طلبتہ بَعُدَ)[1] ''دنیا کی مثال تمہارے سایہ کی طرح ہے کہ اگر تم رک جاؤ تو وہ بھی رک جائے گا اور اگر تم اسے پکڑنا چاہو تو وہ تم سے دور بھاگے گا''آپ کا یہ جملہ دنیا سے انسان کے رابطہ اور انسان سے دنیا کے رابطہ کے بارے میں بہت ہی بلیغ ہے کیونکہ دنیا کی لالچ اور اس پر ٹوٹ پڑنے سے اسے اپنے نصیب سے زیادہ کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے کیونکہ دنیا بالکل سایہ کی طرح ہے کہ اگر ہم اسکی طرف آگے بڑھیں گے تووہ ہم سے اتنا ہی آگے بڑھ جائے گا ۔گویا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنا پیچھا کرنے والے سے فرار کرجاتا ہے ،لہٰذا اسکے پیچھے دوڑنے سے تھکن اور دردسر کے علاوہ اور کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے ۔ اور بالکل یہی حال دنیا کا بھی ہے ۔لہٰذا دنیا کو حاصل کرنے کا سب

---

[1] غرر الحکم ج۲ ص۲۸۴۔

سے بہتر راستہ یہی ہے کہ طلب دنیا کی آرزو کو مختصر کردیا جائے اور دنیا کے اوپر جان کی بازی نہ لگائی جائے کیونکہ اس کے اوپر مرمٹنے سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے بلکہ انسان اپنے لئے مزید مصیبت مول لے لیتا ہے ۔

روایات کی روشنی میں عذاب دنیا کے چند نمونے

رسول اکرم ﷺ: (ما سکن حب الدنیا قلباً الا التاط بثلاث: شغلٌ لاینفدّ عناؤہ،وفقرٌ لایدرکغناہ،وأمل لاینال مناہ[1]) ''دنیا کی محبت کسی دل میں نہیں آتی مگر یہ کہ وہ تین چیزوں میں مبتلا ہوجاتا ہے ایسی مصروفیت جو ختم ہونے کا نام نہیں لیتی،ایسی فقیری جو مالداری میں تبدیل نہیں ہوسکتی اور ایسی آرزو جو کبھی پوری نہیں ہوسکتی ہے'' رسول اکرم ﷺ سے مروی ہے: (من أصبح والدنیا أکبر ھمہ،فلیس من اللہ فی شی ء،وألزمہ قلبہ أربع خصال:ھمّاً لا ینقطع أبداً،وشغلاً لاینفرج عنہ أبداً،وفقراً لایبلغ غناہ أبداً،وأملاً لا یبلغ منتھاہ ابداً[2]) ''صبح ہوتے ہی جسے سب سے زیادہ دنیا کی فکر ہوا سے خدا سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں ہے بلکہ وہ اسکے دل میں چار خصلتوں کو راسخ کردے گا ۔ کبھی ختم نہ ہونے والا غم،ایسی مصروفیت جس سے کبھی چھٹکارانہ ملے،ایسی فقیری جو استغنا تک نہ پہونچ سکے،ایسی آرزو جو کبھی اپنی آخری منزل نہ پا سکے''

حضرت علیؑ: (من لھج قلبہ بحب الدنیا التاط قلبہ منھا بثلاث: ھمّ لایغبّہ، ومرض لایترکہ،وأمل لایدرکہ[3]) ''جس شخص کا دل دنیا کی محبت کا دلدادہ ہوجائے اسکا دل تین چیزوں میں پھنس کررہ جاتا ہے ۔ ایسا غم جس سے افاقہ ممکن نہیں ایسی بیماری جو اسے کبھی نہ چھوڑے گی ایسی آرزو جسے وہ کبھی نہیں پاسکتا''،حضرت علیؑ: (من کانت الدنیا اکبر ھمہ،طال شقاؤہ وغمہ[4]) ''جسکے لئے دنیا سب کچھ ہوگی اسکی بدبختی اور غم طولانی ہوجائینگے''،حضرت علیؑ: (من کانت الدنیا ھمتہ اشتدت حسرتہ عند فراقھا[5]) ''جسکا سب سے بڑا مقصد،دنیا ہو تو اس سے دوری کے وقت اس کی حسرت شدید ہوجاتی ہے'' حضرت علیؑ: (المتمتعون من الدنیا تبکی قلوبھم وان

---

[1] بحارالانوار ج ۷۷ ص ۱۸۸ ۔
[2] میزان الحکمت ج۳ص۳۱۹۔
[3] شرح نہج البلاغہ ابی الحدیدج۱۹ص۵۲،بحارالانوار ج۷۳ص۱۳۰۔
[4] بحارالانوار ج۷۳ص۸۱۔
[5] بحارالانوار ج۷۱ ص۱۸۱۔

فرحوا،ویشتد مقتھم لانفسھم وان اغتبطوابعض مارزقوا[1]) '' دنیا سے لطف اندوز ہونے والے اگر چہ بظاہر خوش نظر آتے ہیں مگر ان کے دل روتے ہیں اور وہ خود اپنے نفس سے بیزار رہتے ہیں چاہے لوگ ان کے رزق سے غبطہ ہی کیوں نہ کریں''

امام جعفر صادقؑ (من تعلّق قلبہ بالدنیا تعلّق قلبہ بثلاث خصال:ھمّ لایُغنی،وأمل لایدرک،ورجاء لاینال[2]) '' جسکا دل دنیا سے وابستہ ہوجائے اسکے دل کے اندر تین خصلتیں پیدا ہوجاتی ہیں:لازوال غم ،پوری نہ ہونے والی آرزو،ہاتھ نہ آنے والی امید '' یہ رنگ برنگے عذاب ،دنیا کے ان عذابوں کا کچھ حصہ ہیں جو خداوند عالم نے خواہشات کی پیروی کرنے والوں کے لئے آخرت سے پہلے اسی دنیا میں معین فرمادئے ہیں مثلاً اہل ثروت کو اپنے اقرباء یا دور والوں سے اپنے مال کے بارے میں جو خوف اور پریشانی لاحق رہتی ہے یہ ان کے لئے دنیاوی عذاب کا صرف ایک حصہ ہے ۔

آخرت میں انسان کی سرگردانی وپریشاں حالی

حدیث قدسی میں انسان کی جس پریشان حالی (افتراق اوردرہم برہم ہوجانے)کا تذکرہ ہے اسکا تعلق صرف دنیا سے ہی نہیں ہے بلکہ دنیا کی طرح اسے آخرت میں بھی اسی صورتحال سے دوچار ہونا پڑے گا ۔آخرت میں یہ افتراق اور بیقراری سب سے پہلے اپنے خواہشات نفس اور ہوی وہوس کے پیچھے چلنے والوں کے درمیان ہی دکھائی دیگی کیونکہ وہ دنیا میں جسمانی اعتبار سے بظاہر متحد ضرور تھے مگر ان سب کی تمنائیں اور ہوس ایک دوسرے سے الگ تھیں نیزانھوں نے اپنے جواختلافات دنیا میں چھپارکھے تھے وہ سب آخرت میں کھل کر سامنے آجائیں گے خداوند عالم نے قرآن مجید میں اہل جہنم کے حالات کی یوں تصویر کشی کی ہے: (کلّما دخلت اُمۃ لعنت اُختھا[3]) ''جہنم میں داخل ہونے والی ہر جماعت اپنی دوسری برادری پر لعنت کرے گی''اس اختلاف اور انتشار یا خانہ جنگی کی دوسری صورت اس وقت سامنے آئے گی کہ جب انسان خدا سے اپنے جرائم چھپانا چاہے گا اور اسی وقت

[1] بحارالانوار ج۷۸ص۲۱۔
[2] بحار الانوار جلد ۷۳ص۲۴۔
[3] سورۂ اعراف آیت ۳۸

اس کے اعضاء اسکے جرائم کے بارے میں گواہی دینے لگیں گے تو وہ ان پر غصہ ہو گااوراسی وقت اسکے یہی ہاتھ پیر اور کھال وغیرہ اسے ذلیل و رسوا کرکے رکھ دینگے تووہ اپنے اعضاء سے یہ کہے گا :(وقالوا لجلود ھم لم شھد تم علینا قالوا أنطقنا اللہ الذی أنطق کلّ شیء[1])'' اور وہ (اہل جہنم)اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیسے شہادت دیدی تو وہ جواب دینگے کہ ہمیں اسی خدا نے گویا بنایا ہے جس نے ہر چیز کو گویائی عطا کی ہے''بلکہ روایات میں تو یہاں تک ہے کہ روز قیامت اپنی خواہشات کی پیروی کرنے والے گنہگاروں کے بعض اعضاء ان سے اظہار نفرت کرینگے اور ایک دوسرے پر لعنت کرتے دکھائی دینگے اور یہ بعینہ وہی صورتحال ہے جو دنیا میں خواہشات کی پیروی کی بنا پر انسان کے اندر دکھائی دیتی ہے ۔رسول اکرم ﷺ سے مروی ہے :(کفّ أذاک عنفسک،ولاتتابع ھواھا فی معصیتا للہ،اذ تخاصمک یوم القیامۃ،فیلغی بعضک بعضاً،الا أن یغفر اللہ و یستر برحمتہ[2]) ''اپنے نفس کو اذیت نہ دواور معصیت خدا میں اپنے نفس کے خواہشات کی پیروی نہ کرو کیونکہ وہ روز قیامت تم سے جھگڑا کریگا اور اسکا بعض حصہ دوسرے حصہ کو برا بھلا کہے گا ۔مگر یہ کہ خدا وند کریم تمہیں معاف فرمادے اور اپنی رحمت کے پردے ڈال دے''

۲۔اسکی دنیا کو اسکے لئے مزین کردوں گا

دنیا کا ظاہراور باطن

خواہشات کی پیروی کرنے والے کی دوسری سزا یہ ہے کہ اسکے لئے دنیا مزین کردی جاتی ہےاور دنیا کے مزین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہری لحاظ سے دنیا اس پرفریب انداز میں اس کے سامنے آتی ہے کہ وہ اسے دیکھ کر دھوکہ میں پڑا رہتا ہے جبکہ وہ دنیا کی واقعی شکل نہیں ہوتی ہےاور انسان اسی ظاہری صورت سے فریب کھا جاتا ہے کیونکہ اس کی جن ظاہری صورتوں کو دیکھ کر وہ فریب خوردہ رہتا ہے وہ وقتی ہیں اور ان میں بہت جلد تبدیلی آجاتی ہے لیکن دنیا کی واقعی شکل و صورت جو اسکے بالکل برخلاف ہے وہ درحقیقت یہ ہے کہ یہ دنیاانسان کے لئے مقام عبرت اور چشم بصیرت حاصل کرنے نیز زہد وتقوی اختیار کرنے کا سرچشمہ اور مرکز

[1] سورۂ فصلت آیت ۲۱۔
[2] محجۃالبیضاء فیض کاشانی ج۵ص۱۱۱۔

ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جن افراد کو خداوند عالم نے چشم بصیرت عنایت فرمائی ہے ان کی نگاہیں دنیاکے وقتی اور اوپری خول کے اندر گھس کر اس کی حقیقت کو بخوبی دیکھ لیتی ہیں اسی لئے وہ اس میں زہد سے کام لیتے ہیں اور اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن جو لوگ خداوندعالم کی عطا کردہ بصیرت کو ضائع کردیتے ہیں وہ زندگانی دنیا کو اسی ظاہری نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کی نگاہیں اس کے باطن اور حقیقت تک نہیں پہونچ پاتی ہیں لہٰذا ان کے دل اس کے دھوکہ میں پڑے رہتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ دنیا کے دو روپ ہیں: ا۔ظاہری

۲۔ باطنی اسی اعتبار سے اہل دنیا کی بھی دو قسمیں ہیں:

ا۔کچھ وہ لوگ ہیں جن کی نگاہیں دنیا کے ظاہر سے آگے نہیں بڑھتی ہیں ۔

۲۔ کچھ ایسے افراد ہیں جن کی نظریں دنیا کے باطن کو بخوبی دیکھ لیتی ہیں ۔

اس تقسیم کی طرف قرآن مجید نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے ۔(یعلمون ظاہراًمن الحیاۃ الدنیا وهم عن الآخرۃ هم غافلون[۱]) ''یہ لوگ صرف زندگانی دنیا کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت کی طرف سے بالکل غافل ہیں'' لیکن جن لوگوں کو خداوند عالم نے فہم وبصیرت عطا فرمائی ہے ان کے سامنے دنیاکا ظاہر وباطن ایک دوسرے سے مشتبہ نہیں ہوتا ہے ۔البتہ جب خداوند عالم کسی سے غضبناک ہوجاتا ہے تو اس کی بصیرت سلب کرلیتا ہے اور پھر اسکے سامنے دنیا کا ظاہر وباطن مخلوط ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ اسکے ظاہری خول اور اسکی واقعی حقیقت کے درمیان تمیز نہیں کرپاتا لہٰذا دنیا کی ظاہری رنگینیاں اسے دھوکہ دیدیتی ہیں اور وہ بھی اس دنیا کوفریب خوردہ نگاہ سے دیکھتا ہے جسکی طرف قرآن مجید نے یوں اشارہ کیا ہے: (زُیّن للذین کفروا الحیاۃ الدنیا[۲]) ''اصل میں کافروں کے لئے زندگانی دنیا آراستہ کردی گئی ہے'' لہٰذا کیونکہ وہ اسکے پرفریب ظاہر کو دیکھتا ہے اس لئے اسکی نگاہوں میں دنیا

[۱] سورۂ روم آیت ۷۔
[۲] سورۂ بقرہ آیت۲۱۲۔

سجی رہتی ہے لیکن اگر اسکے باطن پر نگاہ رکھی جائے تو پھر کبھی اسکی رنگینی نظر نہ آئے گی۔ مختصر یہ کہ زندگانی دنیا کے دو روپ اور دو چہرے ہوتے ہیں:

ا۔باطنی حقیقت (اصلی چہرہ)

ب۔ظاہری چہرہ: أ۔دنیا کا باطنی چہرہ (اصل حقیقت)

جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں کہ دنیاکی واقعی شکل و صورت صرف اہل بصیرت کو دکھائی دیتی ہے اوراسکی اس شکل میں کسی قسم کا دھوکہ اور فریب نہیں ہے بلکہ وہ منزل عبرت و نصیحت ہے جیسا کہ قرآن کریم نے بھی دنیا کے اس پہلو کی نہایت دقیق تعریف و توصیف فرمائی ہے جسکے بعض نمونے ملاحظہ فرمائیں: ا۔دنیا ایک پونجی ہے :ارشاد الٰہی ہے: (وماالحیاۃ الدنیا فی الآخرۃ الامتاع[1]) ''اور آخرت میں زندگانی دنیا کی حقیقت مختصر پونجی کے علاوہ اور کیا ہے'' متاع ،وقتی لذت کو کہا جاتا ہے جبکہ اس کے بالمقابل آخرت کی لذتیں دائمی اور باقی رہنے والی ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: (فما متاع الحیاۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل[2]) ''پس آخرت میں اس متاع زندگانی دنیا کی حقیقت بہت قلیل ہے''

۲۔دنیا عارضی ہے ۔ارشاد الٰہی ہے: (تریدون عَرَضَ الدنیاواللہ یرید الآخرۃ[3]) ''تم لوگ صرف مال دنیا چاہتے ہو جبکہ اللہ آخرت چاہتا ہے'' یا ارشا دہے: (تبتغون عَرَضَ الحیاۃ الدنیا فعند اللہ مغانم کثیرۃ[4]) ''اس طرح تم زندگانی دنیا کا چند روزہ سرمایہ چاہتے ہو اور خدا کے پاس بکثرت فوائد پائے جاتے ہیں''(یأخذون عَرَضَ ھذا الادنیٰ و یقولون سَیُغْفَرلنا[5]) ''لیکن وہ دنیا کا ہر مال لیتے رہے اور یہ کہتے رہے کہ عنقریب ہمیں بخش دیا جائے گا'' عارضی چیز اسکو کہتے ہیں جو بہت جلد تبدیل ہوکر ختم ہوجائے اور کیونکہ

---

[1] سورۂ رعد آیت ۲۶۔
[2] سورۂ توبہ آیت ۳۸۔
[3] سورۂ انفال آیت ۶۷۔
[4] سورۂ نساء آیت ۹۴۔
[5] سورۂ اعراف آیت ۱۶۹۔

دنیا کی لذتیں تبدیل ہوکر ختم ہو جاتی ہیں اور کسی کے لئے بھی باقی رہنے والی نہیں ہیں اسکے باوجود بھی یہ لوگوں کو بری طرح فریب میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

گویا دنیا کی دو صفتیں ہیں: ۱۔وہ صفت جس سے انسان زاہد دنیا بن جاتا ہے ۔

۲۔وہ صفت جو انسان کو فریب میں مبتلا کر دیتی ہے ۔ (جس سے انسان دھوکہ کھاجاتاہے)وہ صفت جس کی بنا پر انسان زاہد بن جاتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ دنیا عارضی، زوال پذیر اور بہت جلد ختم ہوجانے والی ہے ۔ (لہٰذا وہ اس سے دل نہیں لگاتا)لیکن اسکا پر فریب رخ یہ ہے کہ یہ نرم لقمہ ہے نچلی سطح پر جلد ہاتھ آجاتی ہے ۔اور کیونکہ لوگ عام طورسے عجلت پسند ہوتے ہیں لہٰذاوہ جلد ہاتھ آنے والی چھٹپٹی چیزوں کو دیر سےملنے والی دائمی نعمتوں پر ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: (لوکان عرضاً قریباً وسفراً قاصداً لا تبعوک[1]) ''پیغمبر،اگر کوئی قریبی فائدہ یا آسان سفر ہوتا تو یہ ضرور تمہارا اتباع کرتے'' اس طرح انسان کی طبیعت اور فطرت میں ہی جلدبازی پائی جاتی ہے ۔

۳۔دنیا دھوکہ اور فریب کا اڈہ ہے ۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: (فلا تغرّنّکم الحیاۃ الدنیا ولایغرّنّکم باللّٰہ الغرور[2]) ''لہٰذا تمہیں زندگانی دنیا دھوکہ میں نہ ڈال دے اور خبردار کوئی دھوکہ دینے والا بھی تمہیں دھوکہ نہ دے سکے''

۴۔اور دنیا متاع غرور ہے: یہ دو الفاظ کی ترکیب ہے جن کو قرآن مجید نے دنیا کے لئے الگ الگ اور ایک ساتھ دونوں طرح استعمال کیا ہے ۔جیسا کہ ارشاد ہے: (وما الحیاۃ الدنیا الامتاع الغرور[1]) ''اور زندگانی دنیا تو صرف دھوکہ کا سرمایہ ہے'' اس فریب کی اصل بنیاد دنیا کی وقتی اور ختم ہوجانے والی پونجی ہے ۔

---

[1] سورۂ توبہ آیت ۴۲۔
[2] سورۂ لقمان آیت ۳۳سورۂ فاطر آیت ۵۔

دنیا اورآخرت کا تقابلی جائزہ

اگر ہم قرآن مجید پر ایک اور نظر ڈالیں تو اسکے بیان کردہ اوصاف کی روشنی میں دنیا و آخرت کا موازنہ کرنا بہت آسان ہے،جیسا کہ ہم عرض کرچکے ہیں کے قرآن مجید کی نگاہ میں یہ دنیا وقتی ،بہت جلد قابل زوال اور ایسی پونجی ہے جو کسی کے لئے دائمی (اور باقی رہنے والی)نہیں ہے لیکن آخرت سکون واطمینان کی ایک دائمی جگہ ہے ۔جیسا کہ ارشادالٰہی ہے: (یاقوم انماھذہ الحیاۃ الدنیامتاع وان الآخرۃ ھی دارالقرار[۲]) ''قوم والو،یاد رکھوکہ یہ حیات دنیا صرف چند روزہ لذت ہےاور ہمیشہ رہنے کا گھر صرف آخرت کا گھر ہے'' دنیا ایک کھیل تماشہ ہے لیکن آخرت دائمی حیات کا گھر ہےاور وہی حقیقی زندگی ہے اور وہ زندگی کھیل تما شہ نہیں ہے ۔جیسا کہ ارشادالٰہی ہے: (وماھذہ الحیاۃالدنیاالالھوولعب وان الدارالآخرۃ لھی الحیوان لوکانوایعلمون[۳]) ''اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشہ کے سوا کچھ نہیں اور اگر یہ لوگ سمجھیں بوجھیں تو اس میں شک نہیں کہ ابدی زندگی (کی جگہ)توبس آخرت کا گھر ہے''

کلام امیرالمومنین ؑمیں دنیاکا تذکرہ

مولائے کائنات ؑنے اپنے اقوال میں دنیا کی حقیقت کو بالکل آشکار کر دیا ہےاور اس کے چہرہ سے دھوکہ اور فریب کی نقاب نوچ لی ہے جس کے بعد ہر شخص دنیا کی اصلی شکل و صورت کو بآسانی پہچان سکتا ہے۔ لہٰذا دنیا کے بارے میں آپ کے چند اقوال ملاحظہ فرمائیں: ۱۔(واللّٰہ مادنیاکم عندی الاکسَفْرٍعلیٰ منھل حلّوا،اذصاح بھم سائقھم فارتحلوا،ولالذاذتُھافی عینی الاکحمیم أشربہ غساقا،وعلقم أتجرع بہ زُعافا،وسمّ أفعاۃٍ دِھاقاً،وقلادۃٍ من نار[۴]) ''خدا کی قسم تمہاری دنیا میرے نزدیک ان مسافروں کی طرح ہے جو کسی چشمہ پر اترے ہوں،اور جیسے ہی قافلہ سالار آواز لگائے وہ چل پڑیں،اور اسکی لذتیں میری نگاہ میں اس گرم اور گندے پانی کی طرح ہیں جسے مجبوراً پینا پڑے اور وہ کڑوی چیز ہے جسے مردنی کی حالت میں زبردستی گلے سے نیچے اتارا جائے اور وہ اژدہے کے زہر سے بھرا ہوا

---

[۱] سورۂ آل عمران آیت ۱۸۵سورۂ حدید آیت ۲۰ ۔
[۲] سورۂ غافر آیت۳۹۔
[۳] سورۂ عنکبوت آیت ۶۴۔
[۴] بحارالانوار ج۷۷ص۳۵۲۔

پیالہ اور آگ کا طوق ہے‘‘اس دنیا کا جو رخ لوگوں کو دکھائی دیتا ہے وہ اسی بھرے ہوئے چشمہ کی طرح ہے جس پر قافلہ ٹھہرا ہو ’’ سفر علی منھل حلوا‘‘اور یہ اسکا وہی ظاہری رخ ہے جس کے اوپر وہ ایک دوسرے کو مرنے اور مارنے کو تیار رہتے ہیں ۔جبکہ مولائے کائناتؑ نے اس کو زود گذر قرار دیا ہے جو کہ دنیا کا واقعی چہرہ ہے: (اذصاح بہم سائقھم فارتحلوا)’’جیسے ہی قافلہ سالار آواز لگائے وہ چل پڑیں‘‘یہی وجہ ہے کہ دنیا کی جن لذتوں کیلئے لوگ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ مولائے کائناتؑ کی نگاہ میں گرم، بدبوداراور سانپ کے زہر کے پیالہ کی طرح ہے ۔’’جب معاویہ نے جناب ضرار بن حمزہ شیبانی(رح) سے امیر المومنینؑ کے اوصاف و خصائل و معلوم کئے تو آپ نے کہا کہ بعض اوقات میں نے خود دیکھا ہے کہ آپ رات کی تاریکی میں محراب عبادت میں کھڑے ہیں اور اپنی ریش مبارک ہاتھ میں لئے ہوئے ایک بیمار کی طرح تڑپ رہے ہیں اور ایک غمزدہ کی طرح گریہ کررہے ہیں اس وقت آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری رہتے ہیں:

(یا دنیا الیک عنی،أبی تعرّضتِ؟أم الیّ تشوّقتِ؟ھیھات!!غرّی غیری لا حاجۃ لی فیکِ،قد طلقتک ثلاثاً،لارجعۃ فیھا :فعیشک قصیر،وخطرک کبیر،واملک حقیر،آہ من قلۃالزاد،وطول الطریق[1])’’اے دنیا مجھ سے دور ہوجا کیا تو میرے سامنے بن ٹھن کر آئی ہے اور کیا واقعاً میری مشتاق بن کر آئی ہے،بہت بعید ہے جا میرے علاوہ کسی اور کو دھوکا دینا مجھے تیری کوئی ضرورت نہیں ہے ۔میں تجھے تین بار طلاق دے چکا ہوں جسکے بعد رجوع ممکن نہیں ہے تیری زندگی بہت مختصر، تیری حیثیت بہت معمولی،تیری آرزوئیں حقیر ہیں ،آہ، زاد راہ کس قدر کم اور راستہ کتنا طولانی ہے‘‘آپ نے دنیا کے ان تینوں حقائق کو اس سے فریب کھانے والے شخص کے لئے واضح کردیا ہے کہ اسکی زندگی بہت مختصر اسکے خطرات زیادہ اور اسکی آرزوئیں حقیر ہیں ۔اس بارے میں آپ کے یہ ارشادات بھی ہیں ۔ا۔(ألاوان الدنیا دارغرّارۃ،خدّاعۃ،تنکح فی کل یوم بعلاً،وتقتل فی کل لیلۃأھلاً،وتفرّق فی کل ساعۃ شملاً[2])’’یاد رکھو یہ دنیا بہت پر فریب

[1] نہج البلاغہ حکمت ٧٧وبحارالانوار ج٧٣ص١٢٩۔
[2] بحارالانوارج٧٧ص٣٧۴۔

گھر ہے اور بیحد دھوکے باز (عورت کے مانند ہے جو) ہر روز ایک نئے شوہر سے نکاح کرتی ہے اوہر رات اپنے گھر والوں کو ہلاک کرڈالتی ہے اور ہر ساعت ایک قوم کو متفرق کرڈالتی ہے''

۲۔ (ان اقبلت غرّت،وان أدبرت ضرّت[1]) ''اگریہ دنیا تمہاری طرف رخ کرے گی تو تمہیں فریب میں مبتلا کردیگی اور اگروہ تمہارے ہاتھ سے نکل گئی تونقصان دہ ہے''

۳۔ (الدنیا غرورحائل،وسراب زائل،وسنادمائل[2])

''دنیابدل جانے والا فریب، زائل ہوجانے والا سراب اور خم شدہ ستون ہے''

۴۔دنیا کے ظاہر وباطن کی نقشہ کشی آپ نے ان الفاظ میں کی ہے:

(مثل الد نیا مثل الحیۃ مسّھا لین،وفی جوفھا السم القاتل،یحذرھا الرجال ذووالعقول،ویھوی الیھا الصبیان بأید یھم[3]) ''یہ دنیا بالکل سانپ کی طرح ہے جو چھونے میں بہت نرم ہے مگرا سکے اندر مہلک زہر بھرا ہوا ہے اہل عقل اس سے ڈرتے رہتے ہیں اور بچے اسے ہاتھ میں اٹھانے کیلئے جھک جاتے ہیں '' اس قول میں امام نے بہت ہی حسین و جمیل انداز میں دنیا کے ظاہروباطن کو ایک دوسرے سے جدا کردیا ہے کہ اسکا ظاہر سانپ کی طرح جاذب نظراور چھونے پر بہت نرم معلوم ہوتا ہے لیکن اسکے باطن میں دھوکہ اور زوال ہی زوال ہے جیسے ایک سانپ کے منھ میں مہلک زہر بھرا رہتا ہے ۔اسی طرح اس دنیا کی طرف دیکھنے والے لوگوں کی بھی دو قسمیں ہیں: اہل عقل اور صاحبان بصیرت اس سے خائف رہتے ہیں جس طرح انہیں سانپ سے خوف محسوس ہوتاہے ۔لیکن ان کے علاوہ بقیہ لوگ اس سے اسی طرح دھوکہ کھاجاتے ہیں جس طرح زہریلے سانپ کی چمکیلی اور نرم کھال دیکھ کر بچے دھوکہ کھاتے ہیں ۔

[1] بحارالانوار ج۷۸ ص۲۳۔
[2] غررالحکم ج۱ص۱۰۹۔
[3] بحارالانوار ج۷۸ص۳۱۱۔

آپ کے ایک خطبہ کا ایک حصہ ''یہ ایک ایسا گھر ہے جو بلاؤں میں گھرا ہوا ہے اور اپنی غداری میں مشہور ہے نہ اس کے حالات کو دوام ہے اور نہ اس میں نازل ہونے والوں کے لئے سلامتی ہے ۔اسکے حالات مختلف اور اسکے طور طریقے بدلنے والے ہیں اس میں پر کیف زندگی قابل مذمت ہے اور اس میں امن وامان کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں ہے ۔اسکے باشندے وہ نشانے ہیں جن پر دنیا اپنے تیر چلاتی رہتی ہے اور اپنی مدت کے سہارے انھیں فنا کے گھاٹ اتارتی رہتی ہے ۔اے بندگان خدا یاد رکھو اس دنیا میں تم اور جو کچھ تمہارے پاس ہے سب کا وہی راستہ ہے جس پر پہلے والے چل چکے ہیں جن کی عمریں تم سے زیادہ طویل اور جن کے علاقے تم سے زیادہ آباد تھے ان کے آثار بھی دور دور تک پھیلے ہوئے تھے لیکن اب ان کی آوازیں دب گئیں ہیں ان کی ہوائیں اکھڑگئیں ہیں ان کے جسم بوسیدہ ہوگئے ہیں ۔ان کے مکانات خالی ہوگئے ہیں اور ان کے آثار مٹ چکے ہیں وہ مستحکم قلعوں اور بچھی ہوئی مسندوں کو پتھروں اور چنی ہوئی سلوں اور زمین کے اندر قبروں میں تبدیل کر چکے ہیں

جن کے صحنوں کی بنیاد تباہی پر قائم ہے اور جن کی عمارت مٹی سے مضبوط کی گئی ہے ۔ان قبروں کی جگہیں تو قریب قریب ہیں لیکن ان کے رہنے والے سب ایک دوسرے سے اجنبی اور بیگانہ ہیں ایسے لوگوں کے درمیان ہیں جو بوکھلائے ہوئے ہیں اور یہاں کے کاموں سے فارغ ہوکر وہاں کی فکر میں مشغول ہوگئے ہیں ۔نہ اپنے وطن سے کوئی انس رکھتے ہیں اور نہ اپنے ہمسایوں سے کوئی ربط رکھتے ہیں ۔حالانکہ بالکل قرب وجوار اور نزدیک ترین دیار میں ہیں ۔ اور ظاہر ہے اب ملاقات کا کیا امکان ہے جبکہ بوسیدگی نے انہیں اپنے سینہ سے دبا کر پیس ڈالا ہے اور پتھروں اور مٹی نے انہیں کھا کر برابر کردیا ہے اور گویا کہ اب تم بھی وہیں پہونچ گئے ہو جہاں وہ پہونچ چکے ہیں اور تمہیں بھی اسی قبر نے گروی رکھ لیا ہے اور اسی امانت گاہ نے جکڑلیا ہے ۔ذرا سوچو اس وقت کیا ہوگا جب تمہارے تمام معاملات آخری حد تک پہنچ جائیں گے اور دوبارہ قبروں سے نکال لیا جائے گا اس وقت ہر نفس اپنے اعمال کا خود محاسبہ کرے گا اور سب کو مالک برحق کی طرف پلٹا دیا جائے گا اور کسی پر کوئی افترا پردازی کام آنے والی نہ ہوگی[1]۔سید رضی

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۲۲۶۔

نے نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے کہ حضرت امیر المومنینؑ نے شریح بن حارث سے فرمایا: (بلغنی انک ابتعت داراً بثمانین دیناراً،وکتبت لھا کتاباً، وأشھدت فیہ شھوداً ؟!۔) مجھے اطلاع ملی ہے کہ تم نے اسی (۸۰) دینا ر میں ایک گھر خریدا ہے اور ا سکے لئے باقاعدہ ایک بیع نامہ لکھ کر لوگوں کی گواہی بھی درج کی ہے ۔تو شریح نے عرض کی :اے امیر المومنینؑ ۔جی ہاں: ایسا ہی ہے ۔تو آپ نے ان کی طرف غصہ بھری نظر وں سے دیکھ کرکہا ۔اے شریح عنقریب تمہارے پاس ایسا شخص آنے والا ہے جو نہ تمہارے اس بیع نامہ کو دیکھے گا اور نہ گواہوں کے بارے میں تم سے کچھ سوال کرے گا اور وہ تمہیں اس گھر سے نکال کر تن تنہا تمہاری قبر کے حوالے کردیگا لہٰذا ۔اے شریح ۔کہیں ایسا نہ ہوکہ تم نے اس گھر کو اپنے مال سے نہ خریدا ہو اور ناجائز طریقے سے اسکے دام ادا کئے ہوں ۔اگر ایسا ہوا تو تم دنیا اور آخرت دونوں جگہ گھاٹے میں ہو ۔کاش تم یہ گھر خریدنے سے پہلے میرے پاس آجاتے تو میں تمہارے لئے ایک دستاویز تحریر کردیتا تو تم ایک درہم میں بھی یہ گھر نہ خریدتے ۔

میں اسکی دستاویز اس طرح لکھتا : یہ وہ مکان ہے جسے ایک بندۂ ذلیل نے اس مرنے والے سے خریدا ہے جسے کوچ کے لئے آمادہ کردیا گیا ہے ۔یہ مکان پر فریب دنیا میں واقع ہے جہاں فنا ہونے والوں کی بستی ہے اور ہلاک ہونے والوں کا علاقہ ہے ۔اس مکان کے حدود اربعہ یہ ہیں ۔ایک حد اسباب آفات کی طرف ہے اور دوسری اسباب مصائب سے ملتی ہے تیسری حد ہلاک کردینے والی خواہشات کی طرف ہے اور چوتھی گمراہ کرنے والے شیطان کی طرف اور اسی طرف سے گھر کا دروازہ کھلتا ہے ۔اس مکان کو امیدوں کے فریب خوردہ نے اجل کے راہ گیر سے خریدا ہے جس کے ذریعہ قناعت کی عزت سے نکل کر طلب وخواہش کی ذلت میں داخل ہوگیا ہے ۔اب اگر اس خریدار کو اس سودے میں کوئی خسارہ ہوتو یہ اس ذات کی ذمہ داری ہے جو بادشاہوں کے جسموں کو تہ وبالا کرنے والا، جابروں کی جان لینے والا،فرعونوں کی سلطنت کوتباہ کردینے والا،کسریٰ وقیصر تبع وحمیر اور زیادہ سے زیادہ مال جمع کرنے والوں، مستحکم عمارتیں بناکر انھیں سجانے والوں،ان میں بہترین فرش بچھانے والوں اور اولاد کے خیال سے ذخیرہ کرنے والوں اور جاگیریں بنانے والوں کو فنا کے گھاٹ اتار دینے والا ہے ۔کہ ان سب کو قیامت کے میدان حساب اور

منزل ثواب و عذاب میں حاضر کردے جب حق وباطل کا حتمی فیصلہ ہوگا اور اہل باطل یقینا خسارہ میں ہونگے۔اس سودے پر اس عقل نے گواہی دی ہے جو خواہشات کی قید سے آزاد اور دنیا کی وابستگیوں سے محفوظ ہے[1]''دنیا کے بارے میںآپ نے یہ بھی فرمایا ہے: یاد رکھو:اس دنیا کا سرچشمہ گندہ اور اسکا گھاٹ گندھلا ہے،اسکا منظر خوبصورت دکھائی دیتا ہے لیکن اندر کے حالات انتہائی درجہ خطرناک ہیں،یہ ایک فنا ہوجانے والا فریب، بجھ جانے والی روشنی،ڈھل جانے والا سایہ اور ایک گر جانے والا ستون ہے ۔جب اس سے نفرت کرنے والا مانوس ہوجاتا ہے اور اسے برا سمجھنے والا مطمئن ہوجاتا ہے تو یہ اچانک اپنے پیروں کو پٹکنے لگتی ہے اور عاشق کو اپنے جال میں گرفتار کرلیتی ہے اور پھر اپنے تیروں کا نشانہ بنالیتی ہے انسان کی گردن میں موت کا پھندہ ڈال دیتی ہے اور اسے کھینچ کر قبر کی تنگی اور وحشت کی منزل تک لے جاتی ہے جہاں وہ اپنا ٹھکانہ دیکھ لیتا ہے اور اپنے اعمال کا معاوضہ حاصل کرلیتا ہے اور یوں ہی یہ سلسلہ نسلوں میں چلتا رہتا ہے کہ اولاد بزرگوں کی جگہ پر آجاتی ہے نہ موت چیرہ دستیوں سے بازآتی ہے اور نہ آنے والے افراد گناہوں سے باز آتے ہیں پرانے لوگوں کے نقش قدم پر چلتے رہتے ہیں اور تیزی کے ساتھ اپنی آخری منزل انتہاء وفنا کی طرف بڑھتے رہتے ہیں[2]۔

دنیا کے بارے میں آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے'': میں اس دار دنیاکے بارے میں کیا بیان کروں جسکی ابتداء رنج وغم اور انتہا فنا ونابودی ہے اسکے حلال میں حساب ہے اور حرام میں عذاب،جو اس میں غنی ہوجائے وہ آزمائشوں میں مبتلا ہوجائے ۔ اور جو فقیر ہوجائے وہ رنجیدہ و افسردہ ہوجائے ۔جو اسکی طرف دوڑلگائے اسکے ہاتھ سے نکل جائے اور جو منھ پھیر کر بیٹھ رہے اسکے پاس حاضر ہوجائے جو اسکو ذریعہ بناکر آگے دیکھے اسے بینابنادے اور جو اسے منظور نظر بنالے اسے اندھا بنادے[3]''

اپنے دور خلافت سے پہلے آپ نے جناب سلمان فارسیؓ کو اپنے ایک خط میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا ۔اما بعد :اس دنیا کی مثال صرف اس سانپ جیسی ہے جو چھونے میں انتہائی نرم ہوتا ہے لیکن اسکا زہر انتہائی قاتل ہوتا ہے اس میں جو چیز اچھی لگے اس

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب ٣۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ٨٣۔
[3] نہج البلاغہ خطبہ ٨٢۔

سے بھی کنارہ کشی اختیار کرو ۔کہ اس میں سے ساتھ جانے والا بہت کم ہے ۔اسکے ہم وغم کو اپنے سے دور رکھو کہ اس سے جدا ہونا یقینی ہے اور اسکے حالات بدلتے ہی رہتے ہیں ۔اس سے جس وقت زیادہ انس محسوس کرو اس وقت زیادہ ہوشیار رہو کہ اسکا ساتھی جب بھی کسی خوشی کی طرف سے مطمئن ہوجاتا ہے تو یہ اسے کسی ناخوشگواری کے حوالے کردیتی ہے اور انس سے نکال کر وحشت کے حالات تک پہونچا دیتی ہے ۔

والسلام[1]''

دنیا کے بارے میں آپ نے یہ بھی فرمایاہے:آگاہ ہوجاؤ دنیا جارہی ہے اور اس نے اپنی رخصت کا اعلان کردیا ہے اور اسکی جانی پہچانی چیزیں بھی اجنبی ہوگئی ہیں وہ تیزی سے منھ پھیر رہی ہے اور اپنے باشندوں کو فنا کی طرف لی جارہی ہے اور اپنے ہمسایوں کو موت کی طرف ڈھکیل رہی ہے اسکی شیرینی تلخ ہوچکی ہے اور اسکی صفائی ہوچکی ہے اب اس میں صرف اتنا ہی پانی باقی رہ گیا ہے جو،تہ میں بچاہوا ہے اور وہ نپا تلا گھونٹ رہ گیا ہے جسے پیاسا پی بھی لے تو اسکی پیاس نہیں بجھ سکتی ہے لہٰذا بندگان خدا اب اس دنیا سے کوچ کرنے کا ارادہ کرلو جسکے رہنے والوں کا مقدر زوال ہے اور خبردار: تم پر خواہشات غالب نہ آنے پائیں اور اس مختصر مدت کو طویل نہ سمجھ لینا[2]''

دنیا کے بارے میں آپؑنے یہ بھی فرمایاہے: میں تم لوگوں کو دنیا سے ہوشیار کر رہا ہوں کہ یہ شیریں اور شاداب ہے لیکن خواہشات میں گھری ہوئی ہے اپنی جلد مل جانے والی نعمتوں کی بنا پر محبوب بن جاتی ہے اور تھوڑی سی زینت سے خوبصورت بن جاتی ہے یہ امیدوں سے آراستہ ہے اور دھوکہ سے مزین ہے ۔نہ اس کی خوشی دائمی ہے اور نہ اس کی مصیبت سے کوئی محفوظ رہنے والا ہے یہ دھوکہ باز ،نقصان رساں ،بدل جانے والی ،فنا ہو جانے والی ،زوال پذیراور ہلاک ہو جانے والی ہے ۔یہ لوگوں کو کھا بھی جاتی ہے اور

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب۶۸۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۵۲۔

مٹا بھی دیتی ہے ۔جب اسکی طرف رغبت رکھنے والوں اور اس سے خوش ہو جانے والوں کی خواہشات انتہاء کو پہونچ جاتی ہے تو یہ بالکل پروردگار کے اس ارشاد کے مطابق ہو جاتی ہے: (کماء أنزلناه من السماء فاختلط به نبات الأرض فأصبح هشیماً تذروه الریاح وکان اللہ علیٰ کل شیء مقتدرا[1]) ''یعنی دنیا کی مثال اس پانی کے جیسی ہے جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا اور اسکے ذریعہ زمین کے سبزہ مخلوط (ہوکر روئیدہ) ہوئے وہ سبزہ سوکھ کر ایسا تنکا ہوگیا جسے ہوائیں اڑالے جاتی ہیں اور اللہ ہر شئے پر قدرت رکھنے والا ہے ''اس دنیا میں کوئی شخص خوش نہیں ہوا ہے مگر یہ کہ اسے بعد میں آنسو بہانا پڑے اور کوئی اس کی خوشی کو آتے نہیں دیکھتا ہے مگر یہ کہ وہ مصیبت میں ڈال کر پیٹھ دکھلا دیتی ہے اور کہیں راحت وآرام کی ہلکی بارش نہیں ہوتی ہے مگر یہ کہ بلاؤں کا دو گڑا گرنے لگتا ہے ۔اس کی شان ہی یہ ہے کہ اگر صبح کو کسی طرف سے بدلہ لینے آتی ہے تو شام ہوتے ہوتے انجان بن جاتی ہے اور اگر ایک طرف سے شیریں اور خوش گوار نظر آتی ہے تو دوسرے رُخ سے تلخ اور بلا خیز ہوتی ہے ۔

کوئی انسان اس کی تازگی سے اپنی خواہش پوری نہیں کرتا ہے مگر یہ کہ اس کے پے درپے مصائب کی بنا پر رنج وتعب کا شکار ہو جاتا ہے اور کوئی شخص شام کو امن وامان کے پروں پر نہیں رہتا ہے مگر یہ کہ صبح ہوتے ہوتے خوف کے بالوں پر لاد دیا جاتا ہے ۔یہ دنیا دھوکہ باز ہے اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب دھوکہ ہے ۔یہ فانی ہے اور اس میں جو کچھ ہے سب فنا ہونے والاہے ۔اس کے کسی زادراہ میں کوئی خیر نہیں ہے سوائے تقویٰ کے ۔ اس میں سے جوکم حاصل کرتا ہے اسی کو راحت زیادہ نصیب ہوتی ہے اور جو زیادہ کے چکّر میں پڑجاتا ہے اس کے مہلکات بھی زیادہ ہوجاتے ہیں اور یہ بہت جلد اس سے الگ ہوجاتی ہے ۔ کتنے اس پراعتبار کرنے والے ہیں جنہیں اچانک مصیبتوں میں ڈال دیا گیا اور کتنے اس پر اطمینان کرنے والے ہیں جنہیں ہلاک کردیا گیا اور کتنے صاحبان حیثیت تھے جنہیں ذلیل بنا دیاگیا اور کتنے اکڑنے والے تھے جنہیں حقارت کے ساتھ پلٹا دیاگیا ۔اس کی بادشاہی پلٹا کھانے والی ۔اس کا عیش مکدر ۔اس کا شیریں شور ۔اس کا میٹھا کڑوا ۔اس کی غذاز ہر آلود اور اس کے اسباب سب بوسیدہ ہیں

[1] سورۂ کہف آیت۴۵۔

۔اس کا زندہ معرض ہلاکت میں ہے اور اس کا صحت مند بیماریوں کی زد پر ہے ۔اس کا ملک چھننے والا ہے اور اس کا صاحب عزت مغلوب ہونے والا ہے ۔اس کا مالدار بد بختیوں کا شکار ہونے والا ہے اور اس کا ہمسایہ لُٹنے والا ہے ۔کیا تم انھیں کے گھر وں میں نہیں ہو جو تم سے پہلے طویل عمر پائید ار آثار اور دوررس امیدوں والے تھے ۔بے پناہ سامان مہیا کیا ،بڑے بڑے لشکر تیار کئے اور جی بھر کر دنیا کی پر ستش کی اور اسے ہر چیز پر مقدم رکھا لیکن اس کے بعد یوں روانہ ہو گئے کہ نہ منزل تک پہونچا نے والا زادراہ ساتھ تھا اور نہ راستہ طے کرانے والی سواری ۔کیا تم تک کوئی خبر پہونچی ہے کہ اس دنیا نے ان کو بچانے کے لئے کوئی فدیہ پیش کیا ہو یا ان کی کوئی مدد کی ہو یا ان کے ساتھ اچھا وقت گزارا ہو ۔؟بلکہ اُس نے تو ان پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے ،آفتوں سے اُنھیں عاجز ودر ماندہ کر دیا اور لوَٹ لوَٹ کر آنے والی زحمتوں سے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور ناک کے بل اُنھیں خاک پر پچھاڑ دیا اور اپنے کُھروں سے کچُل ڈالا ،اور ان کے خلاف زمانہ کے حوادث کا ہاتھ بٹایا ۔

تم نے تو دیکھا ہے کہ جو ذرا دُنیا کی طرف جھکا اور اسے اختیار کیا اور اس سے لپٹا ،تو اس نے (اپنے تیور بدل کر ان سے کیسی)ا جنبیت اختیار کرلی ۔یہاں تک کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس سے جُدا ہو کر چل دئیے ،اور اس نے انھیں بھُوک کے سوا کچھ زادِراہ نہ دیا ،اور ایک تنگ جگہ کے سوا کوئی ٹھہر نے کا سامان نہ کیا ،اور سوا گھُپ اندھیرے کے کوئی روشنی نہ دی اور ندامت کے سوا کوئی نتیجہ نہ دیا ،تو کیا تم اسی دنیا کو ترجیح دیتے ہو،یا اسی پر مطمئن ہو گئے ہو یا اسی پر مرے جا رہے ہو ؟جو دنیا پر بے اعتماد نہ رہے اور اس میں بے خوف و خطر ہو کر رہے اس کے لئے یہ بہت برا گھر ہے ۔جان لو اور حقیقت میں تم جانتے ہی ہو ،کہ (ایک نہ ایک دِن)تمھیں دنیا کو چھوڑنا ہے ،اور یہاں سے کوچ کرنا ہے ان لوگوں سے عبرت حاصل کرو جو کہا کرتے تھے کہ ''ہم سے زیادہ قوت و طاقت میں کون ہے ۔''انھیں لاد کر قبروں تک پہونچایا گیا مگر اس طرح نہیں کہ انھیں سوار سمجھا جائے انھیں قبروں میں اتار دیا گیا ،مگر وہ مہان نہیں کہلاتے پتھروں سے اُن کی قبریں چن دی گئیں ،اور خاک کے کفن ان پر ڈال دئے گئے اور گلی سڑی ہڈیوں کو ان کا ہمسایہ بنا دیا گیا ہے ۔وہ ایسے ہمسایہ ہیں جو پکارنے والے کو جواب نہیں دیتے ہیں اور نہ زیادتیوں کو روک سکتے ہیں اور نہ رونے

دھونے والوں کی پروا کرتے ہیں ۔اگر بادل (جھوم کر)ان پر برسیں،تو خوش نہیں ہوتے اور قحط آئے تو ان پر مایوسی نہیں چھا جاتی ۔وہ ایک جگہ ہیں،مگر الگ الگ،وہ آپس میں ہمسایہ ہیں مگر دور دور،پاس پاس ہیں مگر میل ملاقات نہیں،قریب قریب ہیں مگر ایک دوسرے کے پاس نہیں پھٹکتے،وہ بردبار بنے ہوئے بے خبر پڑے ہیں،ان کے بغض و عناد ختم ہوگئے اور کینے مٹ گئے ۔نہ ان سے کسی ضرر کا اندیشہ ہے،نہ کسی تکلیف کے دور کرنے کی توقع ہے انھوں نے زمین کے اوپر کا حصہ اندر کے حصہ سے اور کشادگی اور وسعت تنگی سے،اور گھر بار پردیس سے اور روشنی اندھیرے سے بدل لی ہے اور جس طرح ننگے پیر اور ننگے بدن پیدا ہوئے تھے،ویسے ہی زمین میں (پیوند خاک)ہوگئے اور اس دنیا سے صرف عمل لے کر ہمیشہ کی زندگی اور سدا رہنے والے گھر کی طرف کوچ کر گئے ۔جیسا کہ خداوندقدوس نے فرمایا ہے : (کما بدأنا أول خلق نعیدہ وعداً علینا انا کنا فاعلین[1]) ''جس طرح نے ہم نے مخلوقات کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اسی طرح دوبارہ پیدا کریں گے ۔

اس وعدہ کا پورا کرنا ہمارے ذمہ ہے اور ہم اسے ضرور پورا کرکے رہیں گے'' آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:(واُحذّرکم الدنیا فانھامنزل قُلعۃ،ولیست بدار نُجعۃ،قد تزیّنت بغرورھا، وغرّت بزینتھا،دارھانت علیٰ ربھا،فخلط حلالھا بحرامھا،وخیرھابشرھا، وحیاتھا بموتھا،وحلوھا بمرّھا،لم یصفّھا اللّٰہ تعالیٰ لاولیائہ،ولم یَضِن بھا علیٰ أعدائہ ۔[2]) ''میں تمہیں اس دنیا سے ہوشیار کر رہا ہوں کہ یہ کوچ کی جگہ ہے ۔آب ودانہ کی منزل نہیں ہے ۔یہ اپنے دھوکے ہی سے آراستہ ہوگئی ہے اور اپنی آرائش ہی سے دھوکا دیتی ہے ۔اس کا گھر پروردگار کی نگاہ میں بالکل بے ارزش ہے اسی لئے اس نے اس کے حلال کے ساتھ حرام ۔خیر کے ساتھ شر،زندگی کے ساتھ موت اور شیریں کے ساتھ تلخ کو رکھ دیاہے اور نہ اسے اپنے اولیاء کے لئے مخصوص کیا ہے اور نہ اپنے دشمنوں کو اس سے محروم رکھا ہے ۔اس کا خیر بہت کم ہے اور اس کا شر ہر وقت حاضر ہے ۔اس کا جمع کیا ہوا ختم ہوجانے والا ہے اور اس کا ملک چھن جانے والا ہے اور اس کے آباد کو ایک دن خراب ہوجانا ہے ۔بھلا اُس گھر میں کیا خوبی ہے جوکمزور عمارت کی طرح گر جائے اور

[1] نہج البلاغہ خطبہ ١١١،آیت ١٠۴ ازسورۂ انبیاء۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ١١٣۔

اس عمر میں کیا بھلائی ہے جو زاد راہ کی طرح ختم ہوجائے اور اس زندگی میں کیا حسن ہے جو چلتے پھرتے تمام ہوجائے ۔ دیکھو اپنے مطلوبہ امور میں فرائض الٰہیہ کو بھی شامل کرلو اور اسی سے اس کے حق کے ادا کرنے کی توفیق کا مطالبہ کرو اپنے کانوں کو موت کی آواز سنادو قبل اسکے کہ تمہیں بلالیا جائے'' دنیا کے سلسلہ میں ہی فرماتے ہیں: (۔عباد اللّٰہ أوصیکم بالرفض لھذہ الدنیا التارکۃ لکم وان لم تحبوا ترکھا،والمبلیۃ لأجسامکم وان کنتم تحبون تجدیدھا،فانما مثلکم و مثلھا کسَفرٍ سلکوا سبیلاً فکأنھم قد قطعوہ[1] ۔) ''بندگانِ خدا !میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ اس دنیا کو چھوڑ دو جو تمہیں بہر حال چھوڑنے والی ہے چاہے تم اسکی جدائی کو پسند نہ کرو۔وہ تمہارے جسم کو بہرحال بوسیدہ کردے گی تم لاکھ اس کی تازگی کی خواہش کرو ۔تمہاری اور اسکی مثال ان مسافروں جیسی ہے جو کسی راستہ پر چلے اور گویا کہ منزل تک پہونچ گئے ۔کسی نشان راہ کا ارادہ کیا اور گویا کہ اسے حاصل کرلیا اور کتنا تھوڑا وقفہ ہوتا ہے اس گھوڑا دوڑانے والے کے لئے جو دوڑاتے ہی مقصد تک پہونچ جائے ۔اس شخص کی بقا ہی کیا ہے جس کا ایک دن مقرر ہو جس سے آگے نہ بڑھ سکے اور پھر موت تیز رفتاری سے اسے ہنکا کرلے جارہی ہو یہاںتک کہ بادل ناخواستہ دنیا کو چھوڑدے ۔

خبردار دنیا کی عزت اور اسکی سربلندی میں مقابلہ نہ کرنا اور اسکی زینت و نعمت کو پسند نہ کرنا اور اسکی دشواری اور پریشانی سے رنجیدہ نہ ہونا کہ اسکی عزت و سربلندی ختم ہوجانے والی ہے اور اسکی زینت و نعمت کو زوال آجانے والا ہے اور اسکی تنگی اور سختی بہرحال ختم ہوجانے والی ہے ۔یہاں ہر مدت کی ایک انتہا ہے اور ہر زندہ کے لئے فنا ہے ۔کیا تمہارے لئے گذشتہ لوگوں کے آثار میں سامان تنبیہ نہیں ہے ؟اور کیا آباء واجداد کی داستانوں میں بصیرت وعبرت نہیں ہے ؟اگر تمہارے پاس عقل ہے!کیا تم نے یہ نہیں دیکھا ہے کہ جانے والے پلٹ کر نہیں آتے ہیں اور بعد میں آنے والے رہ نہیں جاتے ہیں ؟کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ اہل دنیا مختلف حالات میں صبح وشام کرتے ہیں ۔کوئی مردہ ہے جس پر گریہ ہو رہا ہے اور کوئی زندہ ہے تو اسے پرسہ دیا جارہا ہے ۔ ایک بستر پر کوئی غفلت میں پڑا ہوا ہے تو زمانہ اس سے غافل نہیں اور اس طرح جانے والوں کے نقش قدم پر رہ جانے والے چلے

[1] نہج البلاغہ خطبہ ٩٩۔

جارہے ہیں ۔آگاہ ہوجاؤ کہ ابھی موقع ہے اسے یاد کرو جو لذتوں کو فنا کردینے والی ۔ خواہشات کو مکدر کردینے والی اور امیدوں کو قطع کردینے والی ہے ایسے اوقات میں جب برے اعمال کا ارتکاب کر رہے ہو اور اللہ سے مدد مانگو تاکہ اس کے واجب حق کو ادا کردو اور ان نعمتوں کا شکریہ ادا کر سکو جن کا شمار کرنا ناممکن ہے'' یہ زندگانی دنیا کا پہلا رخ ہے چنانچہ دنیا کے اس چہرے کی نشاندہی کرنے کے لئے ہم نے روایات کو اسی لئے ذرا تفصیل سے ذکر کیا ہے کیونکہ اکثر لوگ دنیا کے باطن کو چھوڑ کرا سکے ظاہر پر ہی ٹھہر جاتے ہیں اور ان کی نظریں باطن تک نہیں پہونچ پاتیں ۔شاید ہمیں انہیں روایات میں ایسے اشارے مل جائیں جن کے سہارے ہم ظاہر دنیا سے نکل کر اسکے باطن تک پہونچ جائیں ۔

ب۔دنیا کاظاہری رخ(روپ)دنیاوی زندگی کا ظاہری روپ بے حد پر فریب ہے کیونکہ جسکے پاس چشم بصیرت نہ ہو اسکو یہ زندگانی دنیا دھوکے میں مبتلا کرکے اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور پھراسے آرزووں ،خواہشات ، فریب اور لہوولعب کے حوالے کردیتی ہے ۔جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: (وما الحیاۃ الدنیا الا لعب ولھو[1])''اور یہ زندگانی دنیا صرف کھیل تماشہ ہے'' (ما ھذہ الحیاۃ الدنیا الا لھوولعب[2])''اور یہ زندگانی دنیا ایک کھیل تماشے کے سوا اور کچھ نہیں ہے'' (انما الحیاۃ الدنیا لعب ولھووزینۃ وتفاخر بینکم[3])''یاد رکھو کہ زندگانی دنیا صرف ایک کھیل تماشہ ،آرائش باہمی فخرومباہات اور اموال واولاد کی کثرت کا مقابلہ ہے'' خداوند عالم نے دنیا کے جس رخ کو لہو ولعب قرار دیا ہے وہ اسکا ظاہری رخ ہے ۔

اور لہو ولعب سنجیدگی اور متانت کے مقابلہ میں بولاجاتا ہے ۔البتہ انسان اسی وقت لہو ولعب میں گرفتار ہوتا ہے کہ جب وہ دنیا کے ظاہری روپ پر نظر رکھے اور سنجیدگی و متانت سے دو ر رہے چنانچہ اگر وہ دنیا کے ظاہر کے بجائے اسکے باطن پر توجہ رکھے تو لہو ولعب (کھیل کود)سے بالکل دور ہوکر زاہد وپارسا بن جائیگا اور دنیا کے دوسرے معاملات میں الجھنے کے بجائے اسے صرف

[1] سورۂ انعام آیت ۳۲۔
[2] سورۂ عنکبوت آیت ۶۴۔
[3] سورۂ حدید آیت ۲۰۔

اپنے نفس کی فکر لاحق رہے گی۔ کیونکہ دنیا ''لُماظة''ہے ۔ مولائے کائنات فرماتے ہیں: (ألا مَن یدع ھذہ اللُّماظة[1]) ''کون ہے جو اس لماظہ کو چھوڑ دے ''لماظہ منہ کے اندر بچی ہوئی غذا کو کہا جاتا ہے حضرت علی فرماتے ہیں (أُحذّرکم الدنیا فانھا حلوۃ خضرۃ حُفّت بالشھوات[2]) ''میں تمہیں دنیا سے ڈراتا ہوں کیونکہ یہ ایسی شیرین و سرسبز ہے جو شھوتوں سے گھری ہوئی ہے''

دنیاوی زندگی کے ظاہر اور باطن کا موازنہ

قرآن کریم میں دنیاوی زندگی کے دونوں رخ (ظاہر وباطن)کا بہت ہی حسین موازنہ پیش کیا گیا ہے نمونہ کے طورپر چند آیات ملاحظہ فرمائیں: ا۔ (انّما مثل الحیاۃالدنیا کماءٍ أنزلناہ من السماء فاختلط بہ نبات الارض ممایأکل الناس والانعام حتیٰ اذا أخذت الارض زُخرفھا وازّینت وظن أھلھا أنّھم قادرون علیھا أتاھا أمرنا لیلاً أونھاراً فجعلناھا حصیداًکأن لم تغن بالامس کذٰلک نفصّل الآیات لقوم یتفکّرون[3])

''زندگانی دنیا کی مثال صرف اس بارش کی ہے جسے ہم نے آسمان سے نازل کیا پھر اس سے مل کر زمین سے نباتات برآمد ہوئیں جن کو انسان اور جانور کھاتے ہیں یہاں تک کہ جب زمین نے سبزہ زار سے اپنے کو آراستہ کرلیا اور مالکوں نے خیال کرنا شروع کردیا کہ اب ہم اس زمین کے صاحب اختیار ہیں تو اچانک ہمارا حکم رات یا دن کے وقت آگیا اور ہم نے اسے بالکل کٹا ہوا کھیت بنادیا گویا اس میں کل کچھ تھا ہی نہیں ہم اس طرح اپنی آیتوں کو مفصل طریقہ سے بیان کرتے ہیں اس قوم کے لئے جو صاحب فکر ونظر ہے

اس آیۂ کریمہ میں زندگانی دنیا ،اسکی زینت اور آرائشوں اور اسکی تباہی و بربادی اور اس میں اچانک رونما ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی موجود ہے ۔چنانچہ دنیا کو اس بارش کے پانی سے تشبیہ دی گئی ہے جو آسمان سے زمین پر برستا ہے اور اس سے زمین کے نباتات ملتے ہیں تو ان نباتات میں نموپیدا ہوتا ہے اور وہ انسانوں اور حیوانوں کی غذانیز زمین کی زینت بنتے ہیں ۔یہاں تک کہ جب زمین اپنی آرائشوں اور زینتوں سے آراستہ ہوجاتی ہے۔ تو اچانک یہ حکم الٰہی کسی بجلی، آندھی(ہوا)وغیرہ کی شکل میں اسکی طرف نازل ہوجاتا ہے اور اسے بالکل ویرانے اور خرابے میں تبدیل کردیتا ہے جیسے کل تک وہ آباد ،سرسبز و شاداب ہی نہ تھی یہ دنیا کے ظاہری اور

---

[1] بحارالانوار ج۷۳ص ۱۳۳۔
[2] بحارالانوار ج ۷۳ص۹۶۔
[3] سورۂ یونس آیت ۲۴۔

باطنی دونوں چہروں کی بہترین عکاسی ہے کہ وہ اگر چہ سر سبز و شاداب ،پُرفریب ، برانگیختہ کرنے والی پرکشش (جالب نظر)دلوں کے اندر خواہشات کو بھڑکانے والی ہے لیکن جب دل اس کی طرف سے مطمئن ہو جاتے ہیں تواچانک حکم الٰہی نازل ہوجاتا ہے اور اسے کھنڈر اور بنجر بناڈالتا ہے جس سے لوگوں کو کراہیت محسوس ہو تی ہے ۔اس سورہ کا پہلا حصہ دنیا کے ظاہری چہرہ کی وضاحت کر رہا ہے جو انسان کو دھوکہ اور فریب میں مبتلا کردیتا ہے جبکہ دوسرا حصہ وعظ و نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کا سرچشمہ ہے ۔جو کہ دنیا کا باطنی رخ ہے ۔

۲۔:(اناجعلنا ماعلیٰ الارض زینۃ لھالنبلوھم أیّھم أحسن عملاً[1])''بیشک ہم نے روئے زمین کی ہر چیز کو زینت قرار دیدیا ہے تاکہ ان لوگوں کا امتحان لیں کہ ان میں عمل کے اعتبار سے سب سے بہتر کون ہے'' دنیا یقیناًایک زینت ہے جس میں کسی قسم کے شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے اور یہی زینت و آرائش انسانی خواہشات کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے مگر ان آرائشوں کی کوکھ میں مختلف قسم کے امتحانات بلائیں اور آزمائشیں پوشیدہ رہتی ہیں جن کے اندر انسان کی تنزلی کے خطرات چھپے رہتے ہیں اور یہ بالکل اسی طرح ہیں جیسے کسی شکار کوپکڑنے کے لئے چارا ڈالا جاتا ہے ۔

۳۔(اعلموا أنما الحیاۃالدنیا لعب ولھووزینۃ وتفاخربینکم وتکاثرفی الاموال والاولادکمثل غیث أعجب الکفارنبا تہ ثم یھیج فتراہ مصفرا ثم یکونحطاماً وفی الآخرۃعذاب شدیدومغفرۃمن اللہ ورضوان وماالحیاۃ الدنیاالامتاع الغرور[2])''یاد رکھو کہ زندگانی دنیا صرف ایک کھیل تماشہ،آرائش،باہمی فخرومباہات،اور اموال واولاد کی کثرت کا مقابلہ ہے اور بس ۔جیسے کوئی بارش ہو جسکی قوت نامیہ کسان کو خوش کردے اور اسکے بعد وہ کھیتی خشک ہوجائے پھر تم اسے زرد دیکھو اور آخر میں وہ ریزہ ریزہ ہوجائے اور آخرت میں شدید عذاب بھی ہے اور مغفرت اور رضائے الٰہی بھی ہے اور زندگانی دنیا تو بس ایک دھوکہ کا سرمایہ ہے اور کچھ نہیں ہے'' دنیا کے بارے میں نگاہوں کے مختلف زاوئےدر حقیقت دنیا کو متعدد زاویوں سے دیکھنے کی وجہ سے ہی دنیا کے مختلف رخ دکھائی دیتے ہیں اسی

[1] سورۂ کہف آیت ۷۔
[2] سورۂ حدیدآیت ۲۰۔

لئے زاویہ نگاہ تبدیل ہوتے ہی دنیا کا رخ بھی تبدیل ہوجاتا ہے ورنہ دنیا تو ایک ہی حقیقت کا نام ہے مگر لوگ اسکی طرف دو رخ سے نظر کرتے ہیں ۔کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو دنیا کو پر غرور اور پرفریب نگاہوں سے دیکھتے ہیں جبکہ بعض حضرات اسے عبرت کی نگاہوں سے دیکھا کرتے ہیں ان دونوں نگاہوں کے زاویوں میں ایک انداز نگاہ سطحی ہے جو دنیا کی ظاہری سطح پر رکا رہتا ہے اور انسان کو شہوت وغرور (فریب)میں مبتلا کردیتا ہے جبکہ دوسرا انداز نظر اتنا گہرا ہے کہ وہ دنیا کے باطن کو بھی دیکھ لیتا ہے لہٰذا یہ انداز نظر رکھنے والے حضرات اس دنیا سے دوری اور زہد اختیار کرتے ہیں مختصر یہ کہ اس مسئلہ کا دارو مدار دنیا کے بارے میں ہمارے زاویہ نگاہ اور انداز فکر پر منحصر ہے ۔

لہٰذا دنیا کے معاملات کو صحیح کرنے کے لئے سب سے پہلے اسکے بارے میں انسان کا انداز فکر صحیح ہوناچاہئیے جس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ دنیا کے بارے میں اپنا زاویۂ نگاہ صحیح کرے اسکے بعد وہ اسکو جس نگاہ سے دیکھے گا اسی اعتبار سے اسکے ساتھ پیش آئے گا ۔لہٰذا جو حضرات دنیا کو پر فریب نگاہوں سے دیکھتے ہیں انہیں دنیا دھوکہ میں ڈال دیتی ہے اور خواہشات میں مبتلا کردیتی ہے اور ان کے لئے یہ زندگانی ایک کھیل تماشہ بن کر رہ جاتی ہے جسکی طرف قرآن مجید نے متوجہ کیا ہے ۔اور جو لوگ دنیا کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو وہ اپنے اعمال میں صداقت اور سنجیدگی کا خیال رکھتے ہیں اور آخرت کا واقعی احساس انہیں دنیا کے کھیل تماشہ سے دور کردیتا ہے ۔

مولائے کائناتؑ کے کلمات میں دنیا کے بارے میں موجود مختلف نگاہوں کی طرف واضح اشارے موجود ہیں جن میں سے ہم یہاں بعض کا تذکرہ کر رہے ہیں: (کا ن لی فیما مضیٰ أخ فی اللّہ،وکان یعظمہ فی عینی صغرالدنیا فی عینہ[1]) ''گذشتہ زمانہ میں میرا ایک بھائی تھا جس کی عظمت میری نگاہوں میں اس لئے تھی کہ دنیا اسکی نگاہ میں حقیر تھی'' دنیا کی توصیف میں آپ فرماتے ہیں: (ما أصف من دارأولھا عناء،وآخرھا فناء، فی حلالھا حساب،وفی حرامھا عقاب،من استغنیٰ فیھا فُتن،ومن افتقرفیھا حزن[2]) ''میں اس دنیا کے بارے میں

[1] نہج البلاغہ حکمت۲۸۹۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ۸۲۔

کیا کہوں جسکی ابتدا رنج وغم اور انتہا فنا ونیستی ہے اسکے حلال میں حساب اور حرام میں عقاب ہے۔ جو اس میں غنی ہوجاتا ہے وہ آزمائشوں میں مبتلا ہوجاتا ہے اور جو فقیر ہوجاتا ہے وہ رنجیدہ و افسردہ ہوجاتا ہے'' یہی رخ دنیا کا باطنی رخ اور وہ دقت نظر ہے جو دنیا کے باطن میں جھانک کر دیکھ لیتی ہے۔ پھر آپ فرماتے ہیں: (من ساعاھا فاتتہ،ومن قعد عنھا واتتہ[1]) ''جو اسکی طرف دوڑ لگاتا ہے اسکے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور جو منہ پھیر کر بیٹھ رہے اسکے پاس حاضر ہوجاتی ہے'' دنیا سے انسانی لگاؤ کے بارے میں خداوند عالم کی یہ ایک سنت ہے جس میں کبھی بھی خلل یا تغیر پیدا نہیں ہوسکتا ہے چنانچہ جو شخص دنیا کی طرف دوڑ لگائے گا اور اسکے لئے سعی کریگا اور اسکی قربت اختیار کریگا تو وہ اسے تھکاڈالے گی۔ اور اسکی طمع کی وجہ سے اسکی نگاہیں مسلسل اسکی طرف اٹھتی رہیں گی۔ چنانچہ اسے جب بھی کوئی رزق نصیب ہوگا تو اسے اس سے آگے کی فکر لاحق ہوجائیگی۔ اور وہ اسکے لئے کوشش شروع کردیگا مختصر یہ کہ وہ دنیا کا ساتھی ہے اور اسکے پیچھے دوڑ لگاتا رہے گا مگر اسے دنیا میں اسکا مقصد ملنے والا نہیں ہے۔

البتہ جو دنیا کی تلاش اور طلب میں صبر و حوصلہ سے کام لیکر میانہ روی اختیار کریگا تو دنیا خود اسکے قدموں میں آکر اسکی اطاعت کرے گی اور وہ بآسانی اپنی آرزو تک پہونچ جائے گا۔ پھر آپ ارشاد فرماتے ہیں: (من أبصر بھا بصّرتہ،ومن أبصر الیھا أعمتہ) ''جو اسکو ذریعہ بنا کر آگے دیکھتا رہے اسے بینا بنا دیتی ہے اور جو اسکو منظور نظر بنالیتا ہے اسے اندھا کر دیتی ہے'' سید رضی علیہ الرحمہ نے اس حدیث کی یہ تشریح فرمائی ہے: کہ اگر کوئی شخص حضرت کے اس ارشاد گرامی (من ابصر بھا بصرتہ) میں غور وفکر کرے تو عجیب و غریب معانی اور دور رس حقائق کا ادراک کرلے گا جن کی بلندیوں اور گہرائیوں کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ مولائے کائناتؑ نے دنیا کے بارے میں نگاہ کے ان دونوں زاویوں کا تذکرہ فرمایا ہے جس میں سے ایک یہ ہے ''کہ دنیا کو ذریعہ بنا کر آگے دیکھا جائے ''اس نگاہ میں عبرت پائی جاتی ہے اور دوسرا زاویہ نظر یہ ہے کہ انسان دنیا کو اپنا منظور نظر اور اصل مقصد بنالے اس نگاہ کا نتیجہ دھوکہ اور فریب ہے جسکی وضاحت کچھ اس طرح ہے: یہ دنیا کبھی انسان کے لئے ایک ایسا آئینہ بن جاتی ہے جس میں وہ مختلف

[1] نہج البلاغہ خطبہ۸۲۔

تصویریں دیکھتا ہے اور کبھی اسکی نظر خود اسی دنیا پر لگی رہتی ہے ۔چنانچہ جب دنیا انسان کے لئے ایک آئینہ کی مانند ہوتی ہے جس میں جاہلیت کے تمدن اور زمین پر فساد برپا کرنے والے ان متکبرین کا چہرہ بخوبی دیکھ لیتا ہے جن کو خدا نے اپنے عذاب کا مزہ اچھی طرح چکھادیا ۔۔۔تو یہ نگاہ،عبرت و نصیحت کی نگاہ بن جاتی ہے ۔لیکن جب دنیا انسان کے لئے کل مقصد حیات کی شکل اختیار کرلے اور وہ ہمیشہ اسی نگاہ سے اسے دیکھتا رہے تو دنیا اسے ہویٰ وہوس اور فتنوں میں مبتلا کرکے اندھا کردیتی ہے اور وہ اسے بہت ہی سر سبز و شیرین دکھائی دیتی ہے۔

اس طرح پہلی نگاہ میں عبرت کا مادہ پایا جاتا ہے اور دوسری نظر میں فتنہ وفریب کا مادہ ہوتا ہے ۔پہلی نگاہ میں فقط بصیرت پائی جاتی ہے جبکہ دوسری نگاہ میں عیاری اور دھوکہ ہے ۔انہیں جملوں کی شرح کے بارے میں ابن الحدید کا بیان ہے کہ جب میں نے حضرت کے یہ جملات پڑھے تو اسکی تشریح میں یہ دو اشعار کہے: دنیاکَ مثل الشمس تدنی الیک الضوء لکن دعوۃَ المہلکِ ان أنت أبصرت الیٰ نورھا تَغشُ و ان تُبصر بہ تدرکتمہاری دنیا کی مثال اس سورج جیسی ہے جس کی ضیاء تمہارے سامنے ہے لیکن ایک مہلک انداز میں کہ اگر تم اس (نور)کی طرف دیکھو گے تو تمہاری نگاہ میں خیرگی پیدا ہوجائیگی اور اگر اسکے ذریعہ کسی چیز کو دیکھنا چاہوگے تو اسے دیکھ لوگے ۔

اسی زاویہ نگاہ کی بنیاد پر مولائے کائنات ؑنے یہ ارشاد فرمایا ہے: (جعل لکم أسماعاً لتعی ماعناھا،أبصاراً لتجلوعن عشاھا۔۔۔وکأن الرشدَ فی احرازدنیاھا[۱])''اس نے تمہیں کان عطا کئے ہیں تاکہ ضروری باتوں کو سنیں اور آنکھیں دی ہیں تاکہ بے بصری میں روشنی عطا کریں ۔۔۔اور تمہارے لئے ماضی میں گذر جانے والوں کے آثار میں عبرتیں فراہم کردی ہیں ۔لیکن موت نے انہیں امیدوں کی تکمیل سے پہلے ہی گرفتار کرلیا۔انہوں نے بدن کی سلامتی کے وقت کوئی تیاری نہیں کی تھی اور ابتدائی اوقات میں کوئی عبرت حاصل نہیں کی تھی ۔۔۔تو کیا آجتک کبھی اقرباء نے موت کودفع کیا ہے یا فریاد کسی کے کام آئی ہے (ہرگز نہیں)مرنے والے کو

[۱] نہج البلاغہ خطبہ۸۳۔

قبرستان میں گرفتار کردیا گیا ہے اور تنگی قبر میں تنہا چھوڑدیا گیا ہے اس عالم میں کہ کیڑے مکوڑے اسکی جلد کو پارہ پارہ کررہے ہیں۔۔۔اور آندھیوں نے اسکے آثار کو مٹادیاہے اور روزگار کے حادثات نے نشانات کو محو کردیا ہے ۔تو کیا تم لوگ انہیں آباء واجداد کی اولاد نہیں ہو اور کیا انہیں کے بھائی بندے نہیں ہو کہ پھر انہیں کے نقش قدم پر چلے جارہے ہو اور انہیں کے طریقے کو اپنائے ہوئے ہو اور انہیں کے راستے پر گامزن ہو؟حقیقت یہ ہے کہ دل اپنا حصہ حاصل کرنے میں سخت ہوگئے ہیں اور راہ ہدایت سے غافل ہوگئے ہیں غلط میدانوں میں قدم جمائے ہوئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا مخاطب ان کے علاوہ کوئی اور رہے اور شاید ساری عقلمندی دنیا ہی کے جمع کر لینے میں ہے'' اس بارے میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے: (وانما الدنیا منتھیٰ بصرالاعمیٰ،لا یبصر مماوراء ھا شیئاً،والبصیر ینفذھا بصرہ،ویعلم أن الدار وراءھا،فالبصیر منھا شاخص،والأعمیٰ الیھا شاخص،والبصیر منھا متزود،والأعمیٰ لھامتزود[1]) ''یہ دنیا اندھے کی بصارت کی آخری منزل ہے جو اسکے ماوراء کچھ نہیں دیکھتا ہے جبکہ صاحب بصیرت اس سے کوچ کرنے والا ہے اور اندھا اسکی طرف کوچ کرنے والا ہے بصیر اس سے زادراہ فراہم کرنے والا ہے اور اندھا اسکے لئے زاد راہ اکٹھا کرنے والا ہے''

واقعاً اندھا وہی ہے جس کی نگاہیں دنیا سے آگے نہ دیکھ سکیں اور وہ اس سے وابستہ ہوکر رہ جائے (اس طرح دنیا اندھے کی نگاہ کی آخری منزل ہے)لیکن صاحب بصیرت وہ ہے جسکی نگاہیں ماوراء دنیا کا نظارہ کرلیتی ہیں اور اس کی عاقبت کو دیکھ لیتی ہیں آخرت اسکی نظروں کے سامنے ہے لہٰذا (اسکی نگاہیں)اور اسکے قدم اس دنیا پر نہیں ٹھہرتے بلکہ وہ اس سے عبرت حاصل کرکے آگے کی طرف کوچ کرجاتا ہے ۔ابن ابی الحدید نے اس جملہ کی مذکورہ شرح کے علاوہ ایک اور حسین تشریح کی ہے جس کے الفاظ کچھ یوں ہیں ۔دنیا اور مابعد دنیا کی مثال ایسی ہے جیسے اندھا کسی خیالی تاریکی کا تصور کرتا ہے اور یہ تصور کرتا ہے کہ وہ اس تاریکی کو محسوس کررہا ہے جبکہ وہ واقعاً اسکا احساس نہیں کرپاتا بلکہ وہ عدم ضیاء ہے (وہاں نور کا وجود نہیں ہے)بالکل اس طرح جیسے کوئی شخص کسی

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۳۳۔

تنگ و تاریک گڑھے میں گھس جائے اور تاریکی کا خیال کرے مگر اسے کچھ نہ دکھائی دے اور اسکی نگاہیں کسی چیز کا مشاہدہ کرتے وقت کام نہیں کرپاتیں مگر وہ یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تاریکی وظلمت کو دیکھ رہا ہے ۔ لیکن جو شخص روشنی میں کسی چیز کو دیکھتا ہے اسکی بصارت (نگاہ)کام کرتی ہے اور وہ واقعاً محسوسات کو دیکھتا ہے ۔

چنانچہ دنیا اور آخرت کی بھی بالکل یہی حالت ہے :کیونکہ اہل دنیا کی نگاہوں کی آخری منزل اور ان کی پہنچ صرف ان کی دنیا تک ہے ۔او ر ان کا خیال یہ ہے کہ وہ کچھ دیکھ رہے ہیں جبکہ واقعاً انہیں کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا ہے اور نہ ان کے حواس کسی چیز کے اوپر کام کرتے ہیں ۔

لیکن اہل آخرت کی نگاہیں بہت کارگر ہیں اور انہوں نے آخرت کو باقاعدہ دیکھ لیا ہے لہٰذا دنیا پر ان کی نگاہیں نہیں ٹھہرتی ہیں،تو در حقیقت یہی حضرات صاحبان بصارت ہیں[1]''

طرز نگاہ کا صحیح طریقہ کار

جس طرح انسان کے تمام اعمال وحرکات میں کچھ صحیح ہوتے ہیں اور کچھ غلط ۔ اسی طرح کسی چیز کے بارے میں اسکا طرز نگاہ بھی صحیح یا غلط ہوسکتا ہے ۔جیسا کہ قرآن کریم نے رفتار وکردار کے صحیح طریقوں کی تعلیم دیتے ہوئے صحیح طرز نگاہ کی تعلیم ان الفاظ میں دی ہے :(ولا تمدن عینیک الیٰ ما متّعنا بہ أزواجاً منھم زھرة الحیاة الدنیا لنفتنھم فیہ ورزق ربک خیروأبقیٰ[2]) '' اور خبر دار ہم نے ان میں سے بعض لوگوں کو جو زندگانی دنیا کی رونق سے مالامال کردیا ہے اسکی طرف آپ نظر اٹھاکر بھی نہ دیکھیں کہ یہ ان کی آزمائش کا ذریعہ ہے اور آپ کے پروردگار کا رزق اس سے کہیں زیادہ بہتر اور پائیدار ہے'' نظر اٹھاکر دیکھنا بھی کسی چیز کو دیکھنے کا ایک طریقہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی نگاہ اس مال ودولت اور رزق کے اوپر پڑتی رہے جو خداوند عالم نے دوسروں کو عنایت

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدیدج۸ص۲۷۶۔
[2] سورۂ طٰہ آیت ۱۳۱۔

فرمائی ہے اس مد نظر (نگاہیں اٹھاکر دیکھنے)میں اپنی حد سے تجاوز کرنے کے معنی پائے جاتے ہیں ۔گویا انسان کی نگاہیں اپنے پاس موجود خداوند عالم کی عطا کردہ نعمتوں سے تجاوز کرکے دوسروں کے دنیاوی راحت وآرام اور نعمتوں کی سمت اٹھتی رہیں اور مسلسل انہیں پر جمی رہیں ۔حد سے یہ تجاوز ہی انسانی مشکلات اور عذاب کا سرچشمہ ہے ۔۔۔کیونکہ جب تک خداوند عالم اسے مال نہ دیگا اسے مسلسل اسکی تمنا رہے گی اور وہ اسکے لئے کوشش کرتا رہے گا ۔اور جب خداوند عالم اسے اس نعمت سے نواز دیگا تو پھر وہ ان دوسری نعمتوں کی خواہش اور تمنا شروع کردیگا جو دوسروں کے پاس ہیں اور اسکے پاس نہیں ہیں ۔اور اس طرح دنیا سے اسکی وابستگی اور اسکے لئے سعی وکوشش میں دوام پیدا ہوجاتا ہے ۔

(جیسا کہ مولائے کائنات نے ارشادفرمایا ہے)نیز اسکے پیچھے دوڑنے سے عذاب مزید طولانی ہوجاتا ہے اور وہ اپنے آخری مقصد تک نہیں پہونچ پاتا ہے، دنیا کے بارے میں اس طرز نگاہ سے انسان کو یاس وحسرت کے علاوہ اور کچھ ہاتھ آنے والا نہیں ہے ۔ واضح رہے کہ لوگوں کے پاس موجود نعمتوں پر نگاہیں نہ جمانے اور ان کی طرف توجہ نہ کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان سعی وکوشش اور محنت و مشقت کرنا ہی چھوڑدے کیونکہ ایک مسلمان ہمیشہ متحرک رہتا ہے ۔مگر لوگوں کے پاس موجود نعمتوں کو دیکھ کر حسرت اور غصہ کے گھونٹ پینے کی وجہ سے نہیں ۔

مختصر یہ کہ: کسی بھی چیز کے بارے میں انسان کی طرز نگاہ اسکے نفس کی سلامتی یا بربادی میں اہم کردار اداکرتاہے ۔کیونکہ کبھی کبھی ایک نظر انسان کی روح کو آلودہ اور گندھلا بنادیتی ہے اور اسے ایک طولانی مصیبت اور عذاب میں مبتلا کردیتی ہے ۔جیسا کہ روایت میں ہے: (رُبَّ نظرة تورث حسرة[1]) ''کتنی نگاہوں سے حسرت ہی ہاتھ آتی ہے'' جبکہ کبھی کبھی یہی نگاہ انسان کی استقامت اور استحکام عمل کا سرچشمہ قرار پاتی ہے بیشک اسلام ہمیں ''نگاہ ونظر'' سے منع نہیں کرتا ہے بلکہ ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ کسی بھی چیز کے بارے میں ہمارا زاویہ نگاہ کیا ہونا چاہئے ِنفس کے اوپر طرز نگاہ کے اثرات اور نقوش محبت یا زہد دنیا انسان اپنی زندگی میں کسی چیز

[1] وسائل الشیعہ ج۱۴ص۱۳۸۔فروع کافی ج۵ص۵۵۹۔میزان الحکمت ج۱۰۔

کے بارے میں چاہے جو طرز نگاہ اپنا لے اسکے کچھ نہ کچھ مثبت یا منفی (اچھے یا برے)اثرات ضرور پیدا ہوتے ہیں اور انسان اسی زاویۂ دید کے مطابق اسکی طرف قدم اٹھاتا ہے اس طرح انسان دنیا کے بارے میں چاہے جو زاویہ نگاہ رکھتا ہو یا اسے جس زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہو اسکے فکر وخیال اور رفتار وکردار حتی اسکے نفس کے اوپر اسکے واضح آثار ونتائج اور نقوش نظر آئیں گے جن میں اس وقت تک کسی قسم کا تغیّر یا تبدیلی ممکن نہیں ہے جب تک انسان اپنا انداز فکر تبدیل نہ کرلے ۔

اس حقیقت کی بیحد اہمیت ہے اور یہ اسلامی نظام تربیت کی ریڑھ کی ہڈی کا ایک حصہ ہے اسی بنیاد پر ہم دنیا کے بارے میں سطحی طرز نگاہ ۔ (جو دنیا سے آگے نہیں دیکھتی)اور جسے مولائے کائنات ؑنے ۔ (الابصار الی الدنیا)دنیا کو منظور نظر بنا کر دیکھنے سے تعبیر کیا ہے ۔۔۔اور دنیا کے بارے میں عمیق طرز نگاہ جسے امیرالمومنین ؑنے (ابصار بالدنیا)دنیا کو ذریعہ بنا کر دیکھنے سے تعبیر کیا ہے ان دونوں کے نفسیاتی اور عملی اثرات کا جائزہ پیش کریں گے البتہ ان دونوں نگاہوں کا سب سے بڑا اثر حب دنیا یا زہد دنیا ہے ۔۔۔کیونکہ حب دنیا دراصل دنیا کے بارے میں سطحی طرز نگاہ کا فطری نتیجہ ہے اور زہد دنیا اسکے بارے میں عمیق طرز نگاہ کا فطری نتیجہ ہے ۔لہٰذا اس مقام پر ہم انسانی زندگی کی ان دونوں حالتوں پر روشنی ڈال رہے ہیں ۔

حب دنیا

جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ حب دنیا دراصل دنیا کے بارے میں سطحی انداز فکر کا نتیجہ ہے اور اس انداز نگاہ میں ماورائے دنیا کو دیکھنے کی طاقت نہیں پائی جاتی ہے لہٰذا یہ دنیا کی رنگینیوں اور آسائشوں تک محدود رہتی ہے اور اسی کی طرف متوجہ کرتی رہتی ہے ۔جبکہ زہد وپارسائی،دنیا کے بارے میں باریک بینی اور دقت نظر کا نتیجہ ہے ۔ حب دنیا ہر برائی کا سرچشمہ انسانی زندگی میں حب دنیا ہی ہر برائی اور شر وفساد کا سرچشمہ ہے چنانچہ حیات انسانی میں کوئی برائی اور مشکل ایسی نہیں ہے جسکی کل بنیاد یا اسکی کچھ نہ کچھ وجہ حب دنیا نہ ہو ۔رسول اکرم ﷺ: (حب الدنیا أصل کل معصیۃ،وأول کل ذنب[1]) ''دنیا کی محبت ہر معصیت کی بنیاد اور ہر گناہ کی

---

[1] میزان الحکمت ج۳ص۲۹۴۔

ابتدا ہے'' حضرت علیؑ کا فرمان ہے: (حب الدنیا رأس الفتن وأصل المحن[1]) ''محبت دنیا فتنوں کا سر اور زحمتوں کی اصل بنیاد ہے'' امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے: (رأس کل خطیءة حب الدنیا[2]) ''ہر برائی کی ابتدا (سر چشمہ) دنیا کی محبت ہے'' حب دنیا کا نتیجہ کفر؟ حب دنیا کا سب سے خطرناک نتیجہ کفر ہے جیسا کہ قرآن مجید میں محبت دنیا اور کفر کے درمیان موجود رابطہ اور حب دنیا کے خطرناک نتائج کا تذکرہ بار بار کیا گیا ہے ۔

۱۔خدا وندعالم کا ارشاد ہے: (ولکن من شرح بالکفر صدراً فعلیھم غضب من اللہ ولھم عذاب عظیم ذلک بأنھم استحبوا الحیاۃ الدنیا علیٰ الآخرۃ وأن اللہ لا یھدی القوم الکافرین[3]) ''لیکن جو شخص کفر کے لئے سینہ کشادہ رکھتا ہو ان کے اوپر خدا کا غضب ہے اور اسکے لئے بہت بڑا عذاب ہے ۔یہ اس لئے کہ ان لوگوں نے زندگانی دنیا کو آخرت پر مقدم کیا اور اللہ ظالم قوموں کو ہر گز ہدایت نہیں دیتا ہے'' اس آیۂ کریمہ میں صرف کفر ہی کو حب دنیا کا اثر نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ آیۂ کریمہ نے اس سے کہیں آگے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ حب دنیا سے کفر کیلئے سینہ کشادہ ہو جاتا ہے اور انسان اپنے کفر پر اطمینان خاطر پیدا کر لیتا ہے اور اسکے لئے کھلے دل (سعہ صدر) کا مظاہرہ کرتا ہے اور یہ صورتحال کفر سے بھی بدتر ہے ایسے لوگوں پر خدا وند عالم غضبناک ہوتا ہے اور انھیں اپنی رحمت سے دور کر دیتا ہے ۔

۲۔ارشاد الٰہی ہے: (وویل للکافرین من عذاب شدید*الذین یستحبون الحیاۃ الدنیا علیٰ الآخرۃ ویصدّ ون عن سبیل اللہ ویبغونھا عوجاً[4]) ''اور کافروں کے لئے تو سخت ترین اورا فسوسناک عذاب ہے وہ لوگ جو زندگانی دنیا کو آخرت کے مقابلے میں پسند کرتے ہیں اور لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں اور اس میں کجی پیدا کرنا چاہتے ہیں'' اس آیۂ کریمہ میں حب دنیا اور کفریا راہ خدا سے روکنے کے درمیان موجود رابطہ کا بخوبی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے ۔

---

[1] غرر الحکم ج۱ص۳۴۲۔
[2] بحار الا نوار ج۷۳ص۷ ۔
[3] سورۂ نحل آیت ۱۰۶۔۱۰۷۔
[4] ابراہیم آیت۲۔۳۔

حب دنیا کے نفسیاتی اور عملی آثار

حب دنیا سے انسان کے کردار وعمل پر بے شمار اثرات پڑتے ہیں جن میں سے ہم بعض آثار کی وضاحت پیش کررہے ہیں ا۔طولانی آرزو: اسمیں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کہ لمبی آرزوئیں بھی حب دنیا کا ایک اثر ہیں ۔ کیونکہ جب انسان دنیا کا دلدادہ ہوجاتا ہے اور اس سے وابستہ ہوکر رہ جاتا ہے تو اسکی آرزوئیں بھی بہت طولانی ہوجاتی ہیں یہ ہے تصویر کا پہلا رخ ۔تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ جسکی آرزوئیں زیادہ ہو جاتی ہیں وہ موت کو بہت کم یاد رکھتا ہے اور آخرت کیلئے اسکی تیاری اور اسکا عمل کم ہوجاتا ہے جسکی طرف روایات میں باقاعدہ متوجہ کیا گیا ہے حضرت علی،کے مندرجہ ذیل ارشادات ملاحظہ فرمائیں: (ما أطال عبدٌ الأمل،الا أساء العمل[1] "کسی شخص نے اپنی آرزوئیں طولانی نہیں کیں مگر یہ کہ اس نے اپنا عمل خراب کرلیا"

آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے: (أکثر الناس أملاًأ قلّھم للموت ذکراً[2]) "لمبی آرزو رکھنے والے لوگ موت کوسب سے کم یاد کرتے ہیں" آپ نے یہ بھی فرمایا ہے: (أطول الناس أملاًأسوؤھم عملاً[3]) "جسکی آرزوئیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں اسکا عمل سب سے بدتر ہوتا ہے" تیسرا رخ یہ ہے اکہ جسکی آرزوئیں لمبی ہوتی ہیں وہ انہیں کو اپنے لئے سکون واطمینان کا سبب سمجھ لیتا ہے جبکہ اس دنیا کو خود ہی قرار نہیں ہے ۔مگر وہ اس سے وابستہ ہوکر اسی سے مطمئن ہوجاتا ہے ۔جسکی تفصیل آپ مندرجہ ذیل سطروں میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں ۔

٢۔دنیا پر اعتماد اور اطمینان جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہے کہ دنیا کے بارے میں لمبی لمبی آرزوئیں اسکی محبت اور اس سے خوش وخرم رہنے سے دنیا پر اطمینان و اعتماد پیدا ہوتا ہے جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: (ان الذین لا یرجون لقاء نا ورضوا بالحیاۃ الدنیا واطمأنّوا بھا والذین ھم عن آیاتنا غافلون* أولئک مأواھم النار بماکانوا یکسبون[4]) "یقیناً جو لوگ ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے

---

[1] بحار الانوار ج٧٣ص١٦٦۔
[2] غررالحکم ج١ ص١٩٠۔
[3] گذشتہ حوالہ۔
[4] سورۂ یونس آیت ٧۔٨۔

ہیں اور زندگانی دنیا پر راضی اور مطمئن ہوگئے ہیں اور جو لوگ ہماری آیات سے غافل ہیں یہ سب وہ ہیں جنکے اعمال کی بناء پر انکا ٹھکانا جہنم ہے'' دنیا کے اوپر اس جھوٹے بھروسہ کی وجہ سے انسان یہ سمجھتا ہے کہ ہمیشہ اسی دار دنیا میں رہنا ہے جبکہ یہ باقی رہنے والی نہیں ہے،بلکہ یہ تو وہ پونجی ہے جو بہت جلد فنا کے گھاٹ اتر جائیگی۔

درحقیقت دار قرار وبقاء تو جنت ہے ۔جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے:(وفرحوا بالحیاۃ الدنیا وما الحیاۃ الدنیا فی الآخرۃ الامتاع[1]) ''یہ لوگ صرف زندگانی دنیا پر خوش ہوگئے ہیں حالانکہ آخرت کے مقابلہ میں زندگانی دنیا صرف ایک وقتی لذت کا درجہ رکھتی ہے۔'' یا دوسرے مقام پر ارشاد ہے: (یاقوم انما ھذہ الحیاۃ الدنیا متاع وان الآخرۃ ھی دارالقرار[2]) ''قوم والو!یاد رکھوکہ یہ حیات دنیا صرف چند روزہ لذت ہے اور ہمیشہ رہنے کا گھر صرف آخرت کا گھر ہے'' مختصر یہ کہ دنیا ختم ہوجانے والی پونجی ہے مگر آخرت ہمیشہ باقی رہنے والا سرمایہ ہے جبکہ اسکے برخلاف جو لوگ دنیا پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں اور اس کی محبت ان کے دلوں میں بسی ہوئی ہے اور وہ اسی پر خوش ہیں وہ درحقیقت دنیا کی ابدیت اور بقاء کی خام خیالی کے دھوکہ میں مبتلا ہیں۔

حضرت علیؑ سے اس حدیث قدسی کی روایت کی گئی ہے کہ خداوند عالم نے ارشاد فرمایا ہے: (عجبت لمن یریٰ الدنیا وتصرّف أھلھا حالاً بعد حال،کیف یطمئن الیھا[3]) ''مجھے اس شخص کے اوپر تعجب ہے جو دنیا اور اسکے الٹ پھیر کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہتا ہے پھر بھی وہ اس کے اوپر کیسے بھروسہ کرلیتا ہے؟''یا خداوند عالم نے جناب موسیؑ کی طرف یہ وحی نازل فرمائی تھی :(یاموسیٰ لا ترکن الیٰ الدنیا رکون الظالمین،ورکون من اتخذھا أمًا وأبًا، واترک من الدنیا ما بک الغنیٰ عنہ[4]) ''اے موسی دنیا سے اس طرح دل نہ لگاؤ جس طرح ظالمین دنیا کے دلدادہ ہیں یا جن لوگوں نے اس کو اپنی ماں یا اپنا باپ سمجھ رکھا ہے اور دنیا کو ایسے ترک کردو جیسے تمہیں اسکی ضرورت ہی نہیں ہے'' درحقیقت یہ ایک صاف اور شفاف تعبیر ہے کہ جس طرح ایک بچہ اپنے ماں باپ

---

[1] سورۂ رعد آیت ۲٦۔
[2] سورۂ غافر آیت ۳۹۔
[3] بحارالانوار ج۷۳ص۹۷۔
[4] بحارالانوار ج۱۳ص۳۵۴وج۷۳ص۷۳۔

کے اوپر بھروسہ کرتا ہے اسی طرح بہت سارے لوگ دنیا پر بھروسہ رکھتے ہیں جبکہ انھیں اسکے تغیرات کا بخوبی علم ہے ۔ جبکہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو دنیا کے کھیل تماشے یا اسکی رنگینیوں اور اسباب راحت جیسے فضولیات کی اوقات کو بخوبی سمجھتے ہیں اور اس سے دھوکہ نہیں کھاتے اور یہ حضرات اسکی طرف نگاہ اٹھاکر دیکھنے کے بجائے حقیقی زندگی کی تلاش میں صراط مستقیم پر چلتے رہتے ہیں کیونکہ واقعی اور حقیقی زندگی دراصل آخرت کی زندگی ہے۔

جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: (وما ھذہ الحیاۃ الدنیا الا لھوولعب وان الدار الآخرۃ لہی الحیوان[1]) ''اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں اور آخرت کا گھر ہمیشہ کی زندگی کا مرکز ہے۔''

۳۔ دنیاوی زندگی کو آخرت پر مقدم کرنا یہ بھی حب دنیا کا ہی ایک نتیجہ ہے کیونکہ جب انسان حد سے زیادہ محبت دنیا کا دلدادہ ہوجاتا ہے تو وہ اسکو آخرت پر ترجیح دینے لگتا جسکی طرف خداوند عالم نے قرآن مجید میں یوں اشارہ کیا ہے : (فأمّا من طغیٰ وآثرالحیاۃ الدنیا فان الجحیم ھی المأویٰ[2]) ''پھر جس نے سرکشی کی ہے اور زندگانی دنیا کو اختیار کیا ہے جہنم اسکا ٹھکانا ہوگا''(بل تؤثرون الحیاۃ الدنیا والآخر تخیرٌ وأبقیٰ[3]) ''لیکن تم لوگ زندگانی دنیا کو مقدم رکھتے ہو جبکہ آخرت مقدم اور ہمیشہ رہنے والی ہے'' در حقیقت ان لوگوں کو صرف دنیا چاہئیے اور دنیا کو آخرت پر اسی وقت ترجیح دی جاسکتی ہے کہ جب ان دونوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوجائے کیونکہ یہ طے شدہ ہے کہ جب ان دونوں کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوگا تو ان میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا پڑیگا یعنی یا صرف دنیا کو لے لیا جائے اور یا صرف آخرت کو؟!اور کیونکہ ان لوگوں نے آخرت کو چھوڑ کر دنیا کو اپنا لیا ہے لہٰذا اب انہیں دنیاوی زندگی کے علاوہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں ہے ۔جیسا کہ خداوند عالم کا ارشاد ہے: (فأعرض عمن تولّیٰ عن ذکرنا ولم یرد الا الحیاۃ لدنیا[4]) ''لہٰذا جو شخص بھی ہمارے ذکر سے منھ پھیرے اور زندگانی دنیا کے علاوہ کچھ نہ چاہے، آپ بھی اس سے کنارہ کش ہوجائیں''،بلکہ حقیقت یہ

---

[1] سورۂ عنکبوت آیت ٦۴۔
[2] سورۂ نازعات آیت ۳۷،۳۸،۳۹۔
[3] سورۂ اعلیٰ آیت۱٦،۱۷۔
[4] سورۂ نجم آیت ۲۹۔

ہے کہ ان لوگوں نے دنیا کے بدلے اپنی آخرت کو بیچ ڈالا ہے جیسا کہ ارشاد ہے: (أولئک الذین اشتروا الحیاة الدنیا بالآخرة[1]) ''یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کو دے کر دنیا خریدی ہے''اسی بارے میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ روایت ہے: (من عرضت لہ دنیا وآخرة،فاختارالدنیا علیٰ الآخرة،لقی اللہ عزّوجلّ ولیست لہ حسنة یتقی بھاالنار،ومن أخذ الآخرة وترک الدنیا لقی اللہ یوم القیامة وھو راضٍ عنہ[2]) ''جس کے سامنے دنیا اور آخرت دونوں کو پیش کیا جائے اور وہ آخرت کو چھوڑ کر دنیا کو اپنا لے تو جب وہ خداوند عالم کی بارگاہ میں پہونچے گا تو اسکے نامۂ عمل میں کوئی ایسی نیکی نہ ہوگی جو اسے جہنم سے بچا سکے اور جو شخص دنیا کو چھوڑکر آخرت کو اپنا لے جب وہ روز قیامت خداوند عالم سے ملاقات کریگا تو وہ اس سے راضی رہے گا''

حضرت علیؑ: (من عبدالدنیا وآثرھا علیٰ الآخرة استوخم العاقبة[3]) ''جو دنیا کا پجاری ہوگیا اور اس نے اسے (دنیا کو) آخرت پر ترجیح دی ہے اس نے اپنی عاقبت بگاڑلی''،حضرت علیؑ: (لا یترک الناس شیئاً من أمر دینھم لاستصلاح دنیاھم الا فتح اللہ علیھم ما ھوأضرّ منہ[4]) ''لوگ اپنی دنیا کی بھلائی کے لئے اپنے دین کا کوئی کام ترک نہیں کرتے مگر یہ کہ خداوند عالم ان کے سامنے اس سے زیادہ مضر دروازہ کھول دیتا ہے''آپ ہی سے یہ بھی مروی ہے: (من لم یبال مارزء من آخرتہ اذا سلمت لہ دنیاہ فھوھالک[5]) ''اگر کسی کی دنیا سالم ہو اور اسے یہ فکر نہ ہو کہ اس نے اپنی آخرت کے لئے کیا حاصل کیا تو وہ ہلاک ہونے والا ہے''آخرت کی نعمتوں کے لئے دنیا ہی میں عجلت پسندی حب دنیا کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ انسان آخرت کی نعمتوں کو دنیا میں ہی حاصل کرنے کے لئے عجلت سے کام لیتا ہے کیونکہ خداوند عالم نے انسان کو در حقیقت جنت کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے پیدا کیا ہے لہٰذا جب انسان دنیا کا دلدادہ ہوجاتا ہے اور اسکی لذتوں اور نعمتوں پر اکتفاء کر بیٹھتا ہے تو گویا اسے دنیا میں ہی آخرت کی تمام نعمتیں حاصل کر لینے کی جلدی ہے جیسے کوئی کسان جلدی غلہ یا پھل توڑنے کی فکر میں اسے خام اور کچا ہی توڑلیتا ہے یا وہ بچہ جو بزرگی اور بڑھاپے کے دور

[1] سورۂ بقرہ آیت ۸۶۔
[2] بحارالانوار ج۷۶ص۲۶۴وج۷۳ص۱۰۳۔
[3] بحارالانوار ج۷۳ص۱۰۴۔
[4] بحارالانوار ج۷۰ص۱۰۷۔
[5] بحار الانوار ج۷۷ ص۲۷۷۔

کی راحت وآرام کو پہلے ہی حاصل کرنے کے لئے کھیل کود میں وقت گذار دیتا ہے اور اپنی تعلیم کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا یعنی اسکے اوپر مستقبل (بڑھاپے اور ادھیڑپن)کے راحت وآرام کو قربان کرڈالتا ہے جس کی تصویر کشی اس آیۂ کریمہ نے کتنے حسین انداز میں کی ہے [۱]:(ویوم یعرض الذین کفروا علیٰ النارأذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا واستمتعتم بھا فالیوم تجزون عذاب الھون بماکنتم تستکبرون فی الارض بغیر الحق وبماکنتم تفسقون[۲])

''اور جس دن کفار جہنم کے سامنے لائے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ تم تو اپنی دنیا کی زندگی میں اپنے مزے اڑا چکے اور اس میں خوب چین کر چکے تو آج تم پر ذلت کا عذاب کیا جائے گا اس لئے کہ تم زمین میں اکڑا کرتے تھے اور اس لئے کہ تم بد کاریاں کرتے تھے'' اس قول الٰہی کے بارے میں توجہ فرمائیں: (أذھبتم طیباتکم فی حیاتکم الدنیا[۳]''تم تو اپنی دنیا کی زندگی میں اپنے مزے اڑا چکے'' جبکہ خداوند عالم نے انسان کیلئے ان بہترین نعمتوں کو آخرت میں ذخیرہ کرکے رکھا ہے اور وہی دارالقرار ہے لیکن انسان اسکو اچھی طرح پختہ ہونے بلکہ ان پر پھل آنے سے پہلے ہی دنیا میں ان کی فصل کاٹنے کے لئے جلدبازی کرنے لگتا ہے جبکہ وہ بہت جلد تمام ہوکر گذر جانے والی ہیں۔

زودگذر

قرآن مجید نے دنیا کو اسی وجہ سے ''زودگذر '' کہا ہے کیونکہ انسان اس دنیا میں آخرت کی نعمتوں کوان کے وقت سے پہلے ہی

---

[۱] اس تحقیق کا موضوع در حقیقت دنیا اور آخرت کے ٹکراؤ کے وقت ہے یعنی ''حدود الٰہی ''اور دنیاکاٹکراؤ! چنانچہ حدوداور احکام الٰہی کی پابندی کا لازمہ دنیا کی بعض اچھی چیزوں سے محرومی ہے اور دنیا سے لگاؤ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان بعض حدود الٰہیہ سے تجاوز کر جائے اس مرحلہ پر انسان دنیا اور آخرت کے دوراہے پر کھڑاہوتا ہے اور یہ درحقیقت محرومی نہیں ہے چونکہ جب انسان دود الٰہیہ کا پابند ہوجاتا ہے تو پروردگار اسکو آخرت کی نعمتیں جو کامل ودائم ،تروتازہ اور باقی رہنے والی ہیں دیناچاہتاہے لیکن انسان ان و دنیا ہی میں پانے کے لئے جلدی کرتاہے اور ان کو اچانک حاصل کرلیتا ہے جو ناپختہ ہوتی ہیں اور یہ بہت جلدزائل ہوجانے والی پونجی ہے اور اس میں بے شمار مشکلات اور خطرات پائے جاتے ہیں ۔جب ہم اسلامی نصوص میں غوروفکر کرتے ہیں تو ہمیں یہ علوم ہوتا ہے کہ یہ قاعدہ کسی حد تک دنیا کی حلال چیزوں پر بھی منطبق ہوتا ہے لیکن مطلق طورپر نہیں لہذاجب کوئی انسان دنیا کی بعض حلال چیزوں میں زہد اختیار کرتا ہے تو خداوند عالم اسکے لئےآخرت کی نعمتیں ذخیرہ کردیتا ہے ۔۔اور شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اسکوحاصل کر لینے کے بعد اسکے دل میں دنیا سے لگاؤ اور اسکی محبت پیدا ہو سکتی ہے یایہ حکم مومنین کے غریب طبقہ سے برابری کی بنا پرہو بہرحال اسکی وجہ چاہے جو بھی ہو اس قاعدہ اور خداوند عالم کے اس قول :(قل من حرّم زینۃ اللہ التی أخرج لعبادہ والطیبات من الرزق)کے درمیان ہر لحاظ سے مطابقت پائی جاتی ہے ۔

[۲] سورۂ احقاف آیت۲۰۔

[۳] سورۂ احقاف آیت۲۰۔

حاصل کرلینا چاہتا ہے.جیسا کہ ارشاد ہے: (من کان یرید العاجلۃ عجّلنا لہ فیھا ما نشاء لمن نرید[1]) ''اور جو شخص دنیا کا خواہاں ہوتو ہم جسے چاہتے اور جو چاہتے ہیں اسی دنیا میں سر دست عطا کر دیتے ہیں'' آیت کے آخری حصہ (ما نشاء لمن نرید) ''ہم جسے چاہتے اور جو چاہتے ہیں'' کے معنی پر توجہ کے بعد یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ دنیا میں ہی آخرت کی نعمتوں کو پانے کے لئے جلد بازی کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ انسان اس دنیا میں اپنی عجلت پسندی اور بے تابی کی وجہ سے جو چاہے حاصل کرلے بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ اسکی جلد بازی کے بعد بھی خداوند عالم ہی اسے جیسے چاہتا ہے اپنے اعتبار سے کم یا زیادہ رزق عطا کرتا ہے گویا رزق پھر بھی خداوند عالم کے ہاتھ میں ہے اور اس پر وہی حکم فرماہے اور اس میں جلد بازی دکھانے سے انسان کا کچھ بس چلنے والا نہیں ہے ۔

مگر اسکے باوجود بھی وہ آخرت کی نعمتوں سے محروم ہوجاتا ہے اور جن نعمتوں کیلئے اس نے ناجائز طورپر جلد بازی کی تھی وہ کم ہوجاتی ہیں۔اس بارے میں خداوند عالم کا یہ ارشاد بھی ہے: (قالوا ربّنا عجّل لنا قِطّنا قبل یوم الحساب[2]) ''انہوں نے کہا پروردگار روز حساب سے پہلے ہی دنیا میں ہمارا حصہ ہمیں دیدے'' یا خداوند عالم کا یہ بھی ارشاد ہے : (کلا بل تحبّون العاجلۃ[3]) ''مگر (لوگو)حق تو یہ ہے کہ تم لوگ (زود گذر) دنیا کو دوست رکھتے ہو '' دوسرے مقام پر ارشاد ہے: (ان ھؤلاء یحبّون العاجلۃ ویذرون وراء ھم یوماً ثقیلاً[4]) ''یہ لوگ صرف دنیا کی نعمتوں کو پسند کرتے ہیں اور بڑے بھاری دن کو اپنے پس پشت چھوڑبیٹھے ہیں

''ہم جب روایات کے اندر غوروفکر کرتے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا وآخرت کے درمیان ٹکراؤ ہمیشہ محرمات کے میدان ہی میں نہیں ہوتا بلکہ یہ ٹکراؤ کبھی کبھی ''حلال'' معاملات کے درمیان بھی پیدا ہوسکتا ہے یہ نکتہ اسلامی افکار کے انوکھے نظریات میں سے ایک ہے ۔جیسا کہ روایات میں ہمیں ملتا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اور آپ کے اہلبیت طاہرین،اور خداوند عالم کے دوسرے نیک اور صالح بندے دنیا کی نعمتوں کے استعمال میں افراط کو پسند نہیں کرتے تھے جسکا سبب شاید یہ ہوکہ دنیا کی نعمتوں سے زیادہ لطف

[1] سورۂ اسراء آیت ١٨۔
[2] سورۂ ص آیت١۶۔
[3] سورۂ قیامت آیت ٢٠۔
[4] سورۂ انسان آیت ٢٧۔

اندوز ہونے سے اس کی محبت میں اضافہ ہوجاتا ہے اورانسان دنیا سے مزید وابستہ ہوجاتا ہے کیونکہ دنیا کی محبت اور اس کی نعمتوں کے لئے جلد بازی کرنے کے درمیان دو طرفہ (طرفینی)رابطہ ہے یعنی جب انسان دنیا سے محبت کریگا تو اسکی نعمتوں کو حاصل کرنے کیلئے بے تابی دکھائے گا اور جب نعمتوں کو حاصل کرنے کیلئے جلد بازی سے کام لینے لگے گا تو اسکے دل میں دنیا کی محبت رچ بس جائے گی بہر حال اس تحقیق کا نتیجہ چاہے جو کچھ بھی ہو لیکن ہمیں اس بات میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ دنیا اور آخرت کی نعمتوں کے درمیان ٹکراؤ حلال چیزوں میں بھی پایا جاتا ہے البتہ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ خداوند عالم نے اپنے بندوں کے لئے جن آرائشوں یا نعمتوں کو حلال قرار دیا ہے انہیں حرام قرار دیدیا جائے بلکہ انکا معاملہ حلال و حرام کے ٹکراؤ کے معاملات سے بالکل الگ ہے جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ یہ اسلامی افکار کے مختلف انوکھے نظریات میں سے ایک نظریہ ہے ۔آئندہ سطروں میں ہم اس بارے میں موجود روایات ذکر کرینگے اور اسکے بعد انکی وضاحت اور تفسیر بھی پیش کریں گے ۔

روایات

حضرت عمر کا بیان ہے کہ میں نے پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ،خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کی امت کو بھی فراوانیاں عطا کرے ۔ اللہ نے فارس و روم کو تو خوب نواز رکھا ہے حالانکہ وہ قومیں خدا کی عبادت بھی نہیں کرتی ہیں ۔پیغمبر اسلام ﷺ سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور فرمایا : (أفیشک أنت ابن الخطاب ۔أو قوم عُجّلت لھم طیبا تھم فی الحیاۃالدنیا[1]) ''اے ابن خطاب تم کس شک میں مبتلا ہو ؟ان قوموں نے اپنے طیبات کو اسی زندگانی دنیا میں پالیا ہے'' پیغمبر اکرم کی خدمت میں ''خبیص'' (ایک قسم کا حلوہ)پیش کیا گیا تو آپ نے کھانے سے انکار فرمادیا حاضرین نے پوچھا ۔کیا آپ اس کو حرام سمجھتے ہیں ؟آپ نے فرمایا : ایسا نہیں ہے لیکن میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا نفس اسکا شوقین ہوجائے: پھر آپ نے اس آیۂ کریمہ کی تلاوت فرمائی: (أذھبتم طیباتکم فی الحیاۃالدنیا[2]) ''تم تو اپنی دنیا کی زندگی میں اپنے مزے اڑا چکے'' عمر بن خطاب کا بیان ہے کہ میں نے حضور

---

[1] کنز العمال :ح۶۶۶۴۔
[2] نورالثقلین ج۵ص۱۵۔

سے باریابی کی اجازت طلب کی اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا آپ مشربۂ ام ابراہیم (ایک جگہ کا نام) میں اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ آپ کے جسم مبارک کے بعض حصے خاک پر تھے آپ کے سر کے نیچے کھجور کی پتیوں کا تکیہ تھا، میں سلام کرکے بیٹھ گیا اور عرض کی :اے رسول خدا آپ اللہ کے نبی،اسکے منتخب بندے اور بہترین خلق خدا ہیں۔قیصر وکسری سونے کے تخت اور حریر و دیبا کے فرش پر آرام کرتے ہیں (اور آپ کا یہ عالم ہے ؟)رسول خدا نے فرمایا: (أولئک قوم عُجّلت طیباتھم وھی وشیکۃ الانقطاع،وانما اُخّرت لنا طیباتنا) ''ان اقوام کے طیبات یہیں عطا کردئے گئے ہیں جو بہت جلد منقطع ہوجائیں گے۔

اورہمارے طیبات کو آخرت پر اٹھا رکھا گیا ہے'' روایت ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اصحاب صفہ کے پاس پہونچے تو وہ اپنے کپڑوں میں چمڑے کا پیوند لگارہے تھے اور ان کے پاس پیوند لگانے کے لئے کپڑے کا ٹکڑا نہیں تھا تو آپ نے فرمایا ہے کہ یہ دن تمہارے لئے بہتر ہے یا وہ دن جب صبح کو تم بہترین حلے پہنے ہوگے اور شام کے وقت دوسرا پہن لوگے اور صبح کو ایک پیالا اور شام کو دوسرا پیالا استعمال کروگے اور اپنے گھر پر اس طرح غلاف چڑھائے رکھوگے جس طرح کعبہ پر غلاف چڑھا رہتا ہے ؟تو انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے وہی دن بہتر ہے تو آپ نے فرمایا :نہیں،بلکہ تم آج ہی بہتر ہو[1]۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے جناب فاطمہؑ کو دیکھا کہ آپ اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی چادر اوڑھے ہوئے ہیں اوراپنے ہاتھوں سے چکی چلارہی ہیں اوراپنے بچے کودودھ پلارہی ہیں تو پیغمبر اکرم ﷺ کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور آپ نے فرمایا: (یابنتاہ تعجّلی مرارۃ الدنیا بحلاوۃ الآخرۃ) ''اے بیٹی آج تلخی دنیا کے بدلے آخرت کی حلاوت خرید لو''جناب فاطمہؑ نے فرمایا: (یارسول اللہ الحمدللہ علیٰ نعمائہ،والشکرللہ علیٰ آلائہ) ''اے رسول خدا ،تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اسکی نعمتوں پر ،اور اسکی عنایات پراس کا شکر ہے تو خدا نے یہ آیت نازل فرمائی: (ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ[2]) ''عنقریب آپ کا رب آپ کو اس قدر عطا کرے گاکہ آپ خوش

[1] نور الثقلین ج۵ص۱۷۔
[2] نور الثقلین ج۵ص۵۹۴ومیزان الحکمت ج۳:ص۳۲۶۔۳۲۷۔

ہوجائیں گے''امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے: (انا لنحب الدنیا،وأن لانؤتاها خیر من أن نؤتاها،وما أوتی ابن آدم منها شیئاً الا نقص حظه من الآخرة[1]) ''ہمیں دنیا سے محبت ہے اور ہماری نگاہ میں دنیا کا نہ ملنا اس کے ملنے سے بہتر ہے کیونکہ فرزند آدم کو جس مقدار میں دنیا ملتی ہے آخرت سے اسکا اتنا ہی حصہ کم ہوجاتا ہے'' امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے: (آخر نبی یدخل الجنة سلیمان بن داؤد (ع) وذلک لما أعطی فی الدنیا[2]) ''جنت میں داخل ہونے والے آخری نبی سلیمان بن داؤدؑ ہوں گے کیونکہ دنیا میں انہیں بہت کچھ عطا کردیا گیا تھا'' امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (کلما فاتک من الدنیا شیء فهو غنیمة[3]) ''دنیا میں جو چیز بھی تم سے فوت ہوجائے وہ غنیمت ہے

''آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے: (مرارة الدنیا حلاوة الآخرة،وحلاوة الدنیا مرارة الآخرة وسوء العقبیٰ[4]) ''دنیا کی تلخی آخرت کی حلاوت و شیرینی ہے اور دنیا کی حلاوت آخرت کی تلخی اور بری عاقبت ہے'' آپ نے ارشاد فرمایا: (من طلب من الدنیا شیئاً فاته من الآخرة أکثر ما طلب[5]) ''جو دنیا میں کسی شے کو طلب کرتا ہے اس سے زیادہ اسکا آخرت میں گھاٹا ہوجاتا ہے'' آپ ہی سے منقول ہے: (ما زاد فی الدنیا نقص فی الآخرة،وما نقص من الدنیا زاد فی الآخرة[6]) ''دنیا کی زیادتی آخرت کا نقصان اور دنیا کا نقصان آخرت کی زیادتی ہے'' امام جعفر صادقؑ نے حضرت امام زین العابدینؑ کا یہ قول نقل کیا ہے: (ما عرض لی قط أمران،أحدهما للدنیا،والآخر للآخرة،فآثرت الدنیا الا رأیت ما أکره قبل أن أمسی) ''میرے سامنے جب بھی کبھی دو کام آتے ہیں ایک دنیا سے متعلق اور دوسرا آخرت سے متعلق ،اگر میں نے ان میں دنیا وی کام کو ترجیح دیدی تو شام ہونے سے قبل ناپسندیدہ اور مکروہ شے کا مشاہدہ کرلیتا ہوں'' پھر امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: (لبنی أمیة أنهم یؤثرون الدنیا علیٰ الآخرة منذ ثمانین سنة ولیس یرون شیئاً یکرهونه[7]) ''اور یہ بنی امیہ اسّی

[1] بحارالانوار ج۷۱ ص۸۱ ومیزان الحکمت ج۲:ص۳۲۶۔
[2] بحارالانوار ج۱۴ص ۷۴۔
[3] غررالحکم ج۲ص۱۱۱۔
[4] نہج البلاغہ حکمت ۲۴۳۔
[5] غررالحکم ج۲ص۲۲۱۔
[6] غررالحکم ج۲ص۲۶۸۔
[7] بحارالانوار ج۷۳ص۱۲۷۔

سال سے دنیا کو آخرت پر ترجیح دے رہے ہیں اور انہیں کسی بھی چیز سے کراہت محسوس نہیں ہوتی ہے'' اس مسئلہ کی وضاحت امیر المومنینؑ کے اس قول سے ہوجاتی ہے: (واعلموا أن ما نقص من الدنیا،وزاد فی الآخرة خیر مما نقص من الآخرة وزاد فی الدنیا،فکم من منقوص۔فاتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وأنتم مسلمون[1]) ''یاد رکھو کہ دنیا میں کسی شے کا کم ہونا اورآخرت میں زیادہ ہونا اس سے بہتر ہے کہ دنیا میں زیادہ ہو اور آخرت میں کم ہو جائے کہ کتنے ہی کمی والے فائدہ میں رہتے ہیں اور کتنے ہی زیادتی والے گھاٹے میں رہ جاتے ہیں ۔بیشک جن چیزوں کا تمہیں حکم دیا گیا ہے ان میں زیادہ وسعت ہے بہ نسبت ان چیزوں کے جن سے روکا گیا ہے اور جنہیں حلال کیا گیا ہے وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں جنہیں حرام قرار دیا گیا ہے لہٰذا قلیل کو کثیر کے لئے اور تنگی کو وسعت کی خاطر چھوڑدو ۔پروردگار نے تمہارے رزق کی ذمہ داری لی ہے اور عمل کرنے کا حکم دیا ہے لہٰذا ایسا نہ ہو کہ جس کی ضمانت لی گئی ہے اسکی طلب اس سے زیادہ ہوجائے جس کو فرض کیا گیا ہے ۔

خدا گواہ ہے کہ تمہارے حالات کو دیکھ کر شبہ ہونے لگتا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ شائد جس کی ضمانت لی گئی ہے وہ تم پر واجب کیا گیا ہے اور جس کا حکم دیا گیا ہے اسے ساقط کردیاگیا ہے ۔خدا را عمل کی طرف سبقت کرو اورموت کے اچانک وارد ہوجانے سے ڈرو اس لئے کہ موت کے واپس ہونے کی وہ امید نہیں ہے جس قدر رزق کے پلٹ کر آجانے کی ہے ۔جو رزق آج ہاتھ سے نکل گیا ہے اس میں کل اضافہ کا امکان ہے لیکن جو عمر آج نکل گئی ہے اسکے کل واپس آنے کا بھی امکان نہیں ہے ۔امید آنے والے کی ہوسکتی ہے جانے والے کی نہیں اس سے تو مایوسی ہی ہوسکتی ہے ''اللہ سے اس طرح ڈرو جو ڈرنے کا حق ہے اور خبر دار اس وقت تک دنیا سے نہ جانا جب تک واقعی مسلمان نہ ہوجاؤ ''

روایات کا تجزیہ

مذکورہ روایات میں سند یا متن کے لحاظ سے شک وشبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہ تعداد کے اعتبار سے بہت زیادہ اور سند کے

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۳۔

لحاظ سے مستفیضہ ہیں لہٰذا ان سب کے بارے میں شک کا امکان نہیں ہے یہ روایات فقط حرام امور سے مخصوص نہیں ہیں بلکہ حرام وحلال دونوں قسم کی لذتوں کو بیان کرتی ہیں ان روایات کے مطابق دنیا و آخرت کا ٹکراؤ صرف حرام اشیاء میں ہی نہیں بلکہ اس ٹکراؤ میں حلال لذتیں بھی شامل ہیں ان کے معانی و مطالب واضح اور ظاہر ہیں اور ان کے بارے میں یہ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یہ صرف حرام لذتوں سے منع کر رہی ہیں جس کی بناپر خداوند عالم کا یہ قول: (یاأیھاالنّاس کلوامافی الارض حلالاً طیّباولا تتّبعوا خطوات الشّیطان انہ لکم عدو مبین[1]) ''اے انسانو:زمین میں جوکچھ بھی حلال وطیب ہے اسے استعمال کرو اور شیطانی اقدامات کا اتباع نہ کرو کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے''

یا دوسرے مقام پر ارشاد ہے: (قل من حرّم زینۃ اللّٰہ التی أخرج لعبادہ والطیبات من الرزق،قل ھی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیاخالصۃ یوم القیامۃ[2]) ''پیغمبر آپ پوچھئے کہ کس نے اس زینت کوجسے خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام کردیا ہے اور بتائیے کہ یہ چیزیں روز قیامت صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں'' مذکورہ دونوں اقوال صرف خداوند عالم کی حلال کردہ طیبات سے مخصوص ہوجائیں جبکہ یہ روایات حرام چیزوں کے علاوہ زندگانی دنیا کی آسائشوں (متاع)سے استفادہ کرنے سے بھی منع کررہی ہیں۔تو ہم ان روایات سے کیا نتیجہ اخذ کریں؟ایک جانب یہ روایات ہیں اور دوسری طرف قرآن مجید کی آیات ہیں کہ جن میں خداوند عالم اپنے بندوں کو طیب وطاہر رزق سے استفادہ کی دعوت دے رہا ہے اور طیبات الٰہی کو حرام قرار دینے والوں کو ٹوک رہا ہے ؟ذیل میں ہم چند نکات کے ذریعہ اس سوال کا جواب پیش کرنے کی کوشش کریں گے امید ہے کہ ان نکات کے ساتھ ہمیں بہ ترتیب اسکا صحیح جواب مل جائے گا: ا۔ذرادیر پہلے ہم نے جو روایات پیش کی ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اسلام نعمات الٰہیہ اور طیب وطاہر رزق کو مسلمانوں کے لئے ممنوع قرار دیتا ہے ۔ اللہ نے اپنے بندوں کے لئے جو اسباب زینت اور طیبات خلق کئے وہ بندوں کے لئے جائز اور مباح ہیں مگر یہ کہ خود پروردگار منع کردے

[1] سورۂ بقرہ آیت ۱۶۸۔
[2] سورۂ اعراف آیت ۳۲۔

خداوند عالم فرماتاہے:(قل من حرم زینة اللہ التی أخرج لعبادہ والطیبات من الرزق قل هی للذین آمنوا فی الحیاة الدنیا خالصة یوم القیامة وکذالک نفصل الآیات لقوم یعلمون[1]) ''کہو کہ کس نے اس زینت کو جس کو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور پاکیزہ رزق کو حرام کردیا ہے ۔اور بتائیے کہ یہ چیزیں روز قیامت صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جو زندگانی دنیا میں ایمان لائے ہیں ''ان روایات کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انسان روئے زمین پر سعی و کوشش ہی نہ کرے بلکہ اس سلسلہ میں خدا کا حکم تو یہ ہے کہ :(فاذا قُضیت الصلوٰة فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ[2]) ''پھر جب نماز تمام ہوجائے تو زمین میں منتشر ہوجاؤ اور فضل خدا کو تلاش کرو ''،لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان دنیا کا ہی ہوکر رہ جائے اور اسکی تمام تر کوششوں کا ماحصل صرف دنیا ہو بلکہ انسان کا اصل مقصد سلوک الی اللہ ہونا چاہئیے اور اسی کے ضمن میں دنیا کے لئے بھی کوشش کرتا رہے ۔

(وابتغِ فیما آتاک اللہ الدار الآخرة ولاتنس نصیبک من الدنیا[3]) ''اور جو کچھ خدا نے دیا ہے اس سے آخرت کے گھر کا انتظام کرو اور دنیا میں اپنا حصہ بھول نہ جاؤ ''لہٰذا بنیادی طورپر انسان کی حرکت خدا اور آخرت کے جانب ہونا چاہئیے مگر دنیا میں اپنے حصہ کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہئیے۔

۲۔اس وضاحت کے باوجود مسئلہ مکمل طورپر حل نہیں ہوجاتا کیونکہ دنیا اور آخرت کا ٹکراؤ صرف محرمات کی حد تک نہیں ہے بلکہ حلال چیزوں میں بھی یہ ٹکراؤپایا جاتا ہے ۔امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: (ان الدنیا والآخرة عدوان متفاوتان،وسبیلان مختلفان،فمن أحب الدنیا وتولّاها أبغض الآخرة وعاداها،وهما بمنزلة المشرق والمغرب،وماشٍ بینهما کلما قرب من واحد بَعُدَ من الآخر،وهما بعد ضرّتان![4]) ''یاد رکھو دنیا و آخرت آپس میں دو ناسازگار دشمن ہیں اور دو مختلف راستے ۔لہٰذا جو دنیا سے محبت اور تعلق خاطر رکھتا ہے وہ آخرت کا دشمن ہوجاتا ہے اور یہ دونوں مشرق ومغرب کی طرح ہیں کہ جو راہرو ایک سے قریب تر ہوتا ہے

---

[1] سورۂ اعراف آیت ۳۲۔
[2] سورۂ جمعہ آیت ۱۰۔
[3] سورۂ قصص آیت ۷۷۔
[4] نہج البلاغہ حکمت ۱۰۰۔

وہ دوسرے سے دور تر ہوجاتا ہے پھر یہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کی سوت جیسی ہیں'' انسان اس دنیا کی نعمتوں اور حلال لذتوں سے چاہے جتنا استفادہ کرلے خدا اسے سزا نہیں دے سکتا کیونکہ یہ چیزیں حرام نہیں ہیں البتہ جتنا دنیا میں نعمتوں سے استفادہ کرتا جائے گا اسی مقدار میں جنت کی نعمتوں سے محروم ہوتا جائے گا کیونکہ لذائذ دنیا سے استفادہ کرنے کی وجہ سے آخرت کو پانے کے مواقع کم ہوتے جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حلال لذتوں کے اعتبار سے بھی دنیا وآخرت میں ٹکراؤ پایا جاتا ہے مندرجہ ذیل چند مثالوں کے ذریعہ اس بات کی وضاحت ہوجائے گی ۔

۱۔اللہ نے بندوں کو جو معین عمر عطا فرمائی ہے اس میں انسان مسلسل روزے رکھ سکتا ہے روزہ اگر چہ صرف ماہ رمضان میں ہی واجب ہے لیکن سال کے بقیہ دنوں میں مستحب ہی نہیں بلکہ ''مستحب مؤکد '' ہے ۔امام محمد باقرؑ نے پیغمبر اکرم ﷺ کے حوالہ سے خداوند عالم کا یہ قول نقل کیا ہے ۔(الصوم لی وأنا اجزی بہ[1]) ''روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اسکی جزادوں گا'' اس طرح سال کے دوران روزہ چھوڑدینے سے انسان کتنے عظیم ثواب سے محروم ہوتا ہے ؟ اسے خدا کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ۔اب انسان جس دن بھی روزہ نہ رکھکر اللہ کی جائزاور حلال نعمتیں استعمال کرتا ہے اس کی وجہ سے وہ جنت کی کتنی نعمتوں سے محروم ہوا ہے ؟اسکا علم خدا کے علاوہ کسی کو نہیں ہے اگر چہ یہ طے ہے کہ جو کچھ اس نے کھایا وہ رزق حلال ہی تھا لیکن اس تھوڑے سے رزق کے باعث بہر حال آخرت کی نعمتیں حاصل کرنے کا موقع اسکے ہاتھ سے جاتا رہا ۔حلال لذتوں کے باعث دنیا و آخرت کے درمیان ٹکراؤ کی یہ ایک مثال ہے ۔

۲۔جب انسان رات میں نیند کی لذت سے لطف اندوز ہوتا ہے تو بلا شبہ یہ زندگانی دنیا کی حلال اور بہترین لذت ہے لیکن جب انسان پوری رات سوتے ہوئے گذار دیتا ہے تو اس رات نماز شب اور تہجد کے ثواب سے محروم رہتا ہے ۔فرض کیجئے خدا نے کسی کو ستر برس کی حیات عطا کی ہو تو اس کے لئے ستر سال تک یہ ثواب ممکن ہے لیکن جس رات بھی نماز شب قضا ہوجاتی ہے

[1] بحارالانوار ج۹۶ص ۲۵۴ ،۲۵۵، ۲۴۹ ۔

آخرت کی نعمتوں میں سے ایک حصہ کم ہوجاتاہے اگر (خدا نخواستہ)پورے ستر سال اسی طرح غفلت میں بسر ہوجائیں تو نعمات اخروی حاصل کرنے کا موقع بھی ختم ہوجائے گا اور پھر انسان افسوس کرے گا کہ ''اے کاش میں نے اپنی پوری عمر عبادت الٰہی میں بسر کی ہوتی''

۳۔اگر خداوند عالم کسی انسان کومال عطا کرے تو اس مال کو راہ خدا میں خرچ کرکے کافی مقدار میں اخروی نعمتیں حاصل کرنے کاامکان ہے انسان جس مقدار میں دنیاوی لذتوں کی خاطرمال خرچ کرتا ہے اتنی ہی مقدار میںآخرت کی نعمتوں سے محروم ہوسکتا ہے کہ اسی مال کو راہ خدا میں خرچ کرکے دنیا کے بجائے آخرت کی لذتیں اور نعمتیں حاصل کرسکتا تھا لہٰذا اگر انسان اپنا پورا مال دنیاوی کاموں کے لئے خرچ کردے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس مال سے اخروی نعمتیں حاصل کرنے کا موقع گنوادیا ۔چاہے اس نے یہ مال حرام لذتوں میں خرچ نہ کیا ہو ۔

اسی طرح انسان کے پاس آخرت کی لذتیں اور نعمتیں حاصل کرنے کے بے شمار مواقع ہوتے ہیں ۔مال ،دولت، عمر، شباب، صحت ،ذہانت ،سماجی حیثیت اور علم جیسی خداداد نعمتوں کے ذریعہ انسان آخرت کی طیب وطاہر نعمتیں کما سکتا ہے لیکن جیسے ہی اس سلسلہ میں کوتاہی کرتا ہے اپنا گھاٹا کر لیتا ہے خدا وندعالم نے ارشاد فرمایا ہے: (والعصر*ان الانسان لفی خسر[1]) ''قسم ہے عصر کی بیشک انسان خسارہ میں ہے''آیۂ کریمہ نے جس گھاٹے کا اعلان کیا ہے وہ اس اعتبار سے ہے کہ آخرت کی نعمتیں حاصل کرنے کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے خداوندعالم نے وہ تمام چیزیں اپنے بندوں کو (مفت) عطا کردی ہیں اور انھیں خدا داد نعمتوں سے آخرت کی نعمتیں حاصل کرنے کا بھی انتظام کردیا ہے اس کے باوجود انسان کوتاہی کرتا ہے اور ان نعمتوں کو خواہشات دنیا کے لئے صرف کرکے آخرت کمانے کا موقعکھودیتا ہے تو یقیناگھاٹے میں ہے ۔اس صورت حال کی منظرکشی امیر المومنین حضرت علیؑنے بہت ہی بلیغ انداز میں فرمائی ہے آپ کا ارشاد ہے: (واعلم أن الدنیادار بلیة،لم یفرغ صاحبھا فیھا قط ساعة إلاکانت فرغتہ علیہ

[1] سورۂ عصر آیت۱۔۲۔

حسرۃ یوم القیامۃ[1]) ''آگاہ ہو جاؤ یہ دنیا دار ابتلاہے اس میں اگر کوئی ایک ساعت بے کار رہتا ہے تو یہ ایک ساعت کی بے کاری روز قیامت حسرت کا باعث ہوگی'' یہاں بے کاری کا مطلب یہ ہے کہ انسان ذکر خدا نہ کرے اور اسکی خوشنودی کے لئے کوئی عمل نہ بجالائے اور اسکے اعضاء وجوارح بھی قربت خدا کے لئے کوئی کام نہ کر رہے ہوں یا یاد خدا میں مشغول نہ ہوں ۔اب اگر ایک گھنٹہ بھی اس طرح خالی اور بے کار رہے چاہے اس دوران کوئی گناہ بھی نہ کرے تو اسکی بنا پر قیامت کے دن اسے حسرت کا سامنا کرنا ہوگا اس لئے کہ اس نے عمر،شعور اور قلب جیسی نعمتوں کو معطل رکھا اور انہیں ذکرو اطاعت خدا میں مشغول نہ رکھ کر اس نے رضائے خدا اور نعمات اخروی حاصل کرنے کا وہ موقع گنوادیا ہے جسکا تدارک قطعاً ممکن نہیں ہے بعد میں چاہے وہ جتنی اخروی نعمتیں حاصل کرلے لیکن یہ ضائع ہوجانے والا موقع بہر حال نصیب نہ ہوگا ۔

۳۔سنت الٰہی یہ ہے کہ انسان ترقی وتکامل اور قرب الٰہی کی منزلیں سختیوں اور مصائب کے ذریعہ طے کرتا ہے ۔ارشاد الٰہی ہے :(أَحَسِبَ الناس أن یُترکوا أن یقولوا آمنا و ھم لایُفتنون[2]) ''کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ صرف اس بات پر چھوڑ دئے جائیں گے کہ وہ یہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور ان کا امتحان نہیں ہوگا'' دوسرے مقام پرارشاد ہوتا ہے: (ولنبلونّکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقصٍ من الأموال والأنفس والثمرات[3]) ''اور ہم یقینا تمہیں تھوڑا خوف تھوڑی بھوک اور اموال ونفوس اور ثمرات کی کمی سے آزمائیں گے ۔''نیزارشاد خداوندی ہے: (فأخذناھم بالبأساء والضرّاء لعلھم یتضرّعون[4]) '' اسکے بعد ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ شاید ہم سے گڑگڑائیں'' یہ آخری آیت واضح الفاظ میں ہمارے لئے خدا کی طرف انسانی قافلہ کی حرکت اور ابتلاء وآزمائش،خوف، بھوک اور جان ومال کی کمی کے درمیان موجود رابطہ کی تفسیر کر رہی ہے کیونکہ تضرع وزاری قرب الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے اور تضرع کی کیفیت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان جان ومال کی کمی، بھوک ،خوف اور شدائد

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب ۵۹۔
[2] سورۂ عنکبوت آیت۲۔
[3] سورۂ بقرہ آیت۱۵۵۔
[4] سورۂ انعام آیت ۴۲۔

ومصائب میں گرفتار ہوتاہے اس طرح انسان کے پاس دنیاوی نعمتیں جتنی زیادہ ہوں گی اسی مقدار میں اسے تضرع سے محرومی کاخسارہ اٹھانا پڑے گا اور نتیجتاً وہ قرب الٰہی کی سعادتوں اور اخروی نعمتوں سے محروم ہوجائے گا ۔ زندگانی دنیا کے مصائب ومشکلات کبھی تو خدا اپنے صالح بندوں کو مرحمت فرماتا ہے تا کہ وہ تضرع وزاری کیلئے آمادہ ہوسکیں اور کبھی اولیائے الٰہی اوربندگان صالح خود ہی ایسی سخت زندگی کواختیار کر لیتے ہیں ۔

۴۔لذائذ دنیا سے کنارکشی کا ایک سبب یہ ہوتا ہے کہ انسان کبھی یہ خوف محسوس کرتا ہے کہ کہیں لذائذ دنیا کا عادی ہوکر وہ بتدریج حب دنیا میں مبتلا نہ ہو جائے اوریہ حب دنیا اسے خدا اور نعمات اخروی سے دور نہ کردے ۔اس لئے کہ لذائذ دنیا اورحب دنیا میں دوطرفہ رابطہ پایا جاتا ہے یہ لذتیں انسان میں حب دنیا کا جذبہ پیدا کرتی ہیں یااس میں شدت پیدا کر دیتی ہیں اس کے برعکس حب دنیا انسان کودنیاوی لذتوں کوآخرت پر ترجیح دینے اوران سے بھرپور استفادہ کرنے بلکہ اسکی لذتوں میں بالکل ڈوب جانے کی دعوت دیتی ہے ۔کہیں ایسا نہ ہوکہ انسان لاشعوری طور پر حب دنیا کا شکار ہو جائے لہٰذا لذائذ دنیاسے ہوشیار رہنا چاہئے کیونکہ عین ممکن ہے کہ یہ لذتیں اسے اسکے مقصد سے دور کردیں ۔

۵۔کبھی ہمیں روایات میں ایسی بات بھی نظر آتی ہے کہ جومذکورہ وضاحتوں سے الگ ہے جیسا کہ مولائے کائنات حضرت علیؑ نے جناب محمدبن ابی بکر کو مصر کا حاکم مقرر کرتے وقت (عہد نامہ میں)ان کے لئے یہ تحریر فرمایا تھا:(واعلموا ۔عباداللہ۔أن المتقین ذہبوا بعاجل الدنیا وآجل الآخرۃ)[1] ''بندگان خدا ایا درکھو کہ پرہیزگار افراد دنیا اور آخرت کے فوائد لے کرآگے بڑھ گئے ۔وہ اہل دنیا کے ساتھ ان کی دنیا میں شریک رہے لیکن اہل دنیا ان کی آخرت میں شریک نہ ہوسکے ۔وہ دنیا میں بہترین انداز سے زندگی گذارتے رہے جو سب نے کھایا اس سے اچھاپاکیزہ کھانا کھایااور وہ تمام لذتیں حاصل کرلیں جو عیش پرست حاصل کرتے ہیں اور وہ سب کچھ پالیا جو جابراور متکبر افراد کے حصہ میں آتا ہے ۔اسکے بعد وہ زادراہ لے کرگئے جو منزل تک پہونچادے اور وہ تجارت

---

[1] نہج البلا غہ مکتوب ۲۷۔

کرکے گئے جس میں فائدہ ہو۔دنیا میں رہ کر دنیا کی لذت حاصل کی اور یقین رکھے رہے کہ آخرت میں پروردگار کے جوار رحمت میں ہوں گے۔جہاں نہ ان کی آواز ٹھکرائی جائے گی اور نہ کسی لذت میں ان کے حصہ میں کوئی کمی ہوگی'' ان جملات میں متقین اور غیر متقین کا موازنہ کیا گیا ہے جبکہ جن روایات کا ہم تجزیہ پیش کررہے تھے انمیں درجات متقین کا موازنہ ہے،نہ کہ متقین اور غیر متقین کا ،ظاہر ہے کہ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں لہٰذا ان دونوں کا حکم بھی الگ ہوگا ۔

باطن بیں نگاہ

دنیا کے بارے میں سرسری اور سطحی نگاہ سے ہٹ کر ہم دنیا پر زیادہ گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ نظر کر سکتے ہیں ۔جسے ہم (الرؤیۃالنافذۃ) کا نام دے سکتے ہیں اس رویت میں ہم دنیا کے ظاہر سے بڑھ کر اس کے باطن کا نظارہ کر سکتے ہیں ۔ جس سے ہمیں معلوم ہوگا کہ دنیا کا ظاہراگر حب دنیا کی طرف لے جاتا ہے اور انسان کو فریب دیتا ہے تو اس کے بر خلاف دنیا کا باطن انسان کو زہداور دنیا سے کنارہ کشی کی دعوت دیتا ہے ۔باطن بیں نگاہ ظاہر سے بڑھکر دنیا کی اندرونی حقیقت کو عیاں کرکے یہ بتاتی ہے کہ متاع دنیا بہر حال فنا ہو جانے والی ہے نیز یہ کہ انسان کا دنیا میں انجام کیا ہوگا ؟یوں انسان خود بخود زہداختیار کر لیتا ہے ۔ روایات میں کثرت سے یہ تاکید کی گئی ہے کہ دنیا کو اس (نظر) سے دیکھنا چاہئے،انسان موت کی طرف متوجہ رہے اور ہمیشہ موت کو یاد رکھے، طویل آرزووں اور موت کی طرف سے غافل ہونے سے منع کیا گیاہے ۔

موت دراصل اس باطنی دنیا کا چہرہ ہے جس سے انسان فرار کرکے موت کو بھلانا چاہتا ہے چنانچہ روایت میں وارد ہوا ہے کہ (موت سے بڑھ کر کوئی یقین ،شک سے مشابہ نہیں ہے) اس لئے کہ موت یقینی ہے،اسمیں شک و شبہ کی گنجائش نہیں اس کے باوجود انسان اس سے گریزاں ہے اور اسے بھلائے رکھنا چاہتا ہے ۔ حالانکہ روایات میں اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:(أکثروا ذکرالموت، فانہ لم یُکثرالانسان ذکرالموت الازھد فی الدنیا[1]) ''موت کو کثرت سے یاد کرو کیونکہ

[1] بحارالانوار ج۷۳ص۶۴۔

انسان جتنا کثرت سے موت کو یاد کرتا ہے اس کے زہد میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے"امیر امومنین حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے: (من صوّرالموتَ بین عینیہ ھان أمرالدنیا علیہ[1]) "جس کی نگاہوں کے سامنے موت ہوتی ہے دنیا کا مسئلہ اس کے لئے آسان ہوتا ہے "آپ ہی کا ارشاد ہے: (أحقّ الناس بالزھادۃ من عرف نقص الدنیا[2]) "جو دنیا کے نقائص سے آگاہ ہے وہ زہد کا زیادہ حقدار ہے" امام موسیٰ کاظمؑ کا ارشاد ہے: (ان العقلاء زھدوا فی الدنیا،ورغبوا فی الآخرۃ[3]) "بے شک صاحبان عقل دنیا میں زاہد اور آخرت کی جانب راغب ہوتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ دنیا طالب بھی ہے مطلوب بھی،اسی طرح آخرت بھی طالب اور مطلوب ہوتی ہے ۔جو آخرت کا طلبگار ہوتا ہے اسے دنیا طلب کرتی ہے اور اپنا حصہ لے لیتی ہے ۔جو دنیا کا طلبگار ہوتا ہے آخرت اس کی طالب ہوتی ہے پھر جب موت آتی ہے تو اس کی دنیا و آخرت دونوں خراب ہو جاتی ہیں۔

روایت میں ہے کہ امام موسیٰ کاظمؑ ایک جنازہ کے سرہانے تشریف لائے تو فرمایا: (ان شیئاً ھذا أوّلہ لحقیق أن یُخاف آخرہ[4]) "جس چیز کا آغاز یہ (مردہ لاش)ہو اس کے انجام کا خوف حق بجانب ہے "ان روایات میں ذکر موت اور زہد کے درمیان واضح تعلق نظر آتا ہے بالفاظ دیگران روایات میں نظریہ یا تھیوری اورپریکٹیکل کے درمیان تعلق کو ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ موت کا ذکر اور اسے یاد رکھنا ایک قسم کا نظریہ اور تھیوری ہے اور زہد اس نظریہ کے مطابق راہ وردش یاپریکٹیکل کی حیثیت رکھتا ہے امیرالمومنین حضرت علیؑ لوگوں کو دنیاکے بارے میں صحیح اور حقیقی نظریہ سے روشناس کراتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: (کونواعن الدنیا نُزّاھا،والیٰ الآخرۃ ولّاھاولاتشیموا بٰارقھا،ولا تسمعوانا طقھا،ولا تجیبوانا عقھا،ولاتستضیؤاباشراقھا،ولاتفتنوابا علاقھا،فإن برقھاخالب،ونطقھاکاذب،واموالھا محروبۃ،واعلاقھا مسلوبۃ[5]) "دنیا سے پاکیزگی اختیار کرو اور آخرت کے عاشق بن جاؤ اس دنیا کے چمکنے والے بادل پر نظر نہ کرو اور اسکے ترجمان کی بات مت سنو،اسکے منادی کی بات پر لبیک مت کہو اور اسکی چمک دمک سے

[1] غرر الحکم ج۲ص۲۰۱۔
[2] غرر الحکم ج۱ص۱۹۹۔
[3] بحارالانوار ج ۷۸ ص ۳۰۱۔
[4] بحارالانوار ج۷۸ ص۳۲۰ ۔
[5] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۱ ۔

روشنی مت حاصل کرو اور اسکی قیمتی چیزوں پر جان مت دو اس لئے کہ اسکی بجلی فقط چمک دمک ہے اور اسکی باتیں سراسر غلط ہیں اسکے اموال لٹنے والے ہیں اور اسکا سامان چھننے والا ہے'' آپ ہی کاارشاد گرامی ہے:(وأخرجوا من الدنیا قلوبکم من قبل ان تخرج منھا ابدانکم[۱]) ''دنیا سے اپنے دلوں کو نکال لو قبل اس کے کہ تمہارے بدن دنیا سے نکالے جائیں'' دنیا سے دل نکال لینے کا مطلب ،دنیا سے قطع تعلق کرنا ہے جسے ہم (ارادی اور اختیاری موت)کا نام دے سکتے ہیں اس کے بالمقابل(قہری اور غیر اختیاری موت)ہے جسمیں ہمارے بدن دنیا سے نکالے جائیں گے ۔امام نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم قہری موت سے پہلے ارادی موت اختیارکرلیں اور دنیا سے قطع تعلق کا ہی دوسرا نام ''زہد''ہے ۔دنیا کے باطن کو دیکھنے والی نظر اور زہد سے اسکے رابطہ کو سمجھنے کے لئے خود زہد کے بارے میں جاننااور گفتگوکرنا ضروری ہے ۔

زہد

زہد،حب دنیا کے مقابل حالت ہے ۔طور وطریقہ اور سلوک کی یہ دونوں حالتیں دو الگ الگ نظریوں سے پیدا ہوتی ہیں ۔ حب دنیا کی کیفیت اس وقت نمودار ہوتی ہے کہ جب انسان دنیا کے فقط ظاہرپر نظر رکھتا ہے اس کے بر خلاف اگر انسان کی نظر دنیا کے باطن کو بھی دیکھ رہی ہے تو اس سے زہد کی کیفیت جنم لیتی ہے ۔چونکہ حب دنیا کا مطلب دنیا سے تعلق رکھنا ہے اور زہد اس کے مقابل کیفیت کا نام ہے تو زہد کا مطلب ہوگا دنیا سے آزاد البتہ اس کے معنی کی وضاحت ضروری ہے ۔حب دنیا کے مفہوم کو سمیٹ کر دو لفظوں میںیوں بیان کیا جاسکتا ہے: ا۔فرحت ومسرت

۲۔حزن وملال:حب دنیا کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کولذائذ دنیا میں جب کچھ بھی نصیب ہو تا ہے تووہ خوش ہوجاتا ہے اور جب وہ کسی نعمت سے محروم رہتا ہے یااس سے کوئی نعمت چھن جاتی ہے تووہ محزون ہوجاتاہے چونکہ زہد حب دنیا کے مقابل کیفیت کا نام ہے لہٰذا زہد کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان دنیا سے اتنا آزاداور بے پرواہ ہوکہ دنیا میں سب کچھ مل جانے پربھی خوشی محسوس نہ

---

[۱] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۴۔

کرے اور کچھ بھی نہ ملنے پر مغموم و محزون نہ ہو ۔خدا وند عالم فر ماتا ہے: (لکیلا تحزنوا علیٰ مافاتکم ولاماا صابکم[1]) ''تاکہ تم نہ اس پر رنجیدہ ہو جو چیز ہاتھ سے نکل گئی ہے اور نہ اس مصیبت پر جو نازل ہوگئی ہے''

دوسری جگہ ارشاد فرماتا ہے: (لکیلا تاسوا علیٰ مافاتکم ولا تفرحوا بماآتاکم[2]) ''تاکہ جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے اسکا افسوس نہ کرو اور جو مل جائے اس پر غروراور فخر نہ کرو ''امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ہے: (الزہد کلہ فی کلمتین من القرآن) ''پورا زہد قرآن کے دو لفظوں میں سمٹا ہوا ہے جیسا کہ خدا کا ارشاد ہے: (لکیلا تأسوا علیٰ مافاتکم[3]) ''تاکہ جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اسکا افسوس نہ کرو''(فمن لم یأس علی الماضی ولم یفرح باآلآ تی فھوالزاہد[4]) جو انسان ماضی پرافسوس نہ کرے اور ہاتھ آجانے والی چیز پر خوش نہ ہووہ زاہد ہے'' ایک دوسرے مقام پر آپ سے روایت ہے'': الزھد کلمة بین کلمتین من القرآن قال اللہ:(لکیلا تأسوا)فمن لم یأس علیٰ الماضی،ولم یفرح باالآ تی،فقد اخذ الزھد بطرفیہ[5] ''

''زہد قرآن کے دو لفظوں کا مجموعہ ہے خدا وند عالم فر ماتا ہے: (لکیلا تأسوا ۔۔۔) ''تاکہ جو تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اسکا افسوس نہ کرو''لہٰذاجو انسان ماضی پر افسوس نہ کرے اور ہاتھ آجانے والی چیز پر خوش نہ ہو اس نے پورا زہد حاصل کرلیا ہے ''امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (من اصبح علی الدنیا حزیناً،فقد أصبح لقضاء اللہ ساخطاً،ومن لھج قلبہ بحب الدنیاالتاط قبلہ منھا بثلاث:ھمّ لایُغبّہ،وحرص لایترکہ،وأمل لایدرکہ[6]) ''جو دنیا کے بارے میں محزون ہوگا وہ قضا و قدر الٰہی سے ناراض ہو گا جس کا دل محبت دنیا کا دلدادہ ہوجائے اسکے دل میں یہ تین چیزیں پیوست ہوجاتی ہیں وہ غم جو اس سے جدا نہیں ہوتا ہے،وہ لالچ جو اسکا پیچھا نہیں چھوڑتی ہے وہ امید جسے وہ کبھی حاصل نہیں کرسکتا ہے'' یہ بھی حزن و فرحت سے آزادی کا ایک رخ ہے کہ دنیا کے بارے

---

[1] سورۂ آل عمران آیت ۱۵۳۔
[2] سورۂ حدید آیت۲۳۔
[3] سورۂ حدید آیت ۲۳۔
[4] بحا ر الانوار ج ۷۸ ص ۷۰۔
[5] بحارالانوار ج ۷۰ ص ۳۲۔
[6] نہج البلاغہ حکمت ۲۲۸۔

میں حزن وملال ،قضا وقدر الٰہی سے ناراضگی کے باعث ہوتا ہے اس لئے کہ انسان دنیا میں جن چیزوں سے بھی محروم ہوتا ہے وہ در حقیقت قضا وقدر الٰہی کے تحت ہی ہوتا ہے نیز حب دنیا انسان میں تین صفتیں پیدا کرتی ہے ہم وغم ،حرص وطمع،آرزو ۔ اس طرح وہ انسان کو ظلم وستم اور عذاب کے پنجوں میں جکڑدیتی ہے ۔امیر المومنین حضرت علیؑ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا :(ایھاالناس انماالدنیا ثلا ثۃ:زاھدوراغب وصابر،فأماالزاھدفلا یفرح بشیٔ من الدنیا أتاہ،ولایحزن علیٰ شیٔ منھا فاتہ واناالصابر فیتمنّاھا بقلبہ،فان ادرکَ منھاشیئاصرف عنھا نفسہ،لما یعلم من سوء عاقبتھا وانا الراغب فلایبالی من حِلّ اصابھا أم من حرام[1]'')''اے لوگو: دنیا کے افراد تین قسم کے ہیں :ا۔زاہد ۲۔صابر ۳۔راغب ا۔زاہد وہ ہے جو کسی بھی چیز کے مل جانے سے خوش یا کسی بھی شے کے نہ ملنے سے محزون نہیں ہوتا ۔

صابر وہ ہے جو دل ہی دل میں دنیا کی تمنا تو کرتا ہے لیکن اگر اسے دنیا مل جاتی ہے تو چونکہ اسکے برے انجام سے واقف ہے لہٰذا اپنا منھ اس سے پھیر لیتا ہے اور راغب وہ ہے کہ جسے یہ پروا نہیں ہے کہ اسے دنیا حلال راستہ سے مل رہی ہے یا حرام راستہ سے ''زہد کے معنی،لوگوں کی تین قسموں اور ان قسموں پر زاہدین کی تقسیم کے سلسلہ میں یہ حدیث عالی ترین مطالب کی حامل ہے ۔اسکے مطابق لوگوں کی تین قسمیں ہیں: زاہد ،صابر اور راغب۔زاہد وہ ہے کہ جو دنیا اور اسکی فرحت وملال سے آزاد ہو۔صابر وہ ہے کہ جو ان چیزوں سے آزاد تو نہیں ہے مگر حب دنیا ،دنیاوی فرحت ومسرت اور حزن وملال سے نجات پانے کے لئے کوشاں ہے ۔

راغب وہ ہے کہ جو دنیا کا اسیر اور اسکی فرحت ومسرت اور حزن و ملال کے آگے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہے۔ ان میں پہلا اور تیسرا گروہ ایک دوسرے کے بالکل مقابل ہے کہ ایک مکمل طریقہ سے آزاد اور دوسرا ہر اعتبار سے مطیع و اسیر جبکہ تیسرا گروہ درمیانی ہے ۔ امیر المومنین حضرت علیؑ لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی فرحت و ملال کا رخ دنیا سے آخرت کی جانب موڑدیں یہی بہترین چیز ہے کیونکہ اگر ہماری کیفیت یہ ہوکہ ہم اطاعت خدا کرکے خوشی محسوس کریں اور اطاعت سے

[1] بحارالانوار ج۱ص۱۲۱۔

محرومی پر محزون ہوں تو یہ بہترین بات ہے اس لئے کہ اس خوشی اور غم کا تعلق آخرت سے ہے ۔ مولائے کائنات حضرت علیؑ، ابن عباس کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں'' :اما بعد !انسان کبھی کبھی ایسی چیز کو پاکر بھی خوش ہوجاتا ہے جو ہاتھ سے جانے والی نہیں تھی اور ایسی چیز کو کھوکر رنجیدہ ہوجاتا ہے جوملنے والی نہیں تھی لہٰذا خبر دار تمہارے لئے دنیا کی سب سے بڑی نعمت، کسی لذت کا حصول یا جذبۂ انتقام ہی نہ بن جائے بلکہ بہترین نعمت باطل کو مٹانے اور حق کو زندہ کرنے کو سمجھو اور تمہیں ان اعمال سے خوشی ہو جنہیں پہلے بھیج دیا ہے اور تمہارا افسوس ان امور پر ہو جنہیں چھوڑکر چلے گئے ہو اور تمام تر فکر موت کے مرحلہ کے بارے میں ہونی چاہئیے[1]''

زہد،تمام نیکیوں کا سرچشمہ

جس طرح حیات انسانی میں حب دنیا تمام برائیوں کی جڑہے اسی طرح تمام نیکیوں اور اچھائیوں کا سرچشمہ ''زہد''ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حب دنیا انسان کو دنیا اور اسکی خواہشات کا اسیر بنادیتی ہے اور دنیا خود تمام برائیوں اور پستیوں کی بنیاد ہے لہٰذا حب دنیا بھی انسان کو برائیوں اور پستیوں کی طرف لے جاتی ہے جبکہ زہد کا مطلب ہے دنیااور خواہشات دنیا سے آزاد ہونا اور جب انسان رائیوں کی طرف لے جانے والی دنیا سے آزاد ہوگا تو اسکی زندگی خود بخود نیکیوں اور اچھائیوں کا سرچشمہ بن جائے گی ۔روایات معصومینؑ میں اس چیز کی طرف متعدد مقامات پر مختلف اندازسے اشارہ کیا گیا ہے بطور نمونہ ہم یہاں چند احادیث پیش کر رہے ہیں۔ امام صادقؑ کا ارشاد ہے: (جُعل الخیر کلہ فی بیت وجُعل مفتاحہ الزھد فی الدنیا[2]) ''تمام نیکیاں ایک گھر میں قرار دی گئی ہیں اور اسکی کنجی دنیا کے سلسلہ میں زہد اختیار کرنا ہے'' امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (الزھد أصل الدین[3]) ''دین کی اصل، زہد ہے ''آپ ہی کا ارشاد ہے: (الزھد اساس الدین[4]) ''دین کی اساس اور بنیاد، زہد ہے'' امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے: (الزھد فتاح

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب ۶۶۔
[2] بحارالانوار ج۷۳ص۴۹۔
[3] غررالحکم ج۱ص۲۹۔
[4] غررالحکم ج۱ص۳۰۔

باب الآخرۃ،والبرا ءۃ من النار،وھو ترکک کل شئ یشغلک عن اللہ من غیرتأسف علیٰ فوتھا ولا أعجاب فی ترکھا،ولاانتظارفرج منھا،ولاطلب محمدۃ علیھا،ولاعوض منھا،بل تریٰ فواتھاراحۃ،وکونھاآفۃ،وتکون أبداً ھارباً من الآفۃ،معتصماً بالراحۃ[1]) ''زہد،باب آخرت کی کنجی اور جہنم سے نجات کا پروانہ ہے ۔زہد کا مطلب یہ ہے کہ تم ہراس چیز کو ترک کردو جو تمہیں یاد خدا سے غافل کردے اور تمہیں اسکے چھوٹ جانے کا نہ کوئی افسوس ہواور نہ اسے ترک کرنے میں کوئی زحمت ہو ۔اس کے ذریعہ تمہاری کشادگی کی توقع نہ ہو،نہ ہی اس پر تعریف کی امید رکھو، نہ اسکا بدلہ چاہو بلکہ اسکے فوت ہوجانے میں ہی راحت اور اسکی موجودگی کو آفت سمجھوایسی صورت میں تم ہمیشہ آفت سے دوراورراحت وآرام کے حصار میں رہوگے ''

حضرت علیؑنے فرمایا ہے: (الزھد مفتاح الصلاح[2]) ''زہد صلاح کی کنجی ہے'' زہد کے آثارحیات انسانی میں زہد کے بہت عظیم آثار و نتائج پائے جاتے ہیں جنہیں زاہد کے نفس اور اسکے طرز زندگی میں بخوبی محوس کیا جاسکتا ہے ۔

۱۔آرزووں میں کمی حب دنیا کا نتیجہ آرزووں کی کثرت ہے اور زہد کا نتیجہ آرزووں میں کمی۔ جب انسان کا تعلق دنیا سے کم ہو اوروہ خواہشات دنیا سے آزاد ہوتو طبیعی طور پر اسکی آرزوئیں بھی مختصر ہوں گی وہ دنیا میں زندگی بسر کرے گا متاع زندگانی اوردنیاوی لذتوں سے استفادہ کرے گا لیکن ہمیشہ موت کو بھی یاد رکھے گا اور اسی طرح یہ بات بھی اسکے پیش نظر رہے گی کہ ان چیزوں کا سلسلہ کسی بھی وقت اچانک ختم ہوجائے گا ۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: (من یرغب فی الدنیا فطال فیھا أملہ،أعمیٰ اللہ قلبہ علیٰ قدررغبتہ فیھا، ومن زھد فیھا فقصرفیھاأملہ،أعطاہ اللہ علماًبغیر تعلّم،وھدیً بغیرھدایۃ،وأذھب عنہ العماء،وجعلہ بصیراً[3]) ''جو شخص دنیا کی طرف راغب ہوتاہے اسکی آرزوئیں طولانی ہوتی ہیں اور دنیا کی طرف اسکی رغبت کے مطابق اللہ اسکے قلب کو اندھا کردیتاہے اور جو دنیا میں زاہد ہوتاہے اسکی آرزوئیں مختصر ہوتی ہیں اور اللہ اسے تعلیم کے بغیر علم اوراسباب ہدایت کے بغیر ہدایت عطا

[1] بحار الانوار ج ۷۰ ص۳۱۵۔
[2] غررالحکم ص۹۹،۳۷۔۸۔
[3] بحارالانوار ج۷۷ص۲۶۳۔

کرتاہے۔اوراس سے اندھے پن کو دور کرکے اسکو بصیر بنا دیتاہے'' اس روایت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ زہد ،سے آرزوئیں کم ہوجاتی ہیں اور اس کمی سے بصیرت اورہدایت ملتی ہے اسکے برعکس دنیا کی جانب رغبت سے آرزووں میں کثرت پیدا ہوتی ہے اور یہ کثرت اندھے پن کا سبب ہے توآخر آرزووں کی قلت اور بصیرت کے درمیان کیا تعلق ہے ؟اسکا راز یہ ہے کہ طویل آرزوئیں انسان کو دنیا میں اس طرح جکڑدیتی ہیں کہ انسان اس سے بیحد محبت کرنے لگتا ہے اوردنیاکی محبت ا انسان اور خدا کے درمیان حجاب بن جاتی ہے اور جب آرزوئیں مختصر ہوتی ہیں تو یہ حجاب اٹھ جاتا ہے۔اور ظاہر ہے کہ جب قلب کے حجابات دور ہوجائیں گے تواس میں بصیرت پیدا ہوجائے گی ۔

پیغمبر اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: (الزھد فی الدنیا قصر الأمل،وشکر کل نعمۃ،والورع عن کل ما حرم اللہ[1]) ''دنیا میں زہد کا مطلب یہ ہے کہ آرزوئیں قلیل ہوں،ہر نعمت کا شکر ادا کیا جائے اور محرمات الٰہی سے پرہیز کیا جائے''امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (الزھد تقصیر الآمال،واخلاص الاعمال[2]) ''آرزووں میں کمی اور اعمال میں خلوص کا نام زہد ہے'' آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے: (أیھا الناس،الزھادۃ قصر الأمل،والشکر عند النعم،والتورع عند المحارم،فان عزب ذلک عنکم،فلایغلب الحرام صبرکم،ولاتنسوا عند النعم شکرکم،فقد أعذر اللہ الیکم بحجج مسفر ۃظاھرۃ،وکتب بارزۃالعذر واضحۃ[3]) ''اے لوگوں:زہد امیدوں کے کم کرنے ،نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے اور محرمات سے پرہیز کرنے کا نام ہے ۔اب اگر یہ کام تمہارے لئے مشکل ہوجائے توکم ازکم اتنا کرناکہ حرام تمہاری قوت برداشت پر غالب نہ آنے پائے اور نعمتوں کے موقع پر شکر کو فراموش نہ کردینا کہ پروردگار نے نہایت درجہ واضح اور روشن دلیلوں اور حجت تمام کرنے والی کتابوں کے ذریعہ تمہارے ہر عذر کا خاتمہ کردیا ہے''

---
[1] بحار الانوار ج۷۷ص۱۶۶۔
[2] غرر الحکم ج۱ص۹۳۔
[3] نہج البلاغہ خطبہ ۸۱۔

۲۔دنیاوی تاثرات سے نجات اورآزادی:دنیاوی نعمتیں ملنے سے نہ انسان خوشی محوس کرے گا اور نہ ان سے محرومی پر محزون ہوگا ۔امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (فمن لم یأس علیٰ الماضی،ولم یفرح بالآتی فقد أخذ الزھد بطرفیہ[1]) ''جو شخص ماضی پر افسوس نہ کرے اور ہاتھ آنے والی چیزوں سے مغرور نہ ہوجائے اس نے سارا زہد سمیٹ لیا ہے'' امیر المومنینؑ کے ہر کلام کی مانند حیات انسانی میں زہد کے نتائج کے بارے میں شاہکار کلام پایا جاتا ہے ہم یہاں اس کلام کو نہج البلاغہ سے نقل کر رہے ہیں ۔ ''اپنے کانوں کو موت کی آواز سنادو قبل اسکے کہ تمہیں بلالیا جائے دنیا میں زاہدوں کی شان یہی ہوتی ہے کہ وہ خوش بھی ہوتے ہیں تو ان کا دل روتا رہتاہے اور وہ ہنستے بھی ہیں تو ان کا رنج و اندوہ شدید ہوتاہے۔

وہ خود اپنے نفس سے بیزار رہتے ہیں چاہے لوگ ان کے رزق سے غبطہ ہی کیوں نہ کریں ۔افسوس تمہارے دلوں سے موت کی یاد نکل گئی ہے اور جھوٹی امیدوں نے ان پر قبضہ کرلیا ہے۔اب دنیا کا اختیار تمہارے اوپر آخرت سے زیادہ ہے اور وہ عاقبت سے زیادہ تمہیں کھینچ رہی ہے ۔تم دین خدا کے اعتبار سے بھائی بھائی تھے۔ لیکن تمہیں باطن کی خباثت اور ضمیر کی خرابی نے الگ الگ کردیا ہے کہ اب نہ کسی کا بوجھ بٹاتے ہو۔نہ نصیحت کرتے ہو۔نہ ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہواور نہ ایک دوسرے سے واقعاً محبت کرتے ہو۔آخر تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ معمولی سی دنیا کو پاکر خوش ہوجاتے ہو اور مکمل آخرت سے محروم ہوکر رنجیدہ نہیں ہوتے ہو۔تھوڑی سی دنیا ہاتھ سے نکل جائے تو پریشان ہوجاتے ہو اور اسکا اثر تمہارے چہروں سے ظاہر ہوجاتاہے اور اس کی علیٰحدگی پر صبر نہیں کرپاتے ہو جیسے وہی تمہاری منزل ہے اور جیسے اس کا سرمایہ واقعی باقی رہنے والا ہے۔تمہاری حالت یہ ہے کہ کوئی شخص بھی دوسرے کے عیب کے اظہار سے باز نہیں آتا ہے مگر صرف اس خوف سے کہ وہ بھی اسی طرح پیش آئے گا ۔تم سب نے آخرت کو نظر انداز کرنے اور دنیا کی محبت پر اتحاد کرلیاہے اور ہر ایک کا دین زبان کی چٹنی بن کر رہ گیا ہے ۔ایسا لگتا ہے کہ جیسے سب نے اپنا عمل مکمل کرلیا ہے اور اپنے مالک کو واقعا خوش کرلیا ہے[2]۔''

[1] بحارالانوار ج۷۰ص۳۲۰،نہج البلاغہ حکمت ۴۳۹۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۱۳

۳۔ دنیا پر عدم اعتماد :انسانی نفس کے اوپر زہد کے آثار میں سے ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ زاہد کبھی بھی دنیا پر اعتماد نہیں کرتا ۔انسان جب دنیا سے محبت کرنے لگتا ہے اور اس کا نفس دنیا میں الجھ جاتا ہے تو وہ دنیا پر بھروسہ کرتا ہے اور دنیا کو ہی اپنا ٹھکانہ اوردائمی قیام گا ہ مان لیتا ہے لیکن جب انسان کے اندر زہد کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اوروہ اپنے دل سے حب دنیا کونکال دیتا ہے تو پھراسے دنیا پر اعتبار بھی نہیں رہ جاتا اور وہ دنیا کو محض ایک گذرگاہ اور آخرت کے لئے ایک پُل تصور کرتاہے ۔دنیا کے بارے میں لوگوں کے درمیان دو طرح کے تصورات پائے جاتے ہیں ۔کچھ افراد دنیا کو قیام گاہ مان کر اس سے دل لگا لیتے ہیں اور کچھ لوگ دنیا کوگذر گاہ اور آخرت کے لئے ایک پل سمجھ کر اس سے دل نہیں لگاتے ۔

دو نوں قسم کے افراد اسی دنیا میں رہتے ہیں اورخدا کی نعمتوں سے استفادہ کرتے ہیں مگر ان کے درمیان فرق یہ ہے کہ پہلے گروہ کا منظور نظر خود دنیا ہوتی ہے اور وہ اسی کو سب کچھ مانتے ہیں یہاں تک کہ موت ان سے دنیا کو الگ کردیتی ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے کہ جو دنیا کو سب کچھ سمجھ کر اس سے دل نہیں لگاتا بلکہ اسے گذر گاہ اور پل کی حیثیت سے دیکھتا ہے لہٰذا جب موت آتی ہے تو دنیا کی مفارقت ان پر گراں نہیں گذرتی ہے۔دنیا میں انسان کی حالت او راس میں اسکے قیام کی مدت کو روایات میں بہترین مثالوں کے ذریعہ بیان کیا گیا ہے ایک مثال کے بموجب دنیامیں انسان کا قیام ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی سوار راستہ میں سورج کی گرمی سے پریشان ہوکر کسی سایہ داردرخت کے نیچے بیٹھ جاتا ہے اور تھوڑی دیر آرام کے بعد پھر اپنے کام کے لئے چل پڑتا ہے ۔کیا ایسی صورت میں دنیا کو اپنا ٹھکانہ، دائمی قیام گاہ سمجھنا اور اس سے دل لگانا صحیح ہے ؟پیغمبر اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: (مالی وللدنیا،انما مثلی کمثل راکبٍ مرّ للقیلولۃ فی ظلّ شجرۃ فی یوم صائف ثم راح وترکھا[1]) '' دنیا سے میرا کیا تعلق ؟میری مثال تو اس سوار کی سی ہے جوتیز ہواؤں کے تھپیڑوں کے درمیان آرام کی خاطر کسی درخت کے نیچے لیٹ جاتا ہے اور پھر اس جگہ کو چھوڑکر چل دیتا ہے ''امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے فرزند امام حسنؑ کو یہ وصیت فرمائی ہے: (یابنیّ انی قدأنبأتک عن الدنیا

[1] بحارالانوار ج۷۳ص۱۱۹۔

وحالها،وزوالها،وانتقالها،وأنبأتک عن الآخرۃوماأعد لأهلها فیها،وضربتلک فیهما الأمثال،لتعتبربها، وتحذو علیها،انما مثل من خبرالدنیا کمثل قوم سفرنبا بهم منزل جذیب فأمّوا منزلاًخصیباً، وجناباً مریعاً،فاحتملوا وعثاء الطریق،وفراق الصدیق،وخشونۃالسفرومثل من اغتربها کمثل قوم کانوابمنزل خصیب فنبابهم الیٰ منزل جذیب،فلیس شیء أکره الیهم ولاأفضع عندهم من مفارقۃ ماکانوا فیه الیٰ مایهجمون علیه ویصیرون الیه[1]) '' اے فرزند میں نے تمہیں دنیااوراسکی حالت اوراسکی بے ثباتی و ناپائیداری سے خبردار کردیا ہے ۔اور آخرت اور آخرت والوں کے لئے جو سروسامان عشرت مہیاہے اس سے بھی آگاہ کردیا ہےاور ان دونوں کی مثالیں بھی تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں تاکہ ان سے عبرت حاصل کرو

اور ان کے تقاضے پر عمل کرو۔جن لوگوں نے دنیا کو خوب سمجھ لیا ہے ان کی مثال ان مسافروں کی سی ہے جن کا قحط زدہ منزل سے دل اچاٹ ہوا،اور انھوں نے راستے کی دشواریوں کو جھیلا، دوستوں کی جدائی برداشت کی،سفر کی صعوبتیں گوارا کیں،اور کھانے کی بد مزگیوں پر صبر کیاتاکہ اپنی منزل کی پہنائی اور دائمی قرارگاہ تک پہنچ جائیں ۔اس مقصد کی دھن میں انھیں ان سب چیزوں سے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔اور جتنا بھی خرچ ہوجائے اس میں نقصان معلوم نہیں ہوتا ۔

انھیں سب سے زیادہ وہی چیز مرغوب ہے جو انہیں منزل کے قریب اور مقصد سے نزدیک کردے اور اسکے برخلاف ان لوگوں کی مثال جنہوں نے دنیا سے فریب کھایاان لوگوں کی سی ہے جو ایک شاداب سبزہ زار میں ہوں اور وہاں سے دل برداشتہ ہوجائیں اور اس جگہ کا رخ کرلیں جو خشک سالیوں سے تباہ ہو۔ان کے نزدیک سخت ترین حادثہ یہ ہوگا کہ وہ موجودہ حالت کو چھوڑکرادھر جائیں کہ جہاں انھیں اچانک پہنچناہے اور بہر صورت وہاں جاناہے '' حضرت عمر ،پیغمبر اکرم ﷺکی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا آپ ایک بورئیے پر آرام فرمارہے ہیں اور آپ کے پہلو پر اسکا نشان بن گیاہے توعرض کی اے نبی خدا :(یانبیّ اللہ،لواتخذت فراشاً أوثر منہ؟فقال (ص):مالی وللدنیا،مامثلی ومثل الدنیا الاکراکب سارفی یوم صائف فاستظلّ تحت شجرۃ ساعۃ من

[1] نہج البلاغہ مکتوب ۳۱۔

نھار،ثم راح وترکھا[1]) اگر آپ اس سے بہتر بستر بچھا لیتے تو کیا تھا؟پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا : ''دنیا سے میرا کیا تعلق؟میری اور دنیا کی مثال ایک سوار کی سی ہے جوتیز ہواؤں کے درمیان چلا جارہا ہو اور دن میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے کسی سایہ داردرخت کے نیچے رک جائے اور پھر اس جگہ کوچھوڑ کرآگے بڑھ جائے''امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (ان الدنیالیست بدارقرارولامحلّ اقامۃ،انّما أنتم فیھاکرکب عرشوا وارتاحوا،ثم استقلّوا فغدوا وراحوا،دخلوھاخفافاً،وارتحلوا عنھا ثقالاً،فلم یجدوا عنھانزوعاً،ولاالی ما ترکوبھارجوعاً[2])

''یہ دنیا دار القرار اور دائمی قیام گا ہ نہیں ہے تم یہاں سوار کی مانند ہو ،جنھوں نے کچھ دیرکیلئے خیمہ لگایا اور پھر چل پڑے پھر دوسری منزل پر تھوڑا آرام کیا اور صبح ہوتے ہی کوچ کر گئے،ہلکے پھلکے (آسانی سے)اترے اور لاد پھاند کر مشکل سے روانہ ہوئے نہ انہیں اسکا کبھی اشتیاق ہوا اور جس کو ترک کرکے آگئے نہ اسکی طرف واپسی ممکن ہوئی''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا :انسان دنیا میں کیسے زندگی بسر کرے ؟آپ نے فرمایا جیسے قافلہ گذرتا ہے۔ دریافت کیا گیا اس دنیا میں قیام کتنا ہے ؟آپ نے فرمایا جتنی دیر قافلہ سے چھوٹ جانے والا رہتا ہے ۔

دریافت کیا گیا!دنیا وآخرت میں فاصلہ کتنا ہے ؟آپ نے فرمایا پلک جھپکنے کا[3]۔اور اس آیۂ کریمہ کی تلاوت فرمائی: (کأنّھم یوم یرون ما یوعدون لم یلبثوا الاساعۃ من نھار[4]) ''تو ایسا محسوس کرینگے جیسے دنیا میں ایک دن کی ایک گھڑی ہی ٹھہرے ہیں''

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (الدنیاظلّ الغمام،وحلم المنام[5]) ''دنیا بادل کا سایہ اورسونے والے کا خواب ہے'' امام محمد باقرؑ نے فرمایا : (ان الدنیاعند العلماء مثل الظل[6]) ''اہل علم کے نزدیک دنیا سایہ کے مانند ہے'' امیر المومنین حضرت علیؑ کا

[1] بحارالانوار ج ۷۳ص۱۲۳۔
[2] بحارالانوار ج۷۸ص۱۸۔
[3] بحارالانوار ج۷۳ص۱۲۲۔
[4] سورۂ احقاف آیت ۳۵۔
[5] غررالحکم ج۱ص۱۰۲۔
[6] بحارالانوار ج۷۳ص۱۲۶۔

ارشاد ہے: (ألاوان الدنیا دار لایسلم منھا الافیھا،ولاینجیٰ بشی ء کان لھا،ٲبتلی الناس فیھا فتنة فأخذوہ منھا لھاأخرجوا منہ و حوسبوا علیہ،وماأخذوہ منھا لغیرھا، قدموا علیہ وأقاموا فیہ،فانھا عند ذوی العقول کفیٔ الظلّ بینا تراہ سابغاً حتیٰ قلص،وزائداً حتیٰ نقص[1]) ''یاد رکھو یہ دنیا ایسا گھر ہے جس سے سلامتی کا سامان اسی کے اندر سے کیا جاسکتا ہے اور کوئی ایسی شے وسیلہ نجات نہیں ہوسکتی ہے جو دنیا ہی کے لئے ہو۔لوگ اس دنیا کے ذریعہ آزمائے جاتے ہیں جو لوگ دنیا کا سامان دنیا ہی کے لئے حاصل کرتے ہیں وہ وہاں جاکر پا لیتے ہیں اور اسی میں مقیم ہوجاتے ہیں ۔یہ دنیا در حقیقت صاحبان عقل کی نظر میں ایک سایہ جیسی ہے جو دیکھتے دیکھتے سمٹ جاتا ہے

اور پھیلتے پھیلتے کم ہوجاتا ہے'' دنیا ایک پل دین اسلام مسلمان کو دنیا کے بارے میں ایک ایسے نظریہ کا حامل بنانا چاہتا ہے کہ اگر اسکے دل میں یہ عقیدہ و نظریہ راسخ ہوجائے تو پھر دنیا کو ایک ایسے پل کے مانند سمجھے گا جس کے اوپر سے گذر کر اسے جانا ہے اور اس مسلمان کی نگاہ میں یہ دنیا دار القرار نہیں ہوگی ۔جب ایسا عقیدہ ہوگا تو خود بخود مسلمان دنیا پر فریفتہ نہ ہوگا اور اسکی عملی زندگی میں بھی اس کے نتائج نمایاں نظر آئیں گے۔ حضرت عیسیٰ کا ارشاد ہے: (انما الدنیا قنطرة[2]) ''دنیا ایک پل ہے'' امیر المومنین حضرت علی کا ارشاد گرامی ہے: (أیھاالناس انماالدنیا دار مجاز والآخرة دار قرار،فخذوا من ممرّکم لمقرّکم،ولاتھتکوا أستارکم عند من یعلم أسرارکم[3]) ''اے لوگو !یہ دنیا گذر گاہ ہے اور آخرت دار قرار ہے لہٰذا اپنے راستہ سے اپنے ٹھکانے کے لئے توشہ اکٹھا کرلو اور جو تمہارے اسرار کو جانتا ہے اس کے سامنے اپنے پردوں کو چاک نہ کرو'' آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے: (الدنیا دار ممرّ ولادار مقرّ،والناس فیھا رجلان:رجل باع نفسہ فأوبقھا، ورجل ابتاع نفسہ فأعتقھا[4]) ''دنیا گذر گاہ ہے دار القرار نہیں اس میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں کچھ وہ ہیں جنھوں نے دنیا کے ہاتھوں اپنا نفس بیچ دیا تو وہ دنیا کے غلام ہوگئے کچھ وہ ہیں جنھوں نے اپنے نفس کو خرید لیااور دنیا کو آزاد کردیا''

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۶۳۔
[2] بحارالانوار ج۱۴ص۳۱۹۔
[3] نہج البلاغہ خطبہ۲۰۳۔
[4] شرح نہج البلاغہ ج۱۸ص۳۲۹۔

اسباب ونتائج کا رابطہ

اسلامی فکر کا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسانی مسائل سے متعلق اسباب و نتائج کو ایک دوسرے سے لاتعلق قرار نہیں دیتی بلکہ انھیں آپس میں ملاکر دیکھنے اور پھر اس سے نتیجہ اخذ کرنے کی قائل ہے جب ہم انسانی اسباب و نتائج کے بارے میں غور کرتے ہیں تو ان مسائل میں اکثر دو طرفہ رابطہ نظر آتا ہے یعنی دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔انسانی مسائل میں ایسے دوطرفہ رابطوں کی مثالیں بکثرت موجود ہیں مثلاًآپ زہد اور بصیرت کو ہی دیکھئے کہ زہد سے بصیرت اور بصیرت سے زہد میں اضافہ ہوتا ہے ۔یہاں پر ہم ان دونوں سے متعلق چند روایات پیش کر رہے ہیں ۔

زہد وبصیرت (أفمن شرح اللّٰہ صدرہ للاسلام فھو علیٰ نورٍمن ربّہ)کی تفسیر کے ذیل میں پیغمبر اکرم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: (ان النوراذاوقع فی القلب انفسح لہ وانشرح)قالوا یارسول اللہ: فھل لذٰلک علامۃیعرف بھا؟قال:(التجافی من دارالغرور،والانابۃ الیٰ دارا لخلود، والاستعداد للموت قبل نزول الموت) ''قلب پر جب نور کی تابش ہوتی ہے تو قلب کشادہ ہوجاتا ہے اور اس میں وسعت پیدا ہوجاتی ہے عرض کیا گیا یا رسول اللہ اسکی پہچان کیا ہے ؟آپ نے فرمایا'': دار الغرور (دنیا)سے دوری ،دارا لخلود (آخرت)کی طرف رجوع اور موت آنے سے پہلے اسکے لئے آمادہ ہوجانا ہے[۱]''

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (أحقّ الناس بالزھادۃ،من عرف نقص الدنیا[۲]) ''جو دنیا کے نقائص سے آگاہ ہے اسے زیادہ زاہد ہونا چاہئے'' آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے: (من صوّرالموت بین عینیہ،ھان أمرالدنیا علیہ[۳]) ''جس کی دونوں آنکھوں کے سامنے موت کھڑی رہتی ہے اس کے لئے دنیا کے امور آسان ہوجاتے ہیں'' نیز آپ نے فرمایا :(زھدالمرء فیمایفنیٰ،علی قدر یقینہ فیما یبقیٰ[۴]) ''فانی اشیاء(دنیا)کے بارے میں انسان اتنا ہی زاہد ہوتا ہے جتنا اسے باقی اشیاء (آخرت)کے بارے میں یقین ہوتا

---

[۱] بحارالانوار ج۷۳ص۱۲۲۔
[۲] غررالحکم۔
[۳] غررالحکم ۔
[۴] بحارالانوار ج۷۰ص۳۱۹۔

ہے'' زہد و بصیرت کا رابطہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر (رح) سے فرمایا: (یاأباذر:مازھد عبد فی الدنیا،الاأنبت اللہ الحکمۃ فی قلبہ،وأنطق بھالسانہ ،وبصّرہ عیوب الدنیا وداء ھا ودواء ھا،وأخرجہ منھاسالماًالی دارالسلام[1]) '' اے ابوذر جو شخص بھی زہداختیار کرتاہے اللہ اس کے قلب میں حکمت کا پودا اگا دیتا ہے اور اسے اسکی زبان پر جاری کر دیتا ہے اسے دنیا کے عیوب ،اوردرد کے ساتھ انکاعلاج بھی دکھا دیتا ہے اور اسے دنیا سے سلامتی کے ساتھ دارالسلام لے جاتا ہے'' ،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: (من یرغب فی الدنیا فطال فیھاأملہ،أعمیٰ اللہ قلبہ علیٰ قدررغبتہ فیھا، ومن زھد فیھا فقصرأملہ أعطاہ اللہ علماًبغیر تعلّم،وھدیً بغیرھدایۃ،وأذھب عنہ العماء وجعلہ بصیراً[2]) جو دنیا سے رغبت رکھتا ہے اسکی آرزوئیں طویل ہوجاتی ہیں اوروہ جتنا راغب ہوتا ہے اسی مقدار میں خدا اسکے قلب کوا ندھا کر دیتا ہے اور جو زہد اختیار کر تا ہے اسکی آرزوئیں قلیل ہوتی ہیں اللہ اسے تعلیم کے بغیر علم اور رہنما ئی کے بغیرہدایت عطا کرتا ہے اور اس کے اندھے پن کو ختم کر کے اسے بصیر بنا دیتا ہے''

ایک دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے درمیان آئے اور فرمایا: (ھل منکم من یریدأن یؤتیہ اللہ علماًبغیر تعلّم،وھدیاًبغیرھدایۃ؟ھل منکم من یریدأن یذھب عنہ العمیٰ و یجعلہ بصیراً؟ألاانہ من زھد فی الدنیا،وقصرأملہ فیھاأعطاہ اللہ علماًبغیر تعلّم،وھدیاً بغیرھدایۃ[3]) ''کیا تم میں سے کوئی اس بات کا خواہاں ہے کہ اللہ اسے تعلیم کے بغیر علم اور رہنمائی کے بغیرہدایت دیدے ۔ تم میں سے کوئی اس بات کا خواہاں ہے کہ اللہ اس کے اندھے پن کو دور کر کے اسے بصیر بنادے ؟آگاہ ہو جاؤ جو شخص بھی دنیا میں زہداختیار کر ے گااور اپنی آرزوئیں قلیل رکھے گا اللہ اسے تعلیم کے بغیر علم اور رہنمائی کے بغیرہدایت عطاکرے گا '' ،پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (یاأباذر،اذارأیت أخاک قدزھد فی الدنیا فاستمع منہ،فانہ یُلقّیٰ الحکمۃ[4]) ''اے ابوذراگر تم اپنے کسی بھائی کو دیکھو کہ وہ دنیا میں زاہد ہے تو اسکی باتوں کو (دھیان سے) سنو کیونکہ اسے حکمت عطا کی گئی ہے'' ان روایات سے معلوم ہو تا ہے کہ زہد وبصیرت میں دو

[1] بحارالانوار ج۷۷ص۸۔
[2] بحارالانوار ج۷۷ص۲۶۳۔
[3] درالمنثور ج۱ص۶۷۔
[4] بحارالانوار ج۷۷ص۸۰ ۔

طرفہ رابطہ ہے یعنی زہد کا نتیجہ بصیرت اور بصیرت کا نتیجہ زہد ہے ۔اسی طرح زہد اور قلتِ آرزو کے مابین بھی دو طرفہ رابطہ ہے زہد سے آرزووں میں کمی اور اس کمی سے زہد پیدا ہوتا ہے زہد اورقلت آرزو کے درمیان رابطہ کے بارے میں امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے :(الزهد یخلق الابدان،ویحدد الآمال،ویقرّب المنیة،ویباعد الأمنیة،من ظفر به نصب،ومن فاته تعب[1]) ''زہد،بدن کو مناسب اور معتدل ،آرزووں کو محدود،موت کو نگاہوں سے نزدیک اور تمناؤں کو انسان سے دور کردیتا ہے جو اسکو پانے میں کامیاب ہوگیا وہ خوش نصیب ہےاور جو اسے کھو بیٹھا وہ دردسر میں مبتلاہوگیا''

آرزووں کی کمی اورزہد کے رابطہ کے بارے میں امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے:(استجلب حلاوة الزهادة بقصر الامل[2]) ''آرزو کی قلت سے زہد کی حلاوت حاصل کرو''ان متضاد صفات کے درمیان دو طرفہ رابطہ کا بیان اسلامی فکر کے امتیازات میں سے ہے زہد وبصیرت یا زہد وقلتِ آرزو کے درمیان دو طرفہ رابطہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کے اندر ایک دوسرے کے ذریعہ اضافہ ہوتا رہتا ہےاور اس سے انسان ترقی کرتا رہتا ہے ۔اس طرح کہ بصیرت سے زہد کی کیفیت پیدا ہوتی ہےاور جب انسان زاہد ہو جاتا ہے تو بصیرت کے اعلیٰ مراتب حاصل ہو جاتے ہیں نیز بصیرت کے ان اعلیٰ مراتب سے زہد میں اضافہ ہوتا ہے اور اس زہد سے پھر بصیرت کے مزید اعلیٰ مراتب وجود پاتے ہیں۔اسطرح انسان ان دونوں صفات وکمالات کے ذریعہ بلندیوں تک پہنچ جاتا ہے۔مذموم دنیا اور ممدوح دنیا ا۔مذموم دنیااس سے قبل ہم نے ذکر کیا تھا کہ دنیا کے دو چہرے ہیں:

۱:ظاہری

۲:باطنی

---

[1] بحارالانوارج ۷۰ص۳۱۷۔

[2] بحارالانوار ج۷۸ص۱۶۴۔

دنیا کا ظاہری چہرہ فریب کا سر چشمہ ہے ۔یہ چہرہ انسانی نفس میں حب دنیا کا جذبہ پیدا کرتا ہے جبکہ باطنی چہرہ ذریعۂ عبرت ہے یہ انسان کے نفس میں زہد کا باعث ہوتا ہے روایات کے مطابق دنیا کا ظاہری چہرہ مذموم ہے اور باطنی چہرہ ممدوح ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ واقعاً دنیا کے دو چہرے ہیں یہ فرق در حقیقت دنیا کو دیکھنے کے انداز سے پیدا ہوتا ہے ورنہ دنیا اور اسکی حقیقت ایک ہی ہے ۔فریب خوردہ نگاہ سے اگر دنیا کو دیکھا جائے تو یہ دنیا مذموم ہوجاتی ہے اور اگر دیدۂ عبرت سے دنیا پر نگاہ کی جائے تو یہی دنیا ممدوح قرار پاتی ہے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لذات وخواہشات سے لبریز دنیا کا ظاہری چہرہ ہی مذموم ہے ۔یہاں پر دنیا کے مذموم رخ کے بارے میں چند روایات پیش کی جارہی ہیں ۔امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا:(الدنیا سوق الخسران[1]) ''دنیا گھاٹے کا بازار ہے''

آپ ہی کا ارشاد ہے: (الدنیا مصرع العقول[2]) ''دنیا عقلوں کا میدان جنگ ہے'' آپ کا ہی ارشاد ہے: (الدنیا ضحکة مستعبر[3]) ''دنیا چشم گریاں رکھنے والے کے لئے ایک ہنسی ہے'' آپ ہی کا ارشاد ہے: (الدنیا مُطَلَّقَۃُ الاکیاس[4]) ''دنیا ذہین لوگوں کی طلاق شدہ بیوی ہے'' آپ ہی کا ارشاد ہے: (الدنیا معدن الشرور،ومحل الغرور[5]) ''دنیا شر وفساد کا معدن اور دھوکے کی جگہ ہے'' آپ ہی کا ارشاد ہے: (الدنیا لا تصفولشارب،ولا تفی لصاحب[6]) ''دنیا کسی پینے والے کے لئے صاف وشفاف اور کسی کے لئے باوفا ساتھی نہیں ہے'' آپ ہی کا ارشاد ہے: (الدنیا مزرعة الشر[7]) ''دنیا شر وفساد کی کاشت کی جگہ ہے'' آپ ہی کا ارشاد ہے: (الدنیا مُنیة الاشقیاء[8]) ''دنیا اشقیا کی آرزو ہے'' آپ ہی کا ارشاد ہے: (الدنیا تُسْلِمُ[9]) ''دنیا دوسرے کے حوالے کر دیتی

---

[1] غررا لحکم ج ۱ص۲۶۔
[2] غررالحکم ج۱ص۴۵۔
[3] غررالحکم ج۱ص۲۶۔
[4] غررالحکم ج۱ص۲۸۔
[5] غررالحکم ج۱ص۷۳۔
[6] غررالحکم ج۱ص ۸۵۔
[7] غررالحکم ج۱ص۲۶۔
[8] غررالحکم ج۱ص۳۷۔
[9] غررالحکم ج۱ص۱۱۔

ہے''آپ ہی کا ارشاد ہے: (الدنیا تذِل[1]) '' دنیا ذلیل کرنے والی ہے''دنیا سے بچاؤامیر المومنین حضرت علیؑ ہمیں دنیا سے اس انداز سے ڈراتے ہیں: (أحذّرکم الدنیا فانّھا لیست بدار غبطۃ،قد تزیّنت بغرورھا،وغرّت بزینتھا لمن ان یتطرالیھا[2]) ''میں تمہیں دنیا سے ڈراتا ہوں کیونکہ یہ فخرومباہات کا گھر نہیں ہے ۔یہ اپنے فریب سے مزین ہے اور جو شخص اسکی طرف دیکھتا ہے اسے اپنی زینت سے دھوکے میں مبتلا کردیتی ہے'' ایک اور مقام پر آپ کا ارشاد گرامی ہے: (أحذّرکم الدنیا فانھا حُلوۃ خضرۃ،حُفّت بالشھوات[3]) ''میں تمہیں اس دنیا سے بچنے کی تاکید کرتا ہوں کہ یہ دنیا سرسبز وشیریں اور شہوتوں سے گھری ہوئی ہے''آپ ہی کا ارشاد ہے: (احذروا ھذہ الدنیا،الخداعۃ الغدارۃ،التی قد تزیّنت بحلیّھا،وفتنت بغرورھا،فأصبحت کالعروسۃ المجلوۃ،والعیون الیھا ناظرۃ[4]) ''اس دھوکے باز مکار دنیا سے بچو یہ دنیا زیورات سے آراستہ اور فتنہ سامانیوں کی وجہ سے سجی سجائی دلہن کی مانند ہے کہ آنکھیں اسی کی طرف لگی رہتی ہیں''

ب:ممدوح دنیا: دنیا کا دوسرا رخ اوراس کے بارے میں جو دوسرا نظریہ ہے وہ قابل مدح وستائش ہے البتہ یہ قابل ستائش رخ اس دنیا کے باطن سے نکلتا ہے جو قابل زوال ہے جبکہ مذموم رخ ظاہری دنیا سے متعلق تھا ۔بہر حال یہ طے شدہ بات ہے کہ دنیا کے دورخ ہیں ایک ممدوح اور دوسرا مذموم ۔ممدوح رخ کے اعتبار سے دنیا نقصان دہ نہیں ہے بلکہ نفع بخش ہے اور مضر ہونے کے بجائے مفید ہے اسی رخ سے دنیا آخرت تک پہونچانے والی،مومن کی سواری،دارصدق اوراولیاء کی تجارت گاہ ہے ۔لہٰذا دنیا کے اس رخ کی مذمت صحیح نہیں ہے روایات کے آئینہ میں دنیا کے اس رخ کو بھی ملاحظہ فرمائیں ۔

ا۔دنیا آخرت تک پہونچانے والی: امام زین العابدینؑ نے فرمایا: (الدنیا دنیاء ان،دنیا بلاغ،ودنیا ملعونۃ[5]) ''دنیا کی دو قسمیں ہیں؛دنیا ئے بلاغ اور دنیا ئے ملعونہ'' دنیائے بلاغ سے مراد یہ ہے کہ دنیا انسان کو آخرت تک پہونچاتی ہے اور خدا تک رسائی حاصل کرنے

[1] غررالحکم ج۱ص۱۱۔
[2] بحارالانوار ج۷۸ ص۲۱۔
[3] بحارالانوار ج۷۳ص۹۶۔
[4] بحارالانوار ج۷۳ص۱۰۸۔
[5] بحارالانوار ج۷۳ص۲۰۔

کا ذریعہ ہے ۔بلاغ کے یہی معنی ہیں اور یہ دنیا کی پہلی قسم ہے ۔دوسری دنیا جو ملعون ہے وہ دنیا وہ ہے جوانسان کو اللہ سے دور کرتی ہے اس لئے کہ لعن بھگانے اور دور کرنے کو کہتے ہیں اب ہرانسان کی دنیا انھیں دومیں سے کوئی ایک ضرور ہے یاوہ دنیا جو خدا تک پہونچاتی ہے یاوہ دنیا جو خدا سے دور کرتی ہے ۔اسی سے ایک حقیقت اور واضح ہو جاتی ہے کہ انسان دنیا میں کسی ایک مقام پر ٹھہرا نہیں رہتا ہے بلکہ یا تووہ قرب خدا کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے یا پھر اس سے دور ہوتا جاتا ہے ۔امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (لاتسألوا فیھا فوق الکفاف،ولاتطلبوا منھا أکثر من البلاغ[1])''اس دنیا میں ضرورت سے زیادہ کا سوال مت کرو اور نہ ہی کفایت بھر سے زیادہ کا مطالبہ کرو''اس طرح اس دنیا کا مقصد (بلاغ)ہے اور انسان دنیا میں جو بھی مال ومتاع حاصل کرتا ہے وہ صرف اس مقصد تک پہونچنے کیلئے ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے اس طرح انسان کی ذمہ داری ہے کہ دنیا میں صرف اتنا ہی طلب کرے جس سے اپنے مقصود تک پہنچ سکے لہٰذا اس مقدار سے زیادہ مانگنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی وسیلہ کو مقصد بنانا چاہئے اور یہ یادر کھنا چاہئے کہ دنیا وسیلہ ہے آخری مقصد نہیں ہے بلکہ آخری مقصد آخرت اور خدا تک رسائی ہے ۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (الدنیا خلقت لغیرھا،ولم تخلق لنفسھا[2])''دنیا اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے غیر (آخرت تک رسائی)کیلئے خلق کی گئی ہے''وسیلہ کو مقصد قرار دے دیا جائے یہ بھی غلط ہے اسی طرح واسطہ کو وسیلہ اور مقصد (دونوں) قرار دینا بھی غلط ہے اسی لئے امیرالمومنینؑ نے فرمایا ہے کہ دنیا کو صرف اس مقدار میں طلب کرو جس سے آخرت تک پہونچ سکو ۔لیکن خود حصول دنیا کے سلسلہ میں آپؑ نے فرمایا کہ صرف بقدر ضرورت سوال کرو ۔امامؑ کے اس مختصر سے جملے میں حصول رزق کے لئے سعی وکوشش کے سلسلہ میں اسلام کا مکمل نظریہ موجود ہے ۔چونکہ مال و متاعِ دنیا آخرت تک پہنچنے کا ذریعہ ہے لہٰذا کسب معاش اور تحصیل رزق ضروری ہے لیکن اس تلاش و جستجو میں ''بقدر ضرورت''کا خیال رکھنا ضروری ہے اور ''بقدر''ضرورت سے مراد وہ مقدار ہے کہ جس کے ذریعہ دنیاوی زندگی کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں اور آخرت تک رسائی ہو سکے انسانی ضرورت واقعی

---

[1] بحارالانوار ج ۷۳ص۸۱۔
[2] نہج البلاغہ حکمت ۴۵۵۔

اور ضروری بھی ہوتی ہے اور غیر واقعی یا وہمی بھی ۔یعنی اسے زندہ رہنے اور آخرت تک رسائی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ حقیقی ضرورتیں ہیں ۔اوران کے علاوہ کچھ غیر ضروری چیزیں بھی احتیاج وضرورت کی شکل میں انسان کے سامنے آتی ہیں جو در حقیقت حرص و طمع ہے اوران کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اگر انسان ایک مرتبہ ان کی گرفت میں آگیا تو پھر ان کی کو ئی انتہاء نہیں ہوتی ۔ان کی راہ میں جد وجہد کرتے ہوئے انسان ہلاک ہو جاتا ہے مگر اس جد و جہد سے اذیت و طمع میں اضافہ ہی ہوتا ہے ۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے جد بزرگوار حضرت علیؑ کا یہ قول نقل فرمایاہے:(یابن آدم:ان کنت ترید من الدنیامایکفیک فان أیسرما فیھایکفیک،و ان کنت انما ترید مالیکفیک فان کل ما فیھایکفیک[1] ''اے فرزند آدم اگر تو دنیا سے بقدر ضرورت کا خواہاں ہے تو تھوڑا بہت ،جو کچھ تیرے پاس ہے وہی کافی ہے اور اگر تو اتنی مقدار میں دنیا کا خواہاں ہے جو تیری ضرورت سے زیادہ ہے تو پھر دنیا میں جو کچھ ہے وہ بھی ناکافی ہے''

دنیا کے بارے میں یہ دقیق نظریہ متعدد اسلامی روایات اور احادیث میں وارد ہوا ہے ۔امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:

(ألا وان الدنیادار لا یُسلَم منھا الا فیھا،ولاینجیٰ بشی ء کان لھا،ابتلی الناس بھا فتنۃ،فا أخذوہ منھا لھاأخرجوا منہ وحوسبوا علیہ، وما أخذوہ منھالغیرھا قدمواعلیہ وأقاموا فیہ[2]) ''آگاہ ہو جاؤ کہ یہ دنیا ایسا گھر ہے جس سے سلامتی کا سامان اسی کے اندر سے کیا جاسکتا ہے اور کوئی ایسی شئے وسیلۂ نجات نہیں ہو سکتی ہے جو دنیا ہی کے لئے ہو ۔لوگ اس دنیا کے ذریعہ آزمائے جاتے ہیں ۔جو لوگ دنیا کا سامان ،دنیا ہی کیلئے حاصل کرتے ہیں وہ اسے چھوڑکر چلے جاتے ہیں اور پھر حساب بھی دینا ہوتا ہے اور جولوگ یہاں سے وہاں کیلئے حاصل کرتے ہیں وہ وہاں جاکر پا لیتے ہیں اور اسی میں مقیم ہوجاتے ہے یہ دنیا در حقیقت صاحبان عقل کی نظر میں ایک سایہ جیسی ہے جو دیکھتے دیکھتے سمٹ جاتا ہے اور پھیلتے پھیلتے کم ہوجاتا ہے'' ان کلمات میں اختصار کے باوجود بے شمار معانی ومطالب پائے جاتے ہیں (دارلایسلم منھا الا فیھا)اس فقرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان سے فرار اور خدا تک رسائی کے لئے دنیا مومن کی سواری ہے

[1] اصول کافی ج٢ص١٣٨۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۶۲ ۔

اس کے بغیر اسکی بارگاہ میں رسائی ممکن نہیں ہے عجیب وغریب بات ہے کہ دنیا اور لوگوں سے کنا رہ کشی کرنے والا قرب خدا کی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتا بلکہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ بندہ اسی دنیا میں رہ کر اسی دنیا کے سہارے اپنی منزل مقصود حاصل کرے ۔لہٰذا ان کلمات سے پہلی حقیقت تو یہ آشکار ہوئی ہے کہ دنیا واسطہ اور وسیلہ ہے اس کو نظر انداز کرکے مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا ۔لیکن یہ بھی خیال رہے کہ دنیا مقصد نہ بننے پائے ۔

اگر انسان دنیا کو وسیلہ کے بجائے ہدف اور مقصد بنالے گا تو ہرگز نجات حاصل نہیں کرسکتا (ولاینجی لشی کان لھا) اس طرح اگر انسان نے دنیا کواس کی اصل حیثیت ''واسطہ ووسیلہ'' سے الگ کردیا اور اسی کو ہدف بنالیا تو پھر دنیا شیطان سے نجات اور خدا تک پہنچانے کی صلاحیت کھو بیٹھتی ہے یہ دوسری حقیقت ہے جو ان کلمات میں موجود ہے ۔اور پھر اگر انسان دنیا کو خدا ،قرب خدا اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کے بجائے خود دنیا کی خاطر اپناتا ہے تو یہی دنیا اسکو خدا سے دور کردیتی ہے ۔اس دنیا کا بھی عجیب و غریب معاملہ ہے یعنی اگر انسان اسے وسیلہ اور خدا تک رسائی کا ذریعہ قرار دیتا ہے تو یہ دنیا اس کے لئے ذخیرہ بن جاتی ہے اور اس کے لئے باقی رہتی ہے نیز دنیا وآخرت میں اس کے کام آتی ہے لیکن اگر وسیلہ کے بجائے اسے مقصد بنالے تو یہ اللہ سے غافل کرتی ہے ۔خدا سے دور کردیتی ہے موت کے بعد انسان سے جدا ہوجاتی ہے اور بارگاہ الٰہی میں اسکا سخت ترین حساب لیا جاتاہے ۔یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ فرق کمیت اور مقدار کا نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ہے اور عین ممکن ہے کہ انسان وسیع و عریض دنیا کا مالک ہو لیکن اسکا استعمال راہ خدا میں کرتا ہو اس کے ذریعہ قرب خدا کی منزلیں طے کرتا ہو ایسی صورت میں یہ دنیا اس کے لئے ''عمل صالح'' شمار ہوگی اس کے برخلاف ہوسکتا ہے کہ مختصر سی دنیا اور اسباب دنیا ہی انسان کے پاس ہوں لیکن اسکا مقصد خود وہی دنیا ہو تو یہ دنیا اس سے چھین لی جائے گی اسکا محاسبہ کیا جائے گا ۔یہ ہے ان کلمات کا تیسرا نتیجہ ۔اگر خود یہی دنیا انسان کے مد نظر ہو تو اسکی حیثیت ''عاجل''''نقد''کی سی ہے جو کہ اسی دنیا تک محدود ہے اور اس کا سلسلہ آخرت سے متصل نہ ہوگا بلکہ زائل ہو کر جلد ختم ہوجائے گی لیکن اگر دنیا کو دوسرے (آخرت) کے لئے اختیار کیا جائے تو اسکی حیثیت ''آجل''''ادھار''کی سی ہوگی کہ

جب انسان حضور پروردگار میں پہونچے گا تو وہاں دنیا کو حاضر وموجود پائے گا ۔ایسی دنیا زائل ہونے والی نہیں بلکہ باقی رہے گی ''وماعنداللہ خیر وأبقی''امیر المومنینؑ کے اس فقرہ ''وماأخذ وہ منھا لغیرھا قدموا علیہ وأقاموا فیہ'' سے یہ چوتھا نتیجہ برآمد ہوتا ہے ۔زیارت امام حسینؑ سے متعلق دعا میں نقل ہوا ہے:(ولاتشغلنی بالاکثار علیّ من الدنیا، تلھینی عجائب بھجتھا،وتفتننی زھرات زینتھا،ولا باقلال یضرّ بعملی،ویملأ صدری ھمّہ[1]) ''کثرت دنیا سے میرے قلب کو مشغول نہ کردینا کہ اسکے عجائبات مجھے تیری یاد سے غافل کردیں یا اسکی زینتیں مجھے اپنے فریب میں لے لیں اور نہ ہی دنیا میں میرا حصہ اتنا کم قرار دینا کہ میرے اعمال متاثر ہوجائیں اور میرا دل اسی کے ہم وغم میں مبتلا رہے''

دنیا اوراس سے انسان کے تعلق،بقاء و زوال،اسکے مفید ومضر ہونے کے بارے میں اس سے قبل جوکچھ بیان کیا گیا وہ کیفیت کے اعتبار سے تھا کمیت ومقدار سے اسکا تعلق نہیں تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمیت و مقدار بھی اس میں دخیل ہے کثرت دنیا اور اسکی آسائشیں انسان کو اپنے میں مشغول کرکے یاد خدا سے غافل بنادیتی ہیں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں بڑا حصہ ہونے کے باوجود انسان دنیا میں گم نہ ہویا یہ زیادتی اسے خدا سے دور نہ کردے اسکے لئے سخت جد وجہد درکار ہوتی ہےاور اسی طرح اگر دنیا وی حصہ کم ہو،دنیا روگردانی کر رہی ہو تو یہ بھی انسان کی آزمائش کا ایک انداز ہوتا ہے کہ انسان کا ہم وغم اور اس کی فکریں دنیا کے بارے میں ہوتی ہیں اور وہ خدا کو بھول جاتا ہے اسی لئے اس دعا میں حد متوسط کا مطالبہ کیا گیا ہے کہ نہ تو اتنی کثرت ہو جس سے انسان یاد خدا سے غافل ہوجائے اور نہ اتنی قلت ہوکہ انسان اسی کی تلاش میں سرگرداں رہےاور خدا کو بھول بیٹھے۔

۲۔دنیا مومن کی سواری:پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی ہے: (لاتسبّوا الدنیا فنعمت مطیۃ المؤمن،فعلیھا یبلغ الخیر وبھا ینجو من الشر[2]) ''دنیا کو برا مت کہو یہ مومن کی بہترین سواری ہے اسی پر سوار ہوکر خیر تک پہنچا جاتا ہے اور اسی کے ذریعہ شر سے نجات حاصل ہوتی ہے'' اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ دنیا سواری کی حیثیت رکھتی ہے جس پر سوار ہوکر انسان خدا تک پہونچتا اور جہنم

[1] بحارالانوار ج۱۰۱ ص۲۰۸۔
[2] بحارالانوار ج۷۷ص۱۷۸۔

سے فرار اختیار کرتا ہے ۔یہ دنیا کاقابل ستائش رخ ہے اگر دنیانہ ہوتی توانسان رضائے الٰہی کے کام کیسے بجالاتا ، کیسے خدا تک پہونچتا ؟اولیاء خدا اگر قرب خداوند ی کے بلند مقامات تک پہونچے ہیں تو وہ بھی اسی دنیا کے سہارے سے پہونچے ہیں ۔

۳۔دنیا صداقت واعتبار کا گھر ہے ۔

۴۔دنیا دار عافیت۔

۵۔دنیا استغنا اور زاد راہ حاصل کرنے کی جگہ ہے ۔

٦۔دنیا موعظہ کا مقام ہے ۔

۷۔دنیا محبان خدا کی مسجد ہے ۔

۸۔دنیا اولیاء الٰہی کے لئے محل تجارت ہے ۔

امیر المومنین حضرت علیؑنے جب ایک شخص کو دنیا کی مذمت کرتے ہوئے سنا تو فرمایا: (أیھاالذام للدنیاالمغتربغرورھاالمخدع بأباطیلھا!أتغتر بالدنیاثم تذمھا،أنت المتجرم علیھاأم ھی المتجرمتعلیک؟متیٰ استھوتک؟أم متیٰ غرتک؟[1]) ''اے دنیا کی مذمت کرنے والے اور اسکے فریب میں مبتلا ہوکر اسکے مہلات میں دھوکا کھا جانے والے !تو اسی سے دھوکا بھی کھاتا ہے اور اسکی مذمت بھی کرتا ہے ؟یہ بتاؤ کہ تجھے اس پر الزام لگانے کا حق ہے یا اسے تجھ پر الزام لگانے کا حق ہے ؟آخر اس نے کیا تجھ سے تیری عقل کو چھین لیا تھا اور کب تجھ کو دھوکہ دیا تھا؟کیا تیرے آباء و اجداد کی کہنگی کی بناء پر گرنے سے دھوکا دیا ہے یا تمہاری ماؤں کی زیر خاک خواب گاہ سے دھوکا دیا ہے ؟ کتنے بیمار ہیں جن کی تم نے تیمار داری کی ہے اور اپنے ہاتھوں سے انکا علاج کیا ہے اور چاہاکہ وہ شفا یاب ہوجائیں اور اطباء سے رجوع بھی کیا ہے ۔اس صبح کے ہنگام جب نہ کوئی دوا کام آرہی تھی اور نہ رونا دھونا فائدہ پہنچارہا تھا ۔نہ

---

[1] نہج البلاغہ حکمت ۱۲۶۔

تمہاری ہمدردی کسی کوکوئی فائدہ پہنچا سکی اور نہ تمہارا مقصد حاصل ہوسکا اور نہ تم موت کو دفع کر سکے۔اس صورت حال میں دنیا نے تم کو اپنی حقیقت دکھلادی تھی اور تمھیں تمہاری ہلاکت سے آگاہ کردیا تھا (لیکن تمھیں ہوش نہ آیا)یاد رکھو کہ دنیا باور کرنے والے کے لئے سچائی کا گھر اور سمجھ دار کے لئے امن وعافیت کی منزل اور نصیحت حاصل کرنے والے کیلئے نصیحت کا مقام ہے ۔یہ دوستان خدا کے لئے سجود کی منزل اور ملائکۂ آسمان کا مصلی ہے یہیں وحی الٰہی کا نزول ہوتا ہے اور یہیں اولیاء خدا آخرت کا سودا کرتے ہیں جس کے ذریعہ رحمت کو حاصل کر لیتے ہیں اور جنت کو فائدہ میں لے لیتے ہیں کسے حق ہے کہ اسکی مذمت کرے جبکہ اس نے اپنی جدائی کا اعلان کردیا ہے اور اپنے فراق کی آواز لگادی ہے اور اپنے رہنے والوں کی سنائی سنادی ہے اپنی بلاسے ان کے ابتلا کا نقشہ پیش کیا ہے اور اپنے سرور سے آخرت کے سرور کی دعوت دی ہے ۔اسکی شام عافیت میں ہوتی ہے تو صبح مصیبت میں ہوتی ہے تاکہ انسان میں رغبت بھی پیدا ہو اور خوف بھی ۔اسے آگاہ بھی کردے اور ہوشیار بھی بنادے ۔کچھ لوگ ندامت کی صبح اسکی مذمت کرتے ہیں اور کچھ لوگ قیامت کے روز اسکی تعریف کریں گے۔جنہیں دنیا نے نصیحت کی تو انھوں نے اسے قبول کرلیا اس نے حقائق بیان کئے تو اسکی تصدیق کردی اور موعظہ کیا تو اسکے موعظہ سے اثر لیا''

۹۔دنیا بازار ہے: حضرت امام علی نقیؑ نے فرمایا ہے: (الدنیا سوق ربح فیھا قوم وخسر آخرون[1]) ''دنیا ایک بازار ہے جہاں ایک قوم فائدہ میں ہے اور دوسری قوم خسارہ میں''

۱۰۔دنیا آخرت کے لئے مددگار ہے ۔امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے: (نعم العون الدنیا علیٰ الآخرۃ[2]) ''دنیا آخرت کے لئے بہترین مددگار ہے''

۱۱۔دنیا ذخیرہ (خزانہ)ہے ۔امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے: (الدنیا ذخر والعلم دلیل[3]) ''دنیا خزانہ ہے اور علم رہنما''

---
[1] بحارالانوار ج۷۸ص۳۶۶۔
[2] بحارالانوار ج۷۳ص۱۲۷۔
[3] غررالحکم۔

۱۲۔دنیا دارالمتقین ہے ۔قول پروردگار ''ولنعم دارالمتقین''کی تفسیر کے ذیل میں امام محمد باقرؑنے فرمایا کہ'':اس سے مراد ''دنیا ''ہے ۔

۱۳۔دنیاکا ماحصل آخرت ۔حضرت علیؑنے فرمایا ہے: (بالدنیا تحرز الآخرۃ[1]) ''دنیاکے ذریعہ آخرت حاصل کی جاتی ہے''اس طرح اسلام کی نگاہ میں دنیا قابل مدح وستائش،اولیائے الٰہی کی محل تجارت،محبان خدا کی مسجد،آخرت تک رسائی کا ذریعہ اور مومنین کے لئے زاد آخرت حاصل کرنے کا مقام ہے لیکن یہ سب کچھ اس صورت میں ہے کہ جب دنیا سے عبرت و نصیحت حاصل کی جائے لیکن اگر دنیا کومنظور نظر بنا لیا جائے تو پھر یہی دنیا انسان کو اندھا بنا دیتی ہے جیسا کہ امیر المومنین حضرت علیؑکا ارشاد ہے :منقول ہے کہ جب آپ نے یہ فرمایا: (أیھاالذام الدنیا أنت المتجرّم علیھا أم ھی المتجرّمعلیک؟قال قائل: بل أناالمتجرّم علیھایاامیرالمؤمنین ۔فقال: ''فلم ذممتھا؟ألیست دارصدق لمن صدقھا؟[2]) ''اے دنیا کی مذمت کرنے والے!تو نے اسکے اوپر تہمت لگائی ہے یا اس نے تیرے اوپر تہمت لگائی ہے؟''تو اس شخص نے کہا :اے امیر المومنینؑمیں نے اس پر تہمت لگائی ہے!توآپ نے فرمایا '': تو پھرتم دنیا کی کیوں مذمت کرتے ہو؟کیا یہ دنیا تصدیق کرنے والوں کیلئے دار صدق نہیں ہے''

۳۔اسکے دل کو اسکا دلدادہ بنا دونگا:جرم اور سزا کے درمیان تبادلہ ''اور اسکے دل کو دنیا سے وابستہ کردوں گا'' یہ ان لوگوں کی تیسری سزا ہے جو خدا سے منھ موڑ کر اپنی خواہشات کی جانب دوڑتے ہیں یہاں سزا اور جرم ایک ہی طرح کے ہیں ۔اور جب جرم وسزا کی نوعیت ایک ہوتی ہے تو وہ کوئی قانونی سزا نہیں بلکہ ''تکوینی''سزا ہوتی ہے اور تکوینی سزا زیادہ منصفانہ ہوتی ہے اور اس سے بچنے کا امکان بھی نہیں ہوتا ۔ جرم یہ ہے کہ انسان خدا کو چھوڑکر خواہشات سے دل لگارہاہے اور سزا بھی ایسی ہی ہے یعنی خدا بندہ کو دنیا میں ہی مشغول کردیتا ہے ''واشغلت قلبہ بھا'' اس طرح جرم و سزا میں دو طرفہ رابطہ ہے اور دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں خدا کو چھوڑکر ''خواہشات میں الجھنے''کی سزا ''دنیا میں الجھنا ''ہے اس سزا سے جرم میں مزید

---

[1] بحارالانوار ج ۶۷ص۶۷۔
[2] بحارالانوار ج۷۸ ص۱۷۔

اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جرم میں اضافہ ،مزید سزا کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہتا ہے اس طرح نہ صرف یہ کہ سزا وہی ملتی ہے جو جرم کیا ہے بلکہ خود سزا جرم کو بڑھاتی ہے اور اسے شدید کردیتی ہے نتیجتاً انسان کچھ اورشدید سزا کا مستحق ہوجاتا ہے ۔انسان جب پہلی مرتبہ جرم کا مرتکب ہوتا ہے تو اس وقت اسکے پاس گناہوں سے اجتناب اور سقوط وانحراف سے بچانے والی خدا داد قوت مدافعت کا مکمل اختیار ہوتا ہے لیکن جب گناہوں کا سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے اور انسان اپنے نفس کو نہیں روکتا تو خدا بھی سزا کے طورپراسے اسی جرم کے حوالہ کردیتا ہے اوراس سے گناہوں سے اجتناب کرنے اور نفس پر تسلط قائم رکھنے کی فطری اور خدا داد صلاحیت کو سلب کرلیتا ہے ۔

اور سزا کا درجہ جتنا بڑھتا جاتا ہے انسان اتنا ہی جرم کے دلدل میں پھنستا رہتا ہے ،اپنے نفس پر اسکی گرفت کمزور ہوتی رہتی ہے اور گناہوں سے پرہیز کی صلاحیت دم توڑتی جاتی ہے یہاں تک کہ خداوند عالم اس سے گناہوں سے اجتناب کی فطری صلاحیت اور نفس پر تسلط و اختیار کو مکمل طریقہ سے سلب کرلیتا ہے ۔اس مقام پر یہ تصور ذہن میں نہیں آنا چاہئیے کہ جب مجرم کے پاس نفس پر تسلط اور گناہوں سے اجتناب کی صلاحیت بالکل ختم ہوگئی اور گویا اسکا اختیار ہی ختم ہوگیا تو اب سزا کیسی ؟یہ خیال ناروا ہے اس لئے کہ ابتداء میں مجرم نے جب جرم کا ارتکاب کیا تھا اس وقت تواسکے پاس یہ صلاحیت اور نفس کے اوپر تسلط بھرپور طریقہ سے موجود تھا اور وہ مکمل اختیار کا مالک تھا جو شخص اپنے ہاتھوں دولت اختیار ضائع کردے اسے بے اختیار نہیں کہا جاتا جیسے بلندی سے کودنے والا گرنے کے بعد یقیناً بے اختیار ہوجاتا ہے لیکن اگر کوئی شخص خود جان بوجھ کربلندی سے چھلانگ لگائے تو اسکے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بے اختیار ہے اورا سکے پاس بچنے کی صلاحیت ہی نہیں تھی۔

دنیاداری کے دورخ یہ بھی ؛جب انسان دنیا داری میں مشغول ہوجاتا ہے تو اس کا پہلا اثر اور ایک رخ یہ ہوتا ہے کہ انسان کا سارا ہم وغم اسکی دنیا ہی ہوتی ہے اور یہ کیفیت ایک خطرناک بیماری کی شکل اختیار کرکے قلب انسانی کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے ۔ پیغمبر اکرم ﷺ سے ایک دعا میں منقول ہے: (اللھم أقسم لنامن خشیتک مایحول بیننا وبین معاصیک،ولاتجعل الدنیا

أکبر همنا،ولا مبلغ علمنا[1]) ''پروردگارا! ہمیں وہ خوف وخشیت عطا فرما جو ہمارے اور گناہوں کے درمیان حائل ہوجائے اور ہمارے لئے دنیا کو سب سے بڑا ہم وغم اور ہمارے علم کی انتہا قرار مت دینا '' اگرانسان دنیاوی معاملات کو اہمیت دے تو اس میں کوئی قباحت نہیں لیکن دنیا کو اپنا سب کچھ قرار دینااور اسکو اپنے قلب کا حاکم اور زندگی کا مالک تسلیم کرلینا غلط ہے کیونکہ ایسی صورت میں وہ اپنے اشاروں پر انسان کو نچاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ صورت حال قلب کے لئے بیماری کا درجہ رکھتی ہے ۔امیر المومنین حضرت علیؑ نے اپنے فرزند امام حسن مجتبیٰؑ کے نام اپنی وصیت میں فرمایاہے: (ولا تکن الدنیا أکبر ہمک) ''دنیا تمہارا سب سے بڑا ہم وغم نہ ہونے پائے'' دنیا داری میں مشغول ہونے کا منفی رخ یہ ہے کہ خدا سے انسان کا تعلق ختم ہوجاتا ہے ۔

معاملات دنیا میں کھوجانے کا مطلب خدا سے قطع تعلق کرلینا ہے اور فطری بات ہے کہ جب انسان کا ہم وغم اسکی دنیا ہوگئی تو پھر انسان کے ہر اقدام کا مقصد دنیا ہوگی نہ کہ رضائے الٰہی ،اس طرح انسانی قلب پر دنیا کے دریچے جس مقدار میں کھلتے جائیں گے اسی مقدار میں الٰہی دریچے بند ہوتے جائیں گے لہٰذا اگر انسان کی نگاہ میں دنیاوی کاموں کی سب سے زیادہ اہمیت ہوگی تو خدا کی جانب توجہ کمترین درجہ تک پہونچ جائے گی ۔اور جب سب ہم وغم اور فکر وخیال دنیا کے لئے ہوجائے گا تو یہ کیفیت در حقیقت گذشتہ صورت حال کا نتیجہ اور قلب انسانی کی بدترین بیماری ہے ۔

قرآن کریم نے اس خطرناک بیماری کو متعدد مقامات پر مختلف عناوین کے ذریعہ بیان کیا ہے ۔ ہم یہاں پر آیات قرآن کے ذیل میں چند عناوین کا تذکرہ کررہے ہیں: دل کے اوپر خدائی راستوں کی بندش کے بعض نمونے۱۔غبار اور زنگ:(کلا بل ران علیٰ قلوبھم ماکانوا یکسبون[2]) ''نہیں نہیں بلکہ انکے دلوں پر انکے (برے)اعمال کا زنگ لگ گیا ہے'' راغب اصفہانی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ''ان کے دلوں کی چمک دمک زنگ آلود ہوگئی لہٰذا وہ خیروشرکی پہچان کرنے سے بھی معذور ہوگئے ہیں۔

[1] بحارالانوار ج۹۵ص۳۶۱۔
[2] بحارالانوار ج۴۲ص۲۰۲۔

۲۔الٹ پلٹ :یہ ایک طرح کا عذاب ہے جس میں خدا، غافل دلوں کو اپنی یاد سے دور کردیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے :(صرف اللہ قلوبھم بأنھم قومُ لایفقھون[1]) ''تو خدا نے بھی انکے قلوب کو پلٹ دیا ہے کہ وہ سمجھنے والے لوگ نہیں ہیں''

۳۔زنگ یا مُہر:خداوند عالم کا ارشاد ہے: (ونطبعُ علیٰ قلوبھم فھم لایسمعون[2]) ''ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں اور پھر انھیں کچھ سنائی نہیں دیتا''یعنی ان کو غیر خدائی رنگ میں رنگ دیاہے اور وہ ہویٰ وہوس اور دنیا کا رنگ ہے ۔

۴۔مُہر:خداوند عالم کا ارشاد ہے: (ختم اللہ علیٰ قلوبھم وعلیٰ سمعھم وعلیٰ أبصارھم غشاوۃ[3]) ''خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور انکی آنکھوں پر بھی پر دے پڑگئے ہیں'' ختم (مہر)طبع (چھاپ لگنے)سے زیادہ محکم ہوتی ہے کیونکہ کسی چیز کو مُہر کے ذریعہ سیل بند کردینے کو ''ختم'' کہتے ہیں ۔

۵۔قفل :خداوند عالم کا ارشاد ہے: (أفلایتدبّرون القرآن أم علیٰ قلوب أقفالھا[4]) ''تو کیا یہ لوگ قرآن میں ذرا بھی غور نہیں کرتے ہیں یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہوئے ہیں''

٦۔غلاف:خداوند عالم کا ارشاد ہے: (وقالوا قلوبنا غُلُف بل لعنھم اللہ بکفرھم[5]) ''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں بیشک ان کے کفر کی بنا پر، ان پر اللہ کی مار ہے'' دوسرے مقام پر ارشاد ہے: (وقولھم قلوبنا غلف بل طبع اللہ علیھا بکفرھم[6]) ''اور یہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر فطرتا غلاف چڑھے ہوئے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ خدا نے ان کے کفر کی بنا پر ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے''

---

[1] سورۂ مطففین آیت۱۴۔
[2] سورۂ اعراف آیت ۱۰۰۔
[3] سورۂ بقرہ آیت۷۔
[4] سورۂ محمدآیت ۲۴۔
[5] سورۂ بقرہ آیت ۸۸۔
[6] سورۂ نساء آیت ۱۵۵۔

۷۔پردہ :اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: (وقالوا قلوبنا فی أکنة مماتدعونا الیہ وفی آذاننا وقر[۱]) ''اور وہ کہتے ہیں کہ تم جن باتوں کی طرف دعوت دے رہے ہو ہمارے دل ان کی طرف سے پردہ میں ہیں اور ہمارے کانوں میں بہرا پن ہے'' دوسری جگہ ارشاد ہے: (وجعلنا علیٰ قلوبہم أکنة أن یفقھوہ وفی آذانھم وقراً[۲]) ''لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دئے ہیں ۔وہ سمجھ نہیں سکتے ۔اور ان کے کانوں میں بھی بہراپن ہے''

۸ ۔سختی :خداوند عالم کا ارشاد ہے: (ربنا اطمس علیٰ أموالھم واشد د علیٰ قلوبہم[۳]) ''خدا یا ان کے اموال کو برباد کردے اوران کے دلوں پر سختی فرما''

۹۔قساوت:(فویل للقاسیة قلوبہم من ذکراللہ[۴]) ''افسوس ان لوگوں کے حال پر جن کے دل ذکر خدا (کینہ کرنے)سے سخت ہوگئے ہیں'' خداوند عالم کا ارشاد ہے: (فطال علیھم الأمد فقست قلوبہم[۵]) ''تو ایک عرصہ گذرنے کے بعد ان کے دل سخت ہوگئے ''یہ انسانی دل کے اتار،چڑھاؤ،اور بند ہونے یا ذکر خدا سے روگرداں ہونے کی وہ صورت حال ہے جس کو قرآن مجید نے مختلف انداز سے ذکر کیا ہے ۔

دنیا قید خانہ کیسے بنتی ہے؟

جب قلب انسانی پر الٰہی راستہ مکمل طریقہ سے بند ہوجائے تو یہی دنیا انسان کے لئے قید خانہ بن جاتی ہے انسان پر ہوس اس طرح غالب آجاتی ہے کہ اس کے لئے رہائی حاصل کرنا ممکن نہیں رہ جاتا ۔کیونکہ قیدخانہ کا مطلب یہ ہے کہ اس سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا اور اسکی حرکتیں محدود ہو جاتی ہیں یہی حالت اس وقت ہوتی ہے کہ جب دنیا انسان کے لئے قید خانہ بن جاتی ہے کہ انسان اسی میں مقید

[۱] سورۂ فصلت آیت ۵۔
[۲] سورۂ انعام آیت ۲۵۔
[۳] سورۂ یونس آیت ۸۸۔
[۴] سورۂ زمر آیت ۲۲۔
[۵] سورۂ حدیدآیت۱۶۔

ہوکررہ جاتا ہے حرکتیں محدود ہو جاتی ہیں اور اس سے ہر طرح کی آزادی سلب ہوجاتی ہے اور وہ اسکے لئے اہتمام اوراسکی حرص ولالچ کی بناپر خداوند عالم سے بالکل الگ ہوجاتا ہے ۔یہی تفصیلات روایات میں بھی وارد ہوئی ہیں۔ حضرت امام محمد باقرؑ کی دعا کا فقرہ ہے:(ولاتجعل الدنیا علیّ سجناً[۱]) ''دنیا کو میرے لئے قید خانہ قرارمت دینا''

حضرت امام جعفر صادقؑ کی دعا ہے: (ولاتجعل الدنیا علیّ سجناً،ولاتجعل فراقھا لی حزناً[۲]) ''دنیا کو میرے لئے قید خانہ اور اس کے فراق کو میرے لئے حزن و ملال کا باعث مت قرار دینا'' یہ بالکل عجیب و غریب بات ہے کہ قیدی پر قیدخانہ کا فراق گراں گذر رہا ہے اور وہ رہائی پانے کے بعد حزن و ملال میں مبتلا ہے؟اس کا راز یہ ہے کہ یہ قید خانہ دوسرے قید خانوں کے مانند نہیں ہے،بلکہ یہ دنیا ایسا قید خانہ ہے کہ انسان اس سے انس و الفت کی وجہ سے خود اپنے آپ کوقیدی بناتا ہے چونکہ خود قید کو اختیار کرتا ہے لہٰذا وہ اس سے جدائی گوارا نہیں کرتا اور اگر اسے قید سے جدا کردیا جائے تواس رہائی سے اسے حزن وملال ہوتا ہے اور قید کا فراق اس کیلئے دشوار اور باعث زحمت ہوتا ہے ۔جب انسان اپنا اختیار دنیا کے حوالے کر دیتا ہے تو دنیا اسے کیکڑے کے مانند اپنے چنگل میں دبوچ کر اس کے ہاتھ اورپیروں کوجکڑ دیتی ہے اور اس کی حرکتوں کو مقید و محدود کرکے اسے اپنا اسیر بنا لیتی ہے ۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے: (ان الدنیا کالشبکۃ تلتف علیٰ من رغب فیھا[۳]) ''دنیا جال کے مانند ہے جو اس کی طرف راغب ہوگا اسی میں الجھتا جائے گا''

آپ کا یہ قول ہمارے سامنے ایک بار پھر قید خانہ اور قیدی کے تعلق اور رابطہ کو اجاگر کرتا ہے ''تلتف علیٰ من رغب فیھا''،جو اسکی طرف راغب ہوا وہ اسی پر لپٹتا چلاجائے گا ۔آپؑ ہی کا ارشاد ہے: (من أحب الدینار والدرھم فھوعبد الدنیا[۱]) ''جو درہم و دینار سے محبت کرتا ہے وہ دنیا کا غلام ہے''

---

[۱] بحارالانوار ج ۹۷ص۳۷۹۔
[۲] بحارالانوار ج۹۷ص۳۳۸۔
[۳] غررالحکم۔

اہل دنیا

کچھ افراد دنیا دار ہوتے ہیں اور کچھ ''اہل آخرت ''دنیا داروہ لوگ ہیں جو دنیاوی زندگی کو دائمی زندگی سمجھ کر اسی کے دلداہ ہوتے ہیں اور دنیا کی فرقت انھیں اسی طرح ناگوار ہوتی ہے جیسے انسان کو اپنے اہل و عیال کی جدائی برداشت نہیں ہوتی ہے ۔اہل آخرت ،دنیا میں اسی طرح رہتے ہیں جیسے دوسرے رہتے ہیں ۔اوردنیا کی حلال لذتوں سے ایسے ہی لطف اندوز ہوتے ہیں جیسے دوسرے ان سے مستفید ہوتے ہیں بس فرق یہ ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو دائمی زندگی مان کر اس سے دلبستگی کا شکار نہیں ہوتے ایسے افراد درحقیقت ''اہل اللہ ''ہوتے ہیں ۔

اہل آخرت اوردنیا داروں کے صفات ایک دوسرے سے الگ ہیں ۔چنانچہ حدیث معراج میں دنیا داروں کے صفات یوں نظر آتے ہیں جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے مروی ہے: (أهل الدنیا من کثر أکله وضحکه ونومه وغضبه،قلیل الرضا،لایعتذر الیٰ من أساء الیه،ولایقبل معذرة من اعتذر الیه،کسلان عند الطاعة[2]) ''دنیاداروں کی غذا ،ہنسی ،نیند ،اور غصہ زیادہ ہوتا ہے ۔یہ لوگ بہت کم راضی ہوتے ہیں، جس کے ساتھ ناروابرتاؤ کرتے ہیں اس سے معذرت نہیں کرتے ۔کوئی ان سے معذرت کا خواہاں ہو تو اس کی معذرت کو قبول نہیں کرتے، اطاعت کے موقع پر سست اور معصیت کے مقام پر بہادر ہوتے ہیں ان کے یہاں امن مفقود اور موت نزدیک ہوتی ہے ۔کبھی اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرتے ،ان کے یہاں منفعت برائے نام باتیں زیادہ اور خوف کم ہوتا ہےیقینا دنیا دار نہ آسائشوں میں شکر خدا کرتے ہیں اور نہ ہی مصیبت کی گھڑی میں صبر ۔

جو کام انجام نہیں دیتے اس پر اپنی تعریف کرتے ہیں ،جو صفات ان میں نہیں پائے جاتے ان کے بھی مدعی ہوتے ہیں،جو دل میں آتا ہے بول دیتے ہیں لوگوں کے عیوب تو ذکر کرتے ہیں مگر ان کی خوبیاں بیان نہیں کرتے '' دنیادار دنیا سے سکون حاصل کرتے ہیں اسی سے مانوس ہوتے ہیں اور اسی کو اپنا دائمی مستقر سمجھتے ہیں حالانکہ دنیا ''دارالقرار ''نہیں ہے ۔چنانچہ جب کوئی

---

[1] بحارالانوار ج۱۰۳ ص۲۲۵ ۔
[2] بحارالانوار ج ۷۷ص ۲۴۔

انسان اس سے مانوس ہوکر تسکین قلب حاصل کرلے تو وہ فریب دنیا کے شرک میں مبتلا ہوجاتا ہے کیونکہ وہ اسے دار القرار سمجھتے ہیں جبکہ وہ ایسی نہیں ہے ۔امیر المومنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: (واعلم انک انما خُلقت للآخرة لا للدنیا،وللفناء لاللبقاء،وللموت لاللحیاة،وأنک فی منزل قلعة ودار بلغة،وطریق الیٰ الآخرة ۔وایاک أن تغترّبما تریٰ من اخلادأھل الدنیا الیھا،وتکالبھم علیھا،فقد نبأک اللہ عنھا،ونعتتک نفسھا،وتکشّفت لک عن مساویھا[1] ۔) ''۔اور بیٹا یاد رکھو کہ تمہیں آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے دنیا کے لئے نہیں اور فنا کے لئے بنایا گیا ہے دنیا میں باقی رہنے کے لئے نہیں ،تمہاری تخلیق موت کے لئے ہوئی ہے زندگی کے لئے نہیں تم اس گھر میں ہوجہاں سے بہر حال اکھڑنا ہے اور صرف بقدر ضرورت سامان فراہم کرنا ہے اور تم آخرت کے راستہ پر ہو ۔اور خبر دار دنیا داروں کو دنیا کی طرف جھکتے اور اس پر مرتے دیکھ کر تم دھوکے میں نہ آجانا کہ پروردگار تمہیں اسکے بارے میں بتا چکا ہے اور وہ خود بھی اپنے مصائب سنا چکی ہے اور اپنی برائیوں کو واضح کر چکی ہے ۔''

دنیا کا بہروپ

یہ ایک بہروپ ہی ہے کہ انسان دنیا کو دارالقرار سمجھ کر اس سے مانوس ہو جاتا ہے اور اس سے دل لگا بیٹھتا ہے حالانکہ دنیا صرف ایک گذر گاہ ہے ۔نہ خود دنیا کو قرار ہے اور نہ ہی دنیا میں کسی کیلئے قرار ممکن ہے ۔یہاں انسان کی حیثیت مسافر کی سی ہے کہ جہاں چند دن گذار کر آخرت کے لئے روانہ ہوجاتا ہے تعجب ہے کہ اس کے باوجود بھی انسان اسی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے اور اسے دائمی قیام گاہ مان لیتا ہے ۔پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: (کن فی الدنیا کانک غریب،أوکانک عابر سبیل[2]) ''دنیا میں ایک مسافر کی طرح رہو جیسے کہ راستہ طے کر رہے ہو'' امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:(أیھا الناس انّما الدنیا دار مجاز،والآخرۃ دار قرار،فخذوا من ممرّکم لمقرّکم[3]) ''اے لوگو یہ دنیا ایک گذرگاہ ہے قرار کی منزل آخرت ہی ہے لہٰذا اسی گذرگاہ سے وہاں کا سامان لے کر آگے بڑھو جو تمہارا دار قرار ہے''اس مسئلہ پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے ۔جو انسان راستہ سے گذرتا رہے وہ کبھی راستہ کا ہو کر نہیں رہ جاتا اسکے

---

[1] نہج البلاغہ مکتوب ۳۱۔
[2] بحارالانوار ج۷۳ ص۹۹۔
[3] نہج البلاغہ خطبہ ۲۰۳۔

برخلاف گھر میں رہنے والے انسان کو گھر سے محبت ہوتی ہےاور آدمی گھر کا ہوتا ہےاس سلسلہ میں حضرت عیسیٰ بن مریم کا ایک معرکتہ الآرا جملہ نقل کیا جاتا ہے حضرت عیسیٰ نے فرمایا ہے: (من ذا الذی یبنی علیٰ موج البحر داراً،تلکم الدنیا فلا تتخذوھا قراراً[1]) ''سمندر کی لہروں پر کون گھر بناتا ہے ؟دنیا کا بھی یہی حال ہے لہٰذا دنیا کو قرار گاہ مت بناؤ '' جیسے سمند رکی لہروں کو قرار و بقا نہیں ہے ایسے ہی دنیا بھی ہے۔

توپھر نفس اس سے کیسے سکون حاصل کر سکتا ہے اوراسے کیسے دائمی تسلیم کر سکتا ہے کیا واقعا کوئی انسان سمندر کی لہروں کے اوپراپنا گھر بنا سکتا ہے ؟روایت ہے کہ جناب جبرئیل نے حضرت نوح سے سوال کیا: (یا أطول الانبیاء عمراً،کیف وجدت الدنیا؟قال:کدار لھا بابان،دخلت من أحدھما،وخرجت من الآخر[2]) ''اے طویل ترین عمر پانے والے نبی خدا،آپ نے دنیا کو کیسا پایا ؟حضرت نوح نے جواب دیا ''ایک ایسے گھر کی مانند جس میں دو دروازے ہوں کہ میں ایک سے داخل ہوا اور دوسرے سے باہر نکل آیا'' عمر کے آخری حصہ میں شیخ الانبیاء(حضرت نوح) کا دنیا کے بارے میں یہ احساس در اصل اس شخص کا صادقانہ احساس ہے کہ جو فریب دنیا سے محفوظ رہا ہو ۔

لیکن اگر انسان دنیا سے مانوس ہو جائے اور دنیا اس کے لئے وجہ سکون بن جائے تو پھر یہ احساس تبدیل ہو جاتا ہے اور دنیا اس کو اپنے جال میں الجھا لیتی ہے انسان فریب دنیا کا شکار ہو کر شرک دنیا میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔یہ ''ان دنیا داروں''کا حال ہوتا ہے جن کے خیال خام میں دنیا دارالقرار اور وجہ سکون ہے۔

[1] بحارالانوار ج۱۴ص۳۲۶۔
[2] میزان الحکمت ج۳ ص۳۳۹۔

تیسری فصل

جو شخص خداوند عالم کی مرضی کواپنی خواہشات کے اوپر ترجیح دیتا ہے

گذشتہ فصل میں ہم نے ''اپنی خواہش کو خدا کی مرضی کے اوپر ترجیح دینے والے شخص کے بارے میں ''تفصیلی گفتگو کی ہے اور اب انشاء اللہ ''خدا کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دینے والے کے بارے میں ''گفتگو کریں گے ۔لیکن اصل بحث چھیڑنے سے پہلے ہم ان تمام روایات کوان کے حوالوں کے ساتھ بیان کر رہے ہیں جن میں اس حدیث قدسی کا تذکرہ ہے ۔شیخ صدوق(رح)نے اپنی کتاب ''خصال ''میں اپنی سند کے ساتھ امام محمد باقرؑ سے روایت نقل کی ہے آپ نے فرمایا کہ: (ان اللّٰہ عزوجل یقول:بجلالی وجمالی وبھائی وعلا ئی وارتفاعی لایؤثر عبد ھوای علیٰ ھواہ الاجعلت غناہ فی نفسہ،وھمہ فی آخرتہ،وکففت عنہ ضیعتہ،وضمنت السموات والارض رزقہ،وکنت لہ من وراء تجارۃکل تاجر[1]) خداوند عالم کا ارشاد ہے : ''میرے جلال وجمال،حسن،ارتفاع اوربلندی کی قسم کوئی بندہ اپنی خواہش پر میری مرضی کو ترجیح نہیں دیگامگر یہ کہ میں اسکے نفس کے اندر استغناپیدا کردوں گا اور اسکی پونجی کا ذمہ دار رہوں گا ۔

زمین وآسمان اسکے رزق کے ضامن ہیں اور میں اسکے لئے ہر تاجر کی تجارت سے بہتر ہوں''شیخ صدوق نے ''ثواب الاعمال ''میں امام زین العابدینؑ سے یہ روایت مع سند نقل کی ہے (ان اللّٰہ عزّوجل یقول:وعزّتی وعظمتی وجلالی و بھائی وعلوّی وارتفاع مکانی لایؤثرعبد ھوای علیٰ ھواہ الاجعلت ھمہ فی آخرتہ،وغناہ فی قلبہ،وکففت علیہ ضیعتہ،وضمنت السمٰوات والارض رزقہ،وأتتہ الدنیا وھی راغمۃ[2])''آپ نے فرمایا کہ خداوند عزوجل ارشاد فرماتا ہے: میری عزت،عظمت،جلالت،جمال، رفعت اور میرے مکان کی بلندی

[1] بحار الانوار ج۷۰ ص۷۵ ۔
[2] بحارالانوار ج۷۰ص۷۷از ثواب الاعمال۔

اور ارتفاع کی قسم کوئی بندہ میری مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح نہیں دیگامگر یہ کہ میں اس کی کل فکر اس کی آخرت کے لئے قرار دیدونگااورا سکے قلب میں استغنا پیدا کر دونگااور اس کی پونجی کا ذمہ دار رہونگا ۔ آسمان و زمین اسکے رزق کے ضامن ہیں اور اسکے سامنے جب دنیا آئے گی تو اسکی ناک رگڑی ہوئی ہوگی ''ابن فہد حلی (رح) نے اپنی کتاب ''عدۃالداعی ''میں رسول اللہ ﷺ سے یہ روایت نقل کی ہے :کہ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے: (وعزّتی وجلالی و عظمتی وکبریائی ونوری وعلوی وارتفاع مکانی لایؤثرعبد ھوای علیٰ ھواہ،الا استحفظتہ ملا ئکتی وکفلت السمٰوات والارض رزقہ،وکنت لہ من وراء تجارۃکل تاجر،وأتتہ الدنیا وھی راغمۃ[1]) ''میری عزت ،جلالت، عظمت،کبریائی،نور،بلندی اور رفیع مقام کی قسم کوئی بندہ میری (خواہش)مرضی کو اپنی خواہش پر ترجیح نہیں دیگامگر یہ کہ ملائکہ اسکی حفاظت کرینگے ۔

آسمان اور زمین اسکے رزق کے ذمہ دار ہیں اور ہر تاجر کی تجارت کے پس پشت میں اسکے ساتھ موجود ہوں اور دنیا اسکے سامنے ذلت و رسوائی کے ساتھ حاضر ہوگی ''شیخ کلینی نے اصول کافی میں سند کے ساتھ یہ روایت امام محمد باقرؑ سے یوں نقل کی ہے: (الاکففت علیہ ضیعتہ وضمنت السموات والارض رزقہ،وکنت لہ وراء تجارۃکل تاجر[2]) ''مگر یہ کہ میں اسکے ضروریات زندگی (پونجی)کا ذمہ دارہوں اور آسمان و زمین اسکے رزق کے ضامن ہیں اور میں ہر تاجر کی تجارت کے پس پشت اسکے ساتھ ہوں''

مرضی خدا کو اپنی خواہش پر ترجیح دینا

اس ترجیح دینے کے معنی یہ ہیں کہ انسان خداوند عالم کے ارادہ کو اپنی خواہشات کے اوپر حاکم بنالے اور احکام الٰہیہ کے مطابق اپنے نفس کو اسکی خواہش سے روکتا رہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: (وأما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی الماویٰ[3]) ''اور جس نے رب کی بارگاہ میں حاضری کا خوف پیدا کیا اور اپنے نفس کو خواہشات سے روکا،جنت اسکا ٹھکانہ اور مرکز

---

[1] بحارالانوار ج۷۰ص۷۸۔
[2] بحار الانوار ج۷۰ص۷۹۔
[3] سورۂ نازعات آیت ۴۰۔۴۱۔

ہے'' تقویٰ اور فسق وفجور (برائیوں) کے راستے جس نقطہ سے ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں وہ نقطہ وہی ہے جہاں خداوند عالم کی خواہش (اسکا حکم اور قول) اور انسان کی خواہش (ہوس) کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جب انسان خدا کی خواہش (مرضی) کو اپنی خواہش کے اوپر ترجیح دیتا ہے تو وہ تقوے کے راستہ پر چلنے لگتا ہے اور جب اپنی خواہشوں کو خدا کی مرضی کے اوپر ترجیح دینے لگتا ہے تو فجور (برائیوں) کے راستے پر لگ لیتا ہے ۔ا۔جعلت غناہ فی نفسہ'' اسکے نفس میں استغنا پیدا کردوں گا''،لوگوں کے درمیان عام تاثر یہ ہے کہ فقر وغنیٰ کا تعلق سونے اور چاندی اور زروجواہرات سے ہے اور نفس و قلب سے اسکا کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اسلام میں فقرو غنیٰ کا مفہوم اسکے برعکس ہے اسلام کی نگاہ میں فقر اور غنیٰ کا تعلق نفس سے ہے نہ کہ مال ودولت سے، لہٰذا ہوسکتا ہے کہ ایک ایسا انسان غنی ہو جو مالی اعتبار سے فقیر ہو اور ہوسکتا ہے کوئی انسان فقیر ہو چاہے وہ مالی اعتبار سے ثروتمند ہی کیوں نہ ہو۔

امام حسینؑ کی دعائے عرفہ میں وارد ہوا ہے: (اللّٰھم اجعل غنای فی نفسی،والیقین فی قلبی،والاخلاص فی عملی، والنور فی بصری،والبصیرۃ فی دینی) ''پروردگار میرے نفس کو غنی بنادے ،میرے قلب کو یقین، عمل میں اخلاص ،آنکھوں میں نور اور دین میں بصیرت عطا فرما'' آخر فقر و غنیٰ کا مفہوم مال ودولت کے بجائے نفس سے متعلق کیسے ہوتا ہے؟اسکا راز کیا ہے ؟ در حقیقت تبدیلی کا یہ راز دین اسلام کے پراسرار عجائبات میں شامل ہے۔ہمیں گاہے بگاہے اسکے بارے میں غور وخوض کرنا چاہئے۔

افکار کی تبدیلی میں اسلامی اصطلاحات کا کردار

''فقر'' اور ''استغنا'' دو اسلامی اصطلاحیں ہیں اور اسلام اپنی اصطلاحات کے لئے بہت اہمیت کا قائل ہے اسی لئے اسلام نے دور جاہلیت کی کچھ اصطلاحوں کو کالعدم قرار دیا ہے اور انکی جگہ پر بہت سی نئی اصطلاحات پیش کی ہیں اور انھیں اصطلاحات کے ذریعہ فکرو خیال میں تبدیلی کی ہے اور قدرو قیمت کا نیا نظام پیش کیا ہے۔دور جاہلیت میں اقدار کے اصول جدا تھے جبکہ اسلام کے اصول الگ ہیں۔ کبھی اسلام دور جاہلیت کی قدروں کو مکمل طریقہ سے ختم کرتا ہے اور ان کی جگہ پر سماجی زندگی کے جدید اقدار

کوروشناس کراتاہے ۔زمانہ جاہلیت میں جس چیز کو سیاسی،اخلاقی اور سماجی زندگی میں بے قیمت سمجھا جاتا تھا اسلام نے اسی چیز کو سیاسی،سماجی اور اخلاقی طور پر بیش قیمت بنا کر پیش کیا ہے ۔مثلاً دور جاہلیت میں عورت کی کوئی حیثیت اور قدروقیمت نہیں تھی لوگ لڑکیوں کے وجود کو ننگ وعار سمجھتے تھے لیکن اسلام نے اسی بے قیمت سمجھی جانے والی چیز کو عظیم ترین بلندی عطا کی۔ قدروقیمت کا اختلاف در اصل قدروقیمت کے نظام میں اختلاف کی بنیاد پر سامنے آتا ہے کیونکہ تمام اقدار حقیقتاً کسی نہ کسی اصول اورنظام کی بنیاد پر استوار ہوتے ہیں جن کی معرفت کے بغیر اقدار کی معرفت ممکن نہیں ہے ۔دین اسلام نے اپنی اصطلاحات کے ذریعہ اقدار کے اصول ونظام کو تبدیل کیا ہے جسکے نتیجہ میں اقدار خود بخود تبدیل ہوجاتے ہیں اور سماج میں تبدیلی آجاتی ہے بطور نمونہ فقط اس تبدیلی کی جانب اشارہ کردینا کافی ہے جو اسلام نے فقروغنی کے معیار میں کی ہے جس کے نتیجہ میں ان کے مفہوم میں بھی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔

فقرواستغنا اور اقدار کے اسلامی اصول

عام طورسے لوگوں کے درمیان فقر وغنی کا مطلب مال ودولت کی قلت وکثرت ہے۔یعنی جسکے پاس زیادہ سونا چاندی نہ ہو وہ فقیرہے اور جس کے پاس سونا چاندی وافر مقدار میں ہوا سے غنی کہا جاتا ہے اور مالداری کے درجات بھی مال کی مقدار سے طے ہوتے ہیں۔یعنی جس شخص کی قوت خرید جتنی زیادہ ہوتی ہے وہ اتنا ہی بڑا مالدار شمار کیا جاتا ہے اسکے برخلاف جس کے پاس روپے پیسوں کی قلت ہووہ اتنا ہی غریب سمجھا جاتا ہے۔اس طرح عام لوگوں کے خیال میں فقر واستغنا کا تعلق کمیّت ''مال کی مقدار'' سے ہے۔

دور جاہلیت کا نظام قدروقیمت

فقرواستغنا کے ان معنی میں بذات خود کوئی خرابی نہیں ہے اور اگر بات یہیں تمام ہوجاتی تو اسلام اسکی مخالفت نہ کرتا لیکن حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ جاہلیت کے نظام کے تحت ثروتمندی سے سماجی اور سیاسی اقدار بھی جڑجاتے ہیں اور ثروتمندانسان معزز و محترم

کہلاتاہے اسکی سماجی حیثیت اورا سکے سیاسی نفوذ میں اضافہ ہوجاتاہے وہ لوگوں کا معتمدبن جاتاہے وغیرہ ۔ ۔ ۔اس طرح نظام جاہلیت میں واضح طور پر کمیت(Quantity) کیفیت(Quality)میں تبدیلی ہوجاتی ہے۔جب بھی ہم غور کریں گے تو ہمیں صاف محسوس ہوگاکہ یہاں زروجواہر کی مقدارو کمیت(Quantity)سماجی اور سیاسی کیفیت میں تبدیلی ہوگئی ہے بلاشبہ اجتماعی اور سماجی زندگی میں مقدارو کمیت(Quantity)اور کیفیت میں براہ راست تعلق پایاجاتا ہے اور اس تعلق اور رابطہ کو ختم کرنایا اسکا انکار ناممکن ہے اور اسلام بھی اس تعلق اور رابطہ کو ختم کرنا نہیں چاہتابلکہ اس رابطہ کو الٹ دینا چاہتا ہے یعنی کمیت اور مقدار کو کیفیت کا تابع قرار دیتا ہے نہ کہ کیفیت کو کمیت کا ۔مثلاًاقصادی اور کاروباری معاملات کی بنیاد صداقت اور تقویٰ ہوناچاہئے اور اسی بنیاد پر کاروبار کو وسعت دینا چاہیے یا سیاسی میدان میں بھی ہرچیزکی بنیاد صداقت اور تقویٰ ہوناچاہئیے اوراسی بنیاد پرووٹ حاصل کرنا چاہیے کہ یہی چیزیں صحتمند معاشرے کی پہچان ہیں۔

لیکن اگر معاملہ اس کے برعکس ہو اور سماجی یا سیاسی زندگی میں کمیت ومقدار معیار بن جائے تو سماج میں پائے جانے والے اقدار و اصول کا وجود خطرہ میں پڑجاتاہے۔دور جاہلیت میں بعینہ یہی صورت حال موجود تھی کہ مادیت پرروحانیت کی حکومت ہونے کے بجائے مادیت،روحانیت پر حاکم ہوگئی تھی اور قدروقیمت کا تعین مادیت سے ہوتا تھا نہ کہ معنویت سے۔اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ یہی صورت حال مسلمانوں کے سامنے بھی آئی اسلام نے قدروقیمت کا ایسا نظام پیش کیا تھا کہ جو دور جاہلیت کے پروردہ لوگوں کے لئے نامانوس تھا۔

اس نظام میں اسلام نے قدروقیمت اور منزلت کا معیار روحانیت کو قرار دیا تھا اور مادیت کو روحانیت کا تابع بنایا تھا۔لیکن جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور قیصر و کسریٰ کے خزانے مسلمانوں کے ہاتھ آئے اور سرحدوں کی وسعت کے ساتھ دولت میں بھی بے پناہ اضافہ ہواتو مادیت غالب آگئی اور قدروقیمت کا نظام پس پشت چلاگیا۔اور دوبارہ زروجواہر ہی تمام اقدار کا معیار بن گئے اور انکی حالت اس عہد کی سی ہوگئی جس میں خداوند عالم نے رسول اسلام ﷺ کو مبعوث کیا تھا اور آپ کو قائدوپیشوا اور رسول بنا

کر بھیجا تھا۔ عثمان بن عفان کے بعد امیر المومنین حضرت علی بن ابی طالبؑ جب حاکم مسلمین ہوئے تو آپ نے محسوس کیا کہ اسلامی معاشرہ اس طرح منقلب ہوچکا ہے کہ جیسے کوئی اس طرح الٹا لباس پہن لے جسکا اندرونی حصہ باہر،اور ظاہری حصہ اندر ،اوپری حصہ نیچے اور نچلا حصہ اوپر ہوگیا ہو۔

چنانچہ امیر المومنینؑ،بنی امیہ کے بارے میں فرماتے ہیں:(ولُبس الاسلام لُبسَ الفرو مقلوباَ [1]) ''اسلام یوں الٹ دیا جائے گا جیسے کوئی الٹی پوستین پہن لے''،جیسا کہ آپ نے ان الفاظ میں اسکی عکاسی کی ہے: (ألا وان بلیتکم قدعادت کھیئتھا یوم بعث اللّٰہ نبیکم،والذّی بعثہ بالحق لتبلبلن بلبلۃَ ولتغربلن غربلۃ،ولتساطُن سَوطَ القدر حتّی یعود اسفلکم أعلاکم [2]) ''یاد رکھو!تمہارا امتحان بالکل اسی طرح ہے جس طرح پیغمبر کی بعثت کے دن تھا اس ذات کی قسم جس نے رسول کو حق کے ساتھ بھیجا تم بری طرح تہ وبالا کئے جاؤ گے اور اس طرح چھانے جاؤ گے جس طرح چھنّی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے اور اس طرح خلط ملط کئے جاؤ گے جس طرح پتیلی کے کھانے کو پلٹا جاتا ہے یہاں تک کہ تمہارے ادنیٰ اعلیٰ اور اعلیٰ ادنیٰ ہوجائیں گے''۔

امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ عنقریب یہ قوم اسلامی اقدار ومفاہیم اور اصول کو چھوڑ کر ایک عظیم فتنہ میں مبتلا ہونے والی ہے اور اسکی وہ حالت ہوجائے گی جو کھولتے ہوئے شوربہ کی ہوتی ہے کہ اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا حصہ اوپر ہوجاتاہے۔فتوحات کی وسعت اور خدا کی جانب سے رزق میں فراوانی کے باعث امت اسلامیہ کی یہی حالت ہوگئی تھی جیسا کہ مال و نعمت کی زیادتی کے باعث عہد جاہلیت کی بھی یہی افسوسناک حالت تھی۔دور جاہلیت کے نظام قدروقیمت کوتبدیل کرنے اور اس سے مقابلہ کرنے کے لئے اسلام نے فقر اوراستغنا کی نئی اصطلاحیں ایجاد کیں اور انہیں نئی اصطلاحوں اور نئے مفاہیم کے ذریعہ دور جاہلیت کے نظام قدروقیمت کوتبدیل کردیا۔

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۰۸۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۶۔

قدر و قیمت کا اسلامی نظام

لفظ غنی یا استغنا کے معنی کو دو طرح سے بیان کیا جاتا ہے ۔ایک بیان کے مطابق استغنا کا مطلب ہے ''انسان کے پاس زر و جواہر کا بکثرت موجود ہونا''اس طرح غنی کے معنی کا تعلق عالم محسوسات سے ہے اور یہ مطلب لفظ ''ثروتمند''کے مترادف ہے۔دوسرے بیان کے مطابق حقیقتاً استغنا سے مراد ''دل کا مستغنی ہونا''ہے جو کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور توکل سے حاصل ہوتا ہے اور اس معنی کا مال کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور عین ممکن ہے کہ انسان کے پاس بے پناہ مال و دولت ہو مگر پھر بھی وہ فقیر ہو اور ہوسکتا ہے کہ مال و دولت بالکل نہ ہو پھر بھی انسان غنی ہو۔

فقر و استغنا کے یہ معنی،لغوی اور رائج معنی سے بالکل مختلف ہیں۔اور ان معنی کے لحاظ سے استغنا کا تعلق نفس انسانی سے ہے نہ کہ مال و دولت اور خزانہ سے۔دین اسلام لفظ فقر و استغنا کو نئے معنی و مفاہیم دے کر در اصل دور جاہلیت کے نظام قدر و قیمت کو تبدیل کرکے اسکے مقابلہ میں جدید نظام پیش کرنا چاہتا ہے۔اسکی مزید وضاحت کے لئے ہم استغنا اور فقر کے بارے میں اسلامی روایات کی روشنی میں پہلے لفظ استغنا کا مطلب بیان کریں گے اور پھر اس جدید نظام کی وضاحت کریں گے جو اسلام نے قدر و قیمت کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔

اسلامی روایات میں استغنا کا مفہوم

رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:(لیس الغنیٰ عن کثرۃ العرض،ولکن الغنیٰ غنیٰ النفس[1]) ''مال و متاع کی کثرت کانام استغنا نہیں بلکہ استغنا کا مطلب نفس کا مستغنی ہونا ہے''

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:(الغنیٰ فی القلب،والفقر فی القلب[1]) ''استغنا بھی دل میں ہوتا ہے اور فقر بھی دل ہی میں ہوتا ہے''امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا ہے:(الغنی من استغنیٰ بالقناعۃ[2]) ''غنی وہ ہے جو قناعت کے باعث مستغنی ہو''

---

[1] تحف العقول ص۴۶۔

آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے: (لاکنز اغنیٰ من القناعة[3]) ''غنی (ہونے) کے لئے قناعت سے بڑھکر کوئی خزانہ نہیں ہے''نیز آپؑ نے فرمایا ہے: (طلبت الغنیٰ فما وجدت الاّ القناعة، علیکم بالقناعة تستغنوا[4]) ''میں نے استغنا کو تلاش کیا تو مجھے قناعت کے علاوہ کچھ نظر نہ آیا۔ تم بھی قناعت اختیار کرو تو مستغنی ہوجاؤگے''امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے: (لا فقر کفقر القلب، ولا غنیٰ کغنیٰ القلب[5]) ''دل کی فقیری جیسا کوئی فقر نہیں ہے اور دل ہی کے استغنا جیسی کوئی مالداری بھی نہیں ہے''

امام ہادیؑ کا ارشاد ہے: (الغنیٰ قلّة تمنّیک، والرضا بمایکفیک[6]) ''استغنا کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری خواہشات کم ہوں اور جتنا تمہارے لئے کافی ہے اسی پر راضی رہو'' (خواہشات کا کم ہونا اور 'بقدر کافی' پر راضی ہوجانا استغنا ہے۔)اس طرح اسلام نے استغنا کا تعلق سونے چاندی،زمین جائداد سے ختم کر دیا اور اسے نفس کے متعلق قرار دیا ہے،بلکہ اسلامی روایات تو اس سے بڑھ کر یہاں تک بیان کرتی ہیں کہ جو افراد مال ودولت کے لحاظ سے ثروتمند ہوتے ہیں اکثر وہ افراد دل کے چھوٹے اور فقیر ہوتے ہیں۔ عموماً جب انسان دنیاوی لحاظ سے مالدار ہوتا ہے تو دل کا چھوٹا اور فقیر ہوتا ہے ایسا نہیں ہے کہ ثروتمند ہونے اور نفس وقلب کے اعتبار سے چھوٹے اور فقیر ہونے میں کوئی معکوس رابطہ ہو۔ نہیں ہرگز نہیں ان دونوں باتوں میں کوئی معکوس رابطہ نہیں ہے۔

در حقیقت ایسی صورت حال ان عوارض کے باعث پیدا ہوتی ہے کہ جو عموماً معاشرہ میں رائج ثروتمندی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔امیر المومنین حضرت علیؑ سے روایت ہے: (۔وغنیها (الدنیا) فقیر[7]) ''۔اور دنیا کا غنی فقیر ہوتا ہے''حضرت امام زین العابدینؑ نے فرمایا : (من اصاب الدنیا اکثر،کان فیها أشدّ فقراً[8]) ''جسے دنیازیادہ نصیب ہوجائے گی وہ دنیا میں زیادہ فقیر ہوگا''جسے دنیازیادہ نصیب ہوجائے گی وہ دنیا میں زیادہ فقیر ہوگا یہ لازم و ملزوم کیوں ہیں ؟ثروتمندی اور استغنا دونوں لفظ غنی کے

---

[1] بحارالانوار ج۷۲ص۶۸۔
[2] غررالحکم ج۱ص۶۲۔
[3] نہج البلاغہ حکمت ۳۷۱۔
[4] سفینۃالبحار ج۲ص۸۷ ،الحیات جلد ۳ ص ۳۴۲۔
[5] تحف العقول ص۲۰۸۔
[6] بحارالانوار ج۸۷ص۳۶۸۔
[7] بحارالانوار ج۷۸ص۱۴۔
[8] خصال صدوق ج ۱ صفحہ ۶۴۔

ہی معنی ہیں مگر ان کے درمیان معکوس رابطہ کیوں پایا جاتا ہے؟اس سوال کا جواب اوراس رابطہ کا سبب ہمیں امیر المومنین حضرت علیؑ کی اس حدیث سے بخوبی معلوم ہو جائے گا آپ نے فرمایا: (الغَنِیّ الشَّرِہِ فقیرٌ[1]) ''لالچی مالدار فقیر ہوتا ہے'' اس حدیث مبارک میں غنی سے مراد ثروتمند ہے اور فقیر سے مراد نفس و قلب کے اعتبار سے فقیر ہے اور اس حدیث میں جو لفظ ''شرہ''حریص آیا ہے وہ اس معکوس رابطہ کو بیان کرتا ہے اس لئے کہ عام لوگوں کے لحاظ سے جس کے یہاں استغنا پایا جاتا ہے جو ثروتمند ہوتا ہے وہ عموماً حریص بھی ہوتا ہے اور عموماًجتنا مال ودولت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے آدمی کی حرص و ہوس میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے اور یہ طے شدہ ہے کہ جب حرص و طمع میں اضافہ ہوگا تو انسان کی اذیت و پریشانی میں اضافہ ہوگا انھیں دونوں حقیقتوں کی جانب قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے ارشاد رب العزت ہے:(انما یرید اللّٰہ لیعذّبھم بھا فی الحیاۃ الدنیا وتزھق انفسھم وھم کافرون[2])'' بس اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ انہیں کے ذریعہ ان پر زندگانی دنیا میں عذاب کرے اور حالت کفر ہی میں ان کی جان نکل جائے۔

'' دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:(انما یرید اللّٰہ أن یعذّبھم بھا فی الدنیا[3])''بس اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ انہیں کے ذریعہ ان پر دنیا میں عذاب کرے۔حرص وطمع اسی وقت پایا جاتا ہے جب انسان قلب کے لحاظ سے فقیر ہو ۔نفس جتنا خالی ہو اور فقیر ہوگا حرص وہوس کا اظہار اتنا ہی شدید ہوگا ۔حضرت داؤدؑ کے دور میں لوگوں کی یہی حالت تھی چنانچہ خداوند عالم نے انھیں توبہ کرنے اور بارگاہ الٰہی میں واپس آنے کا حکم دیا۔حرص و ہوس کس منزل تک پہونچ سکتے ہیں سورۂ ص کی یہ آیت اسکی بخوبی نشاندہی کرتی ہے:(ان ھذا أخی لہ تسع وتسعون نعجۃ ولی نعجۃ واحدۃ فقال:أکفلنیھا و عزّنی فی الخطاب[4])''یہ ہمارا بھائی ہے اسکے پاس ننانوے دنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہے یہ کہتا ہے وہ بھی میرے حوالے کردے اور اس بات میں سختی سے کام لیتا ہے''

---

[1] بحارالانوار ج۷۸ص۲۲۔
[2] سورۂ توبہ آیت ۵۵۔
[3] سورۂ توبہ آیت ۸۵۔
[4] سورۂ ص آیت۲۳۔

اقدار کے نظام میں انقلاب

اس طرح اسلام نے استغنا کے نئے معنی پیش کئے اور استغنا کا تعلق زروجواہر اور مال و دولت سے ختم کرکے اسے نفس اور قلب سے جوڑدیا ہے اس طرح قدروقیمت کا معیار مال وثروت کے بجائے نفس کو قرار دیا ۔اسلام کی نگاہ میں انسان کی قدروقیمت اسکے مال ودولت اور منقولہ وغیر منقولہ جائیداد سے نہیں طے کی جاسکتی جیسا کہ جاہل افراد آج بھی یہی سوچتے ہیں بلکہ اسلام کی نگاہ میں انسانی قدروقیمت کی بنیاد اللہ پرایمان ،تقویٰ ،علم اور دیگر اخلاقی اقدار ہیں ۔اسلام لفظ ثروتمندی اور فقر کے اصل معنی کا منکر نہیں ہے بلکہ اسلام نے اس معنی کے مفہوم میں اضافہ کیا ہے کہ قدروقیمت کے تعیّن کے وقت بے نیازی اور فقر کے معاشی رخ کو ملحوظ نہ رکھا جائے قدروقیمت کا معیار فقروغنی ہی ہیں مگر اس مفہوم میں کہ جو اسلام نے پیش کیا ہے ۔

امیر المومنینؑ کا ارشاد ہے: (لیس الخیر أن یکثر مالک،ولکن الخیر أن یکثر علمک،وأن یعظم حلمک،وأن تباھی الناس بعبادة ربک،فان أحسنت حمدت اللہ،وأن أسأت استغفرت اللہ[1]) ''بھلائی یہ نہیں ہے کہ تمہارا مال زیادہ ہو بلکہ حقیقی نیکی یہ ہے کہ تمہارا علم زیادہ ہو۔حلم عظیم ہو اور عبادت پروردگار کو فخر ومباہات کا معیار قرار دو چنانچہ اگر تم نے اچھی طرح عبادت انجام دی ہوتو حمد خدا کرو اور اگر عبادت میں کمی کی ہوتو بارگاہ الٰہی میں استغفار کرو'' چنانچہ جب قدروقیمت کا نظام بدل جائے گا تو خود بخود لوگوں کی سماجی اور سیاسی حیثیت میں بھی فرق آجائے گا اس لئے کہ کسی بھی تہذیب میں اگر اقدار ایک جانب اپنے نظام سے جڑے ہوتے ہیں تو دوسری جانب انکا تعلق سماجی ،سیاسی معاشی اور علمی حیثیت و منزلت سے بھی ہوتا ہے ۔اگر آج ہمیں جاہلیت زدہ مغربی تہذیب میں یہ نظر آتا ہے کہ اس تہذیب میں سرمایہ داری کا دخل کتنا ہے ،سیاست ،معاشیات اور پروپیگنڈہ پر سرمایہ کا کتنا تسلط اور غلبہ ہے ،صدراور حکومت کے انتخابات میں سرمایہ داری کا کتنا اہم کردار ہے میڈیا یہاں تک کہ سیاسی روابط سبھی کچھ سرمایہ داری کے تابع ہیں! ہماری نگاہ میں اسکا سبب یہ ہے کہ اس تہذیب کی بنیاد مادیت پر ہے نہ کہ اخلاقی اور روحانی اقدار پر ۔ اسکے برخلاف

[1] نہج البلاغہ حکمت ۹۴۔

اسلام کی نگاہ میں ان چیزوں کی بنیاد اخلاقی و روحانی اقدار ،بندہ کا اللہ سے رابطہ ،عدالت وتقوی اور علم پر استوار ہے ۔ارشاد پروردگار ہے:(انما یخشیٰ اللہ من عبادہ العلماء[1]) ''اللہ سے ڈرنے والے اسکے بندوں میں صرف صاحبان معرفت ہیں'' دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: (اِن اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ)[2] ''بیشک تم میں سے خدا کے نزدیک زیادہ محترم وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے'' اسلام ،قائدا و رہبر مسلمین کے لئے تقویٰ اور عدالت کو ضروری قرار دیتا ہے اسی طرح قاضی پیش نماز اورامین (جس کے پاس لوگ امانتیں رکھواتے ہیں) بہ الفاظ دیگر ان تمام افراد کے لئے تقوی و عدالت کو لازمی شرط قرار دیتا ہے جو سماج اور معاشرہ میں کسی بھی عنوان سے مقام ومنزلت کے مالک ہوں۔اسی لئے جب نظام اقدار میں تبدیلی آئے گی توخود بخودمعاشرہ کی سماجی،سیاسی،معاشی،علمی،دینی حیثیتوں میں تبدیلی ناگزیر ہے ۔

اس طرح تین مرحلوں میں یہ عمل انجام پاتا ہے: ا۔نظام اقدار میں تبدیلی

۲۔اقدار میں تبدیلی

۳۔سماجی اور سیاسی حیثیت میں تبدیلی

اب جبکہ استغنا سے متعلق اسلامی نظریہ واضح ہوگیا اور لوگوں کی زندگی میں اس کے کردار کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوگیا تو اب ہم نفس کے استغنا اور بے نیازی کے بارے میں کچھ بیان کر سکتے ہیں جس کے بارے میں حدیث شریف کے الفاظ یہ ہیں ''جعلت غناہ فی نفسہ '' نفس کی بے نیازی سوال یہ کہ نفس کی بے نیازی ہے کیا ؟اور ہم اپنے اندر یہ بے نیازی کیسے پیدا کر سکتے ہیں ؟ دراصل نفس کی بے نیازی اس میں مضمر ہے کہ انسان مادیات اور دنیا پر اعتماد نہ کرے بلکہ اللہ پر بھروسہ رکھے اس لئے کہ دنیا فانی ہے اور ذات الٰہی دائمی ،مادیات محدود ہیں اور خدا کی سلطنت لا محدود ۔لہٰذا جب انسان اللہ پر توکل اور بھروسہ کے سہارے

[1] سورۂ فاطر آیت ۲۸۔
[2] سورۂ حجرات آیت ۱۳۔

مستغنی اور بے نیاز ہوگا تو کبھی بھی کمزوری اور نا توانی محسوس نہیں کرے گا ۔ حالات کتنے ہی منقلب کیوں نہ ہو جائیں ،آسانیاں سختیوں میں تبدیل کیوں نہ ہو جائیں اللہ پر توکل کرنے والے کے پائے ثبات متزلزل نہ ہوں گے کیونکہ ایسی بے نیازی نفس سے تعلق رکھتی ہے اور کسی بھی عالم میں نفس سے جدا نہیں ہو سکتی ہے ۔ مولائے کائنات متقین کے صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں: (فی الزلازل وقور،وفی المکارہ صبور[1]) ''(متقین)مصائب وآلام میں با وقار اور دشواریوں میں صابر ہوتے ہیں'' اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی بے نیازی نفس کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے اور کوئی بھی پریشانی یا سختی اس بے نیازی کو ان سے جدا نہیں کر سکتی اور یہ بے نیازی اللہ پر ایمان ،اعتماد ،توکل اور اس کی رضا پر راضی رہنے سے حاصل ہوتی ہے ۔ در اصل بے نیازی یہی ہے اوراس سے بڑھکر کوئی بے نیازی نہیں ہو سکتی ہے اور حالات کی تبدیلی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے ۔

پیغمبر اکرم ﷺ کاارشاد گرامی ہے: (یا أباذر استغنِ بغنیٰ اللہ تعالیٰ یغنک اللہ[2]) ''اے ابوذراللہ کی بے نیازی کے ذریعہ مستغنی بنو اللہ (واقعاً)بے نیاز بنا دے گا'' مولائے کائنات کا ارشاد ہے: (الغنیٰ باللہ أعظم الغنیٰ،والغنیٰ بغیراللہ أعظم الفقروالشقاء[3]) ''اللہ کے ذریعہ استغناسب سے بڑا استغنا ہے اور اللہ کے بغیر استغنا سب سے بڑا فقر اور شقاوت ہے''

اس معیار کے بموجب اللہ پر جتنا زیادہ توکل اور بھروسہ ہوگا انسان اتنا ہی زیادہ مستغنی ہوگا پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: (مَن أحبَ أن یکون أغنیٰ الناس فلیکن بما فی ید اللہ أوثق منہ مما فی یدہ[4]) ''جو سب سے بڑا مستغنی ہونا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے اس سے زیادہ اس پر بھروسہ کرے جو خدا کے پاس ہے'' یہ بھی ملحوظ رہے کہ اللہ پر توکل کا مطلب مادی اسباب کو نظر انداز کرنا نہیں ہے مادی اسباب کو نظر انداز کرنا سنت الٰہی سے انحراف ہے اور اسلام اس بات کی اجازت نہیں

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۳۔
[2] مکارم الاخلاق ص ۵۳۳۔
[3] غرر الحکم ج۱ ص۹۱۔۹۲۔
[4] تحف العقول ص۲۶۔

دیتا ہے ۔بلکہ توکل کا مطلب ہے غیر کے بجائے صرف اور صرف ذات پروردگار پر اعتماد و اعتبار کرنا ۔اگر یہ اعتماد ہے تو اپنے مقصود تک پہونچنے کے لئے کسی بھی طرح کے اسباب ووسائل اختیار کرنا توکل کے خلاف نہ ہوگا ۔

بے نیازی(استغنا)کے ذرائع

جن چیزوں کے ذریعہ انسان بے نیازی حاصل کرسکتا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے ہم یہاں پر ان میں سے صرف اہم ترین عوامل کا تذکرہ کریں گے ۔ ا۔یقین:ذات پروردگار پر یقین بے نیازی کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اس لئے کہ اگر انسان کو یہ یقین ہو کہ خدا اپنے بندوں پر مہربان رہتا ہے لطف و کرم کرتا ہے ان کی دعائیں قبول کرتا ہے اور یہ بھی یقین ہوکہ وہی رازق ہے رؤوف ورحیم ہے ۔اسکی رحمت وعنایت کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والانہیں ہے اسکے خزانہ میں کوئی کمی واقع ہونے والی نہیں ہے اور کثرت عطا سے اسکے جود وکرم میں کمی کے بجائے اضافہ ہی ہوتا ہے تو انسان کبھی بھی فقرواحتیاج کا احساس نہیں کرسکتا ۔

فقرواحتیاج کا احساس اسی وقت ہوتا ہے کہ جب انسان کے پاس ایسا یقین مفقود ہو اور ایمان،یقین کی منزل تک نہ پہونچا ہو۔یقین ہی ایمان کا سب سے بلند درجہ ہے بندوں کوملنے والا سب سے بہترین رزق یقین ہے ۔مولائے کائنات کا ارشاد گرامی ہے: (مفتاح الغنیٰ الیقین[1]) ''یقین بے نیازی کی کنجی ہے'' امام محمد باقر کا ارشاد ہے: (کفیٰ بالیقین غنیً وبالعبادۃ شغلاً[2]) ''بے نیازی کے لئے یقین کافی ہے اور عبادت بہترین مشغلہ ہے''

۲۔تقویٰ:بے نیازی کے اسباب وعوامل میں تقویٰ بھی اہم ترین عامل ہے ۔انسان جب احکام خدا کا پابند ہوگا اور حدود الٰہیہ کا خیال رکھے گا تواللہ اس کے دل کو بے نیاز بنادے گا اور اس کے فقرواحتیاج کوختم کردے گا ۔پیغمبر اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: (کفیٰ بالتقیٰ غنیٰ[3]) ''مستغنی ہونے کے لئے تقویٰ کافی ہے'' امام محمد باقر نے فرمایا:(یاجابر ان أھل التقویٰ ھم

[1] بحارالانوار ج۷۸ ص۹۔
[2] اصول کافی ج۲ص۸۵۔
[3] تحف العقول ص۳۰۔

الأغنياء،أغناهم القليل من الدنيا،فمؤنتهم يسيرة،ان نسيت الخير ذكروك،وان عملت به أعانوك،أخّروا شهواتهم و لذّاتهم خلفهم،وقدموا طاعة ربّهم أمامهم[1]) ''اے جابر صاحبان تقویٰ ہی مالدار ہیں ان میں بھی سب سے بڑا غنی وہ ہے دنیا جس کا میں تھوڑا حصہ ہو ان کے اسباب معیشت بہت مختصر ہوتے ہیں اگر تم عمل خیر کو بھول جاؤتو یہ تمہیں یاد آوری کریں گے اگر تم عمل خیر کروگے تو تمہارے معاون ومددگار ہوں گے وہ اپنے خواہشات کو موخر اور لذتوں کو پس پشت رکھتے ہیں ان کے پیش نظر صرف اطاعت پروردگار ہوتی ہے اور وہ اسی کو مقدم رکھتے ہیں'' ایک اور حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے: (من أخرجہ اللّٰہ تعالیٰ من ذل المعاصی الیٰ عز التقویٰ،أغناہ اللّٰہ بلا مال، وأعزّہ بلا عشیرۃ،وآنسہ بلا أنیس[2]) ''خدا جسے گناہوں کی ذلت سے نکال کر تقویٰ کی عزت سے سرافراز کرتاہے اسے بغیر مال کے غنی ،بغیر خاندان و قبیلہ کے عزیز اور ساتھیوں کے بغیر تسکین قلب اور انسیت عطا کردیتا ہے''اس حدیث شریف میں نفس کی بے نیازی کے بعینہ وہی معنی پائے جائے ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں کہ نفس مال وثروت کے بغیر بھی غنی ہوسکتا ہے بغیر خاندان کے صاحب عزت بن سکتا ہے ہم نوا اور مونس کے بغیر بھی اپنی وحشتناک تنہائی کا مداوا کرسکتا ہے ۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بے نیازی کا منبع و سرچشمہ تقویٰ الٰہی ہے اسی تقوے کے ذریعہ نفس انسانی اپنے اندر عزت وانس کا احساس کرتا ہے اس لئے کہ جب انسان متقی اور حدود و احکام الٰہیہ کا پابند ہوگا تواللّٰہ بھی اسکے نفس کو غنی بنادے گا اور اس سے فقروذلت اور وحشت کو دور رکھے گا ۔جس حدیث قدسی کے بارے میں ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں: (لایؤثرھوای علیٰ ھواہ الاجعلت غناہ فی نفسہ) ''کوئی بندہ میری مرضی کو اپنی خواہشات پر ترجیح نہیں دے گا مگر یہ کہ میں اسکے نفس میں استغنا پیدا کردوں گا''اور مخالفت نفس کا ہی نام تقویٰ ہے جس کا دوسرا نام اطاعت پروردگار ہے ۔

---

[1] تحف العقول ص۲۰۸۔
[2] وسائل الشیعہ ج۱۱ص۱۹۱۔

۳۔شعور ،یقین و تقویٰ اگر بے نیازی اور استغنا کی کنجی ہیں تو فہم و شعور یقین و تقویٰ کی کنجی اور ان تک پہونچنے کا راستہ ہے انسان فقط جہالت کے باعث ہی تقویٰ اور یقین سے محروم ہو سکتا ہے یہاں فہم و شعور سے ہماری مراد تدبر و تعقل ہے اسلامی روایات میں یہ معنی کثرت سے پائے جاتے ہیں ۔

امیر المومنین حضرت علی،کا ارشاد ہے: (لاغنیٰ مثل العقل[1]) ''عقل کے مانند کوئی بے نیازی نہیں ہے''آپ،ہی کا ارشاد ہے :(ان أغنیٰ الغنیٰ:العقل[2]) ''سب سے بڑی بے نیازی عقل ہے'' نیز آپ،نے فرمایا ہے: (غنیٰ العاقل بعلمہ،وغنی الجاہل بمالہ[3]) ''عاقل اپنے علم اور جاہل اپنے مال کے ذریعہ مستغنی ہوتا ہے''،مشہور و معروف حدیث کے مطابق امام موسیٰ کاظم،نے اپنے صحابی ہشام بن حکم سے فرمایا: (یاہشام:من أراد الغنیٰ بلا مال،وراحۃ القلب من الحسد،والسلامۃ فی الدین، فلیتضرّع الیٰ اللّٰہ فی مسألتہ بأن یکمل عقلہ[4]) ''اے ہشام جو انسان مال کے بغیر بے نیازی کا خواہاں ہو،اپنے قلب کو حسد سے محفوظ رکھنا چاہتا ہو ،دین کی سلامتی چاہتا ہو اس کو تضرع و زاری کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں دعا کرنا چاہئے کہ خداوند عالم اس کی عقل کو سالم کردے ۔

حیات انسانی میں بے نیازی کے آثار

انسانی زندگی میں نفس کی بے نیازی کے بہت فائدے ہیں چونکہ پروردگار جس کے نفس کو بے نیازی عطا کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنے خدا سے رابطہ کا احساس کرتا ہے اسے ہر وقت یہ احساس رہتا ہے کہ اللہ اس کے ساتھ ہے اور ہر وقت تائید و عنایت الٰہی اس کے شامل حال ہے لہٰذا وہ تائید و عنایت الٰہی کے باعث سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرتا ہے اسے یہ یقین ہوتا ہے کہ میرا خدا مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑے گا اور نہ ہی کبھی مجھے میرے نفس کے حوالے کرے گا ۔اس طرح اس کی زندگی میں مکمل اعتماد و اعتبار، اطمینان ثبات قدم اور سکون قلب تو نظر آتا ہے مگر کبھی بھی حرص و ہوس ،حسد ،لالچ اور اضطراب و پریشانی نظر نہیں آتی اس کی وجہ یہ ہے کہ

---

[1] تحف العقول ص۱۴۲۔
[2] نہج البلاغہ حکمت ۳۸۔
[3] غرر الحکم ج۲ص۴۷۔
[4] تحف العقول ص۲۸۶۔

یہ تمام نفسانی بیماریاں نفس کی کمزوری اور فقر سے پیدا ہوتی ہیں جس کی طرف ابھی ہم نے حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی حدیث کے ذیل میں اشارہ کیا تھا ۔امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے: (أغنیٰ الغنیٰ من لم یکن للحرص أسیراً[1]) ''سب سے بڑا غنی وہ ہے جو حرص و ہوس کا اسیر نہ ہو'' امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: (أشرف الغنیٰ ترک المنیٰ[2]) ''شریف ترین بے نیازی، خواہشات کا ترک کرنا ہے''آپ ہی کا ارشاد ہے: (الغنیٰ الاکبر :الیأس عمّا فی أیدی الناس[3]) ''سب سے بڑی بے نیازی یہ ہے کہ انسان اس کا امید وار نہ ہو جو لوگوں کے پاس ہے '' اور جب مال نفس کو بے نیاز نہ بنا سکے تو پھر وہ اضطراب و بے چینی کا سبب بن جاتا ہے اور انسان کے حرص و طمع اور مشکلات میں اضافہ کرتا رہتا ہے ۔

اس سلسلہ میں خداوند عالم کا ارشاد ہے: (انما یرید اللّٰہ لیعذبھم بھا فی الحیاۃ الدنیا وتزھق أنفسھم[4]....) ''پس اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ انھیں (اموال واولاد) کے ذریعہ ان پر زندگانی دنیا میں عذاب کرے اور حالت کفر میں ہی ان کی جان نکلے'' (انما یرید اللّٰہ أن یعذبھم بھا فی الدنیا و تزھق أنفسھم[5]......) ''اور خدا ان کے (اموال واولاد) ذریعہ ان پر دنیا میں عذاب کرنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ کفر کی حالت میں ان کا دم نکلے''

۲۔ضمنت السمٰوات'' :زمین و آسمان اسکے رزق کے ضامن ہیں''یہ جملہ ان لوگوں کی دوسری جزا ہے جو اللہ کے احکام کو اپنے خواہشات پر مقدم رکھتے ہیں اور اپنے خواہشات کو حکم وارادۂ الٰہی کا تابع بنا لیتے ہیں۔ایسے لوگوں کو خدا جزا وانعام سے نوازتا ہے ان کی پہلی جزا تو یہ تھی کہ خدا ان کے نفس کو غنی بنادیتا ہے جس کے بارے میں ہم تفصیل سے گفتگو کر چکے ہیں اور ان کی دوسری جزا اور انعام یہ ہے کہ آسمان وزمین ان کے رزق کے ضامن ہوتے ہیں۔

---

[1] اصول کافی ج۲ ص۳۱۶۔

[2] اصول کافی ج۸ ص ۲۳۔

[3] نہج البلاغہ حکمت ۳۴۲۔

[4] سورۂ توبہ آیت ۵۵۔

[5] سورۂ توبہ آیت ۸۵۔

واضح سی بات ہے کہ اس جملہ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان رزق حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کرے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ اس کی سعی کو کامیاب بنا دیتا ہے اور اسے توفیق عطا کرتا ہے۔

توفیق

اللہ نے توفیق کی بنا پر زمین وآسمان کو ضامن بنایا ہے کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسانی کوشش رائیگاں چلی جاتی ہے اور اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان برسوں ہاتھ پیر مارتا ہے جد وجہد کرتا ہے لیکن اپنے مقصود تک نہیں پہونچ پاتا اسکے برخلاف کبھی تھوڑی سی جدو جہد ہی نیک اور با برکت ثمرات کا سبب بن جاتی ہے یہ صرف حسن توفیق اور بے توفیقی کی بات ہے۔اور یہ طے ہے کہ خدا ہی توفیق دینے والا ہے۔

مومن اپنے خواہشات پر احکام خدا کو ترجیح دیتا ہے توخداوند عالم بطور جزا زمین و آسمان کو اسکے رزق کا ضامن بنا دیتا ہے ۔تو یہ بھی توفیق کی بنیاد پر ہے ۔یہاں توفیق کا مطلب یہ ہے کہ خداوندعالم اسکی سعی وکوشش کو مفید وکارآمد جگہ پر لگا دیتا ہے جس سے یہ سعی وکوشش نتیجہ خیزبن جاتی ہے بالکل اسی طرح جیسے زرخیززمین پر بارش ہوتی ہے البتہ کبھی بارش ہوتی ہے مگر زمین سے دانہ نہیں اگتاہے اور بارش کا پانی ضائع ہوجاتا ہے لیکن اگر زرخیز زمین پر تھوڑی سی بارش مناسب موقع پر ہوجائے تو خیر کثیر کا باعث بن جاتی ہے اور سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔

توفیق ایک الگ چیز ہے اسکا انسان کی کوشش اور جد وجہد سے کوئی تعلق نہیں ہے انسان جدوجہد کرسکتا ہے مگر توفیق اسکے اختیار میں نہیں ہے۔یہ درست ہے کہ تھوڑے اسباب توفیق انسان کے ہاتھ میں ہیں لیکن جو اسباب توفیق اسکے اختیار میں نہیں ہیں انکی تعداد کئی گنا زیادہ ہے جو سب کے سب خدا کے ہاتھ میں ہیں ۔خدا جب کسی بندہ کو توفیق سے نوازتا ہے تو اسکی زندگی اور جدوجہد بابرکت بن جاتی ہے جیسا کہ قرآن مجید نے جناب عیسیٰؑ کی ز بانی نقل کیا ہے:(وجعلنی مبارکاً أینماکنت[1])

[1] سورۂ مریم آیت ۳۱۔

''اور مجھے مبارک قرار دیا ہے چاہے میں جہاں رہوں'' جب تک اللہ کسی بندہ کو توفیق کرامت نہ فرمائے یا اسکے لئے بھلائی کا ارادہ نہ کرے تو بندہ اپنی جدوجہد اور عقل کے ذریعہ تھوڑے سے اسباب خیر ہی حاصل کرسکتا ہے۔ (لاینفع اجتھاد بغیر توفیق[1]) ''کوئی بھی کوشش توفیق کے بغیر مفید نہیں ہوتی'' اور جب پروردگار عالم کسی بندہ کی بھلائی چاہتا ہے تو اس کو توفیق مرحمت کرتا ہے اور اسکی سعی و کوشش کو فلاح و کامیابی کے راستہ پر لگادیتا ہے جس سے اسکی سعی وکوشش نتیجہ بخش ہوجاتی ہے۔ حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے: (خیر الاجتھاد ما قارنہ التوفیق[2]) ''بہترین کوشش وہ ہے جو توفیق کے ساتھ ہو''

دوسری حدیث میں وارد ہوا ہے: (التوفیق أشرف الحظّین[3]) ''توفیق دواشرف واعلی حصوں میں سے ایک ہے'' اس سے مراد یہ ہے کہ انسان کے پاس کچھ ایسے اسباب خیر وسعادت ہوتے ہیں جنہیں وہ اپنی عقل اور جدوجہد کے سہارے حاصل کرتا ہے یا وہ وسائل و ذرائع ہوتے ہیں جواللہ نے اسے عطا کئے ہیں یہ بھی نتیجہ تک پہونچنے میں شریک ہیں مگر ان کا حصہ اور ان کی منزلت کم ہے۔ دوسرا جز اور حصہ خیروبرکت کے وہ غیبی اسباب ہیں جنہیں اللہ اپنے بندہ کے شامل حال کرتا ہے یا جب بندہ کو اس کی سعی وکوشش سے اسباب خیر میسر نہیں ہوتے تواللہ اسے خیر و سعادت کی راہ پر لگادیتا ہے یہ دوسرا حصہ ہے جو حدیث کے مطابق زیادہ مخفی ہوتا ہے۔ بلا شبہ توفیق جوایک غیبی سبب ہے اور انسان کو خیروبرکت کی راہ دکھاتا ہے۔ انسان کے پاسموجود دیگر عقلی اور فطری امکانات اور قوتوں سے جدا ایک چیز ہے اگر چہ یہ قوتیں اور صلاحتیں بھی عطائے پروردگار ہیں لیکن تنہا یہ صلاحتیں انسان کو خیروسعادت کی منزل تک پہونچانے کے لائق نہیں ہیں یعنی صرف انھیں کے سہارے انسان شر سے محفوظ نہیں رہ سکتا ہے بلکہ پروردگار جب کسی بندہ کے لئے خیرکا ارادہ کرتا ہے تو اسکی سعی وکوشش اور صلاحیتوں کو خیر کے صحیح راستوں پر بروئے کار لانے میں اسکی مدد کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل حدیث اس حقیقت کی صاف وضاحت کرتی ہے۔ روایت میں ہے کہ ایک

[1] غررالحکم ج۲ ص۳۴۵۔
[2] غررالحکم ج۲ص۳۵۱۔
[3] غررالحکم ج۱ص۸۲۔

شخص نے امام جعفر صادقؑ سے سوال کیا: (یا بن رسول اللہ! ألست أنا مستطیعاً لما کُلِّفتُ؟فقال لہ(ع): (ما الاستطاعۃ عندکَ؟) قال:القوۃعلیٰ العمل،قال لہ(ع): (قد أعطیتا لقوۃ،ان أعطیت(المعونۃ)،قال لہ الرجل:فما المعونۃ؟

قال(ع): (التوفیق)،قال(الرجل):فلم اِعطاء التوفیق؟ قال(الامام)(ع): ھل تستطیع بتلک القوۃدفع الضرر عن نفسک،وأخذ النفع الیھابغیر العون من اللہ تبارک وتعالیٰ؟)قال:لا،قال(ع): (فَلِمَ تتحل مالا تقدرعلیہ؟)ثم قال: (أین أنت من قول العبد الصالح: (وما توفیقی الا باللہ[1])''فرزند رسول اللہ !جب مجھے مکلف بنایاگیا ہے تو کیا میں مستطیع نہیں ہوں؟امامؑ نے فرمایا:استطاعت سے تمہاری مراد کیاہے؟

اس نے جواب دیا کہ عمل بجالانے کی قوت وطاقت''امام نے فرمایا:یہ درست ہے کہ تمہیں قوت دی گئی ہے مگر کیا تمہیں ''معونہ''بھی نصیب ہوا ہے؟اس شخص نے سوال کیا:یہ معونہ کیاہے؟امامؑ نے فرمایا:توفیق! اس شخص نے(تعجب سے)پوچھا:توفیق عطا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟امامؑ نے فرمایا کہ:کیا تم اللہ کی مدد کے بغیر صرف اپنی قوت کے ذریعہ اپنے کو نقصانات سے محفوظ رکھ سکتے ہو اور فائدے حاصل کر سکتے ہو؟اس نے جواب دیا ہرگز نہیں:پھر امامؑ نے دریافت فرمایا:پھر تم عبدصالح کے اس جملہ کا کیا مطلب سمجھتے ہوکہ''میری توفیق صرف اللہ سے وابستہ ہے''اس روایت کے مطابق انسانی زندگی میں تین طرح کی قوتیں اور عوامل کار فرما ہیں:۱۔وہ طبیعی اور سماجی قوانین جو انسان کو خیریا شرکی جانب لے جاتے ہیں۔

۲۔وہ قوتیں اور صلاحتیں جو پروردگار عالم نے انسانی وجود میں رکھی ہیں اور جنہیں انسان طبیعت یا سماج میں خیروشر تک رسائی حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔

---

[1] بحار الانوارج۵ ص۴۲۔''وماتوفیقی الاباللہعلیہ توکّلت والیہ أُنیب''''میری توفیق صرف اللہ سے وابستہ ہے اسی پر میرا اعتماد ہے اور اسکی طرف میں توجہ کر رہاہوں''سورۂ ہو دآیت۸۸۔

۳۔ توفیق و امداد الٰہی جس کے ذریعہ پروردگار اپنے بندوں کو اسباب خیر تک پہونچاتا ہے اور ان مخفی اسباب کے لئے بندوں کی مدد کرتا ہے جو عام لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھے یا جن تک رسائی ممکن نہ تھی اس آخری سبب کے بغیر خیر تک پہونچنا ممکن نہیں ہے۔ کراجکی نے اپنی کتاب ''کنز''میں روایت کی ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: (ماکلّ من نویٰ شیئاً قدر علیہ،وما کل من قدر علیٰ شئ وُفّق لہ[1]۔) ''ایسا نہیں ہے کہ ہر انسان ہر اس چیز پر قدرت بھی رکھتا ہو جس کی اس نے نیت کی ہے اور نہ ہی ایسا ہے کہ جو مقدور ہو اسکی توفیق بھی حاصل ہواور نہ ہی ایسا ہے کہ جسکی توفیق حاصل ہو وہ شئے خود حاصل بھی ہوجائے۔ جب نیت، قدرت اورتوفیق کے ساتھ وہ چیز بھی حاصل ہوجائے تو سعادت مکمل کہلاتی ہے''

توفیق،معرفت پروردگار کا بہت وسیع باب ہے اگرچہ اللہ کی معرفت کے تین راستے ہیں:۱۔ فطرت

۲۔ عقل (عقلی دلیلوں کے ذریعہ)

۳۔تعامل مع اللہ (اللہ کے ساتھ تجارت اور معاملہ)

''تعامل مع اللہ'' معرفت کاایک وسیع دروازہ ہے لیکن اس دروازہ میں صرف صاحبان بصیرت داخل ہوسکتے ہیں اورا سکے ذریعہ انسان کو ایمان، اعتبار واطمینان اور توکل کاوہ درجہ حاصل ہوتا ہے جو فطرت اور عقل کے ذریعہ حاصل کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ خداوند عالم کے ساتھ معاملہ اور اس کی عطا کے ساتھ لین دین اور اللہ تعالیٰ کے قرب اور اس کی معیت کی وجہ سے ہی تائید خداوندی اوراس کی توفیق ہر حال میں انسان کے شامل حال ہوتی ہے۔

توفیق الٰہی یونہی کسی انسان کے شامل حال نہیں ہوجاتی بلکہ توفیق نازل ہونے کے اپنے اسباب و قوانین اور اصول ہیں۔ جسے پروردگار نے توفیق جیسی نعمت عطا کی ہے یقیناًوہ اس لائق تھا کہ ایسی رحمت الٰہی اس کو نصیب ہو اور جو توفیق سے محروم ہے

[1] بحارالانوار ج۵ص۲۰۹۔۲۱۰۔

یقیناً اس نے اس عظیم نعمت کے نزول و حصول کے مواقع ضرور گنوائے ہیں ورنہ رحمت الٰہی میں بخل و کنجوسی کا دخل نہیں ہے اور نہ ہی اسکا خزانۂ رحمت ختم ہونے والا ہے ۔یہ عظیم نعمت اسی کے حصہ میں آتی ہے جس کے شامل حال خدا کی توفیق ہوتی ہے اور اس نعمت سے محروم صرف وہی ہوتا ہے کہ جسے توفیق نصیب نہ ہو۔ توفیق جیسی نعمت پانے والے افراد بھی برابر نہیں ہوتے بلکہ استحقاق، صلاحیت ،لیاقت اور ظرف کے اعتبار سے ان کی توفیق کے مراتب ودرجات بھی الگ الگ ہوتے ہیں ۔ اسکی بارگاہ سے رحمت،توفیق کی شکل میں بے حساب نازل ہوتی رہتی ہے البتہ اس سے صرف وہی لوگ محروم رہتے ہیں جن کا نفس بد اعمالیوں کے باعث گھاٹے میں ہے اور جنھوں نے اپنے آپ کو اور اپنے باطن اور ظرف کو اسکے حصول کے قابل نہیں بنا یا ہے جبکہ ان کے برخلاف صاحبان ایمان اپنی استعداد اور ظرف کے مطابق اس نعمت سے بہرہ مند ہوتے رہتے ہیں[۱]۔رزق اگر چہ عالم ظاہر و شہود کا معاملہ ہے لیکن آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مسئلہ رزق سے غیبی اسباب کا کتنا گہرا تعلق ہے ۔

عالم غیب اور عالم شہود (ظاہر) کے درمیان رابطہ

مسئلہ ''غیب''اور ''غیب وشہود کا تعلق'' جیسے مسائل اسلامی نظریات کے بنیادی مسائل میں شمار ہوتے ہیں اور اس سلسلہ میں لوگوں کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے۔کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو سرے سے غیب کے منکر ہیں کچھ شہود کے مقابل غیب کا اقرار تو کرتے ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان رابطہ کے منکر ہیں۔اسلام ''غیب''کو صرف تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ ''غیب''پر ایمان کی دعوت دیتا ہے اور ''ایمان بالغیب''کو اسلام کی سب سے پہلی شرط قرار دیتا ہے۔ (آلم *ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدیً للمتقین*الذین یؤمنون بالغیب ویقیمون الصلاۃ و مما رزقناھم ینفقون [۲]) ''یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے یہ صاحبان تقویٰ اور پرہیزگار لوگوں کیلئے مجسم ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں پابندی سے پورے اہتمام کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے رزق دیا ہے اس میں سے ہماری راہ میں خرچ بھی کرتے ہیں ''

---

[۱] مؤلف کی کتاب ''المذہب التاریخی فی القرآن الکریم ، سے اقتباس ،معمولی تبدیلی کے ساتھ صفحہ ۴۰۔۴۹۔
[۲] سورۂ بقرہ آیت ۱۔۳۔

(الذین یخشون ربھم بالغیب وھم من الساعة مشفقون[۱]) ''جو از غیب اپنے پروردگار سے ڈرنے والے ہیں اور قیامت کے خوف سے لرزاں ہیں ''(انما تنذر من اتبع الذکر وخشی الرحمٰن بالغیب[۲]) ''آپ صرف ان لوگوں کو ڈرا سکتے ہیں جو نصیحت کا اتباع کریں اور بغیر دیکھے از غیب خدا سے ڈرتے رہیں'' اسلام عالم غیب اور عالم شہود کے درمیان ربط کا بھی قائل ہے اس کا یہ نظریہ ہے کہ ان دونوں وسیع افقوں کو جوڑنے والے بہت سے پل بھی پائے جاتے ہیں ان تمام باتوں سے بڑھکر اسلام کا عقیدہ ہے کہ دونوں عالم ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں یعنی عالم غیب ،عالم ظاہر و محسوس پر اثر انداز ہوتا ہے اور عالم محسوس و ظاہر غیب پر ،اگر انسان متقی وپرہیزگار ہے۔ایمان بالغیب کے باعث دل میں خشیت الٰہی پائی جاتی ہے اور وہ گناہوں سے کنارہ کش رہتا ہے تو یہ چیزیں براہ راست انسان کی مادی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔معاش حیات کی سختیاں آسانیوں میں تبدیل ہوجاتی ہیں اور رزق کے دروازے اسکے لئے کھل جاتے ہیں۔

ارشاد پروردگار ہے:(ومن یتّق اللّٰہ یجعل لہ مخرجاً *ویرزقہ من حیث لا یحتسب[۳]) ''اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسکے لئے نجات کی راہ پیدا کردیتا ہے ،اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جسکا وہ گمان بھی نہیں کرتا ہے'' (ومن یتّق اللّٰہ یجعل لہ من أمرہ یسرا[۴]) اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسکے امرمیں آسانی پیدا کردیتا ہے'' یہ تو تھا عالم ظاہر و محسوس کا عالم غیب سے تعلق۔اسکے برخلاف عالم غیب کا بھی عالم ظاہر سے تعلق پایا جاتا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے مروی ہے:(لولا الخبز ما صلّینا[۵]) ''اگر روٹی کا مسئلہ نہ ہوتا تو ہم نماز نہ پڑھتے'' آپ ہی سے منقول ہے:(وبھا الخبز) صمتم[۶]) ''تم لوگوکے روزے اسیروٹی کیلئے ہیں ''آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:(فلولا الخبز ما صلّینا ولا صمنا ،ولا

---

[۱] سورۂ انبیاء آیت۴۹ ۔
[۲] سور ۂ یٰس آیت۱۱۔
[۳] سورۂ طلاق آیت ۲۔۳۔
[۴] سورۂ طلاق آیت۴۔
[۵] اصول کافی ج۵ص۷۳۔
[۶] اصول کافی ج۶ ص۳۰۳۔

أدّینا فرائض ربنا عزّوجلّ[1]) ''اگر روٹی (کی بات) نہ ہوتی تو نہ ہم نماز پڑھتے اور نہ روزہ رکھتے اور نہ ہی اپنے پروردگار کے احکام بجالاتے''

حرکت تاریخ کے سلسلہ میں غیبی عامل کا کردار

عالم غیب اور عالم محسوس میں اسی رابطہ کی بنا پر قرآن کریم ''غیب''کو حرکت تاریخ کا اہم سبب شمار کرتا ہے اور تاریخ کے پیچھے مادی سبب کو بھی تسلیم نہیں کرتا چہ جائیکہ مادیت کو تاریخ کا تنہا محرک مانا جائے بلکہ بسا اوقات ایسا بھی دکھائی دیتا ہے کہ تاریخ مادی عوامل کے تقاضوں کے برخلاف حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ذرا قرآن کریم کی ان آیات میں غور وخوض کیجئے:

(لقد نصرکم اللّٰہ فی مواطن کثیرة ویوم حنینٍ اذ أعجبتکم کثرتکم فلم تغنِ عنکم شیئاً وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولّیتم مدبرین*ثم أنزل اللّٰہ سکینتہ علیٰ المؤمنین وأنزل جنوداً لم تروھا وعذّب الذین کفروا وذٰلک جزاء الکافرین[2]) ''بیشک اللہ نے اکثر مقامات پر تمہاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا لیکن اس (کثرت) نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچایا اور تمہارے لئے زمین اپنی وسعتوں سمیت تنگ ہوگئی اور اسکے بعد تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے ،پھر اسکے بعد اللہ نے اپنے رسول اور صاحبان ایمان پر سکون نازل کیا اور وہ لشکر بھیجے جنہیں تم نے نہیں دیکھااور کفر اختیار کرنے والوں پر عذاب نازل کیاکہ یہی کافرین کی جزا اور ان کا انجام ہے''ان آیات کریمہ سے پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ فتح وکامرانی عطا کرنے والا خدا ہے۔

مادی اسباب و وسائل صرف ذریعہ ہیں کامیابی دینے والا اصل میں خدا ہے۔ تاریخ کی حرکت کو سمجھنے کے لئے بنیادی نقطہ یہی ہے اور یہیں سے اسلامی نظریہ،مادیت کے نظریہ سے جدا ہوجاتا ہے۔آیات کریمہ میں دوسرا اہم تذکرہ لشکر اسلام کی کثرت کے باوجود حنین کی جنگ کا نقشہ منقلب ہونا ہے حالانکہ مادی نگاہ رکھنے والوں کے نزدیک افراد کی کثرت فتح کا سبب ہوتی ہے۔ ''اور حنین کے دن بھی جب تمہیں اپنی کثرت پر ناز تھا لیکن اس نے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہونچایااور تمہارے لئے زمین اپنی وسعتوں سمیت

---

[1] اصول کافی ج۵ص۷۳۔
[2] سورۂ توبہ آیت۲۵۔۲۶۔

تنگ ہوگئی اور اسکے بعد تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔آیات کریمہ میں تیسرا تذکرہ اللہ کی جانب سے اپنے رسول اور مومنین پر عین میدان جنگ میں سکینہ نازل ہونا ہے۔اسی سکینہ کے باعث شدت کے لمحات میں انہیں اطمینان و سکون حاصل ہوا اور وہ میدان جنگ میں ثابت قدم رہ سکے اور ان کے دلوں سے خوف واضطراب زائل ہوا یہ سکینہ فقط خدا کی جانب سے تھا اللہ نے فرشتوں کا نہ دکھائی دینے والا لشکر نازل کیا جو لشکر کفار کو ہزیمت پر مجبور کر رہا تھا ان کی صفوں میں رعب پھیلا رہا تھا اسکے بر خلاف دشمن سے مقابلہ کے لئے مومنین کے دلوں کو تقویت عطا کر رہا تھا۔

اب ہم سورۂ آل عمران کی ان آیات کو پڑھیں:(بلیٰ ان تصبروا وتتقوا ویأتوکم من فورھم ھذا یُمددکم ربکم بخمسۃ آلاف من الملائکۃ مسوّمین* وما جعلہ اللہ الابشریٰ لکم ولتطمئن قلوبکم بہ وما النصرالا من عنداللہ العزیزالحکیم[۱]) ''یقیناًاگر تم صبر کروگے اور تقویٰ اختیار کروگے اور دشمن فی الفور تم تک آجائیں تو خدا پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریگا جن پر بہادری کے نشان لگے ہوں گے۔اور اس امداد کو خدانے صرف تمہارے لئے بشارت اور اطمینان قلب کا سامان قرار دیا ہے ورنہ مدد تو صرف خدائے عزیز و حکیم کی طرف سے ہوتی ہے'' جنگ کی شدت اور سختیوں کے دوران پانچ ہزار ملائکہ کے ذریعہ غیبی امداد نے فیصلہ مسلمانوں کے حق میں کرادیا۔اللہ نے ملائکہ کے ذریعہ مومنین کے دلوں کو سکون واطمینان عطا کیا اور اس طرح سخت ترین لمحات میں انہیں اسطرح بشارت وخوش خبری سے نوازا۔اسی آیہ شریفہ میں اس بنیادی نقطہ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو نقطہ تاریخ کی حرکت کے بارے میں اسلام اور مادیت کے درمیان حدفاصل ہے (وماالنصرالا من عنداللہ العزیزالحکیم)فتح وکامرانی صرف اور صرف اللہ کی جانب سے ہے جنگ احد میں جیتی ہوئی جنگ کا نقشہ پلٹ جانے کے بعد مومنین کو سکھائے گئے اسباق سورۂ آل عمران میں موجود ہیں: (ولا تھنواولا تحزنو اوأنتم الاعلون ان کنتم مؤمنین[۲]) ''خبردار سستی نہ کرنا مصائب پر محزون نہ ہونا،اگر تم صاحب ایمان ہوتو سربلندی تمہارے ہی لئے ہے'' میدان جنگ میں یہ برتری خدا پر ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ایمان کے بعد پھر کہیں ان مادی

---

[۱] سورۂ آل عمران آیت۱۲۵۔۱۲۶۔
[۲] سورۂ آل عمران آیت۱۳۹۔

اسباب و عوامل کی باری آتی ہے جنکی ضرورت میدان جنگ میں پڑتی ہے۔ سورۂ اعراف میں بھی یہی مضمون نظر آتا ہے: (ولوأن أھل القریٰ آمنوا و اتّقوا لفتحنا علیھم برکاتٍ من السماء والارض ولکن کذّبوا فأخذناھم بما کانوا یکسبون[1]) ''اور اگر اہل قریہ ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو ہم ان کے لئے زمین وآسمان سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے لیکن انھوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کو ان کے اعمال کی گرفت میں لے لیا۔ '''' پروردگار عالم اپنے بندوں پر زمین و آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتا ہے'' یہ چیز ایمان وتقوے سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اسکے ساتھ ضمنی طورپر مادی و سائل بھی درکار ہوتے ہیں۔

یہ تصویر کا ایک رخ تھا جو کہ مثبت رخ تھا کہ کس طرح میدان جنگ میں ایمان اور تقوی سے فتح و کامرانی ملتی ہے معاشی زندگی میں وسعت رزق ،آسانیاں اور خوشیاں میسر ہوتی ہیں۔ اسکے برخلاف عالم غیب اور عالم محسوس کا یہی تعلق اور رابطہ غلطیوں اورگناہوں میں مبتلاہونے اور حدود الٰہی سے تجاوز ،تہذیبوں کے خاتمہ اور امتوں کی تباہی و بربادی کا سبب بھی ہوتا ہے۔ سورۂ انعام کی ان آیات کو غور سے پڑھئے: (ألم یرواکم أھلکنامن قبلھم من قَرنٍ مکّناھم فی الارض مالم نمکّن لکم وأرسلنا السماء علیھم مدراراً وجعلنا الانھار تجری من تحتھم فأھلکناھم بذنوبھم وأنشأنا من بعدھم قرناً آخرین[2]) ''کیا انھوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلوں کو تباہ کردیا ہے جنھیں تم سے زیادہ زمین میں اقتدار دیا تھا اور ان پر موسلادھار پانی بھی برسایا تھا ان کے قدموں میں نہریں بھی جاری تھیں پھر ان کے گناہوں کی بناپر انہیں ہلاک کردیا اور ان کے بعد دوسری نسل جاری کردی '' یہ ہلاکت و بربادی بے عملی، عصیان اور گناہوں کی وجہ سے تھی مادیت کو تاریخ کا محرک سمجھنے والوں کی نگاہ میں ان اسباب کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے جبکہ قرآن بد اعمالیوں کو بھی بربادی کا سبب مانتا ہے ۔اسی سورۂ مبارکہ کی یہ آیات کریمہ بھی ملاحظہ فرمائیں جن میں قرآن مجید نے تسلسل کو مکمل طور پر پیش کردیا ہے ۔جیسا کہ ارشاد ہے: (ولقد ارسلنا إلیٰ امم منقبلک فاخذناھم بالبأسآء والضرّآء لعلھم یتضرعون فلولااذجاء ھم بأسنا تضرّعوا ولکن قست قلوبھم و زیّن لھم الشیطان ماکانوا یعملون *فلما نسوا ما ذکّروا بہٖ فتحنا علیھم أبواب کل شئ حتّٰی اذا فرحوابما أُوتوا أخذنٰھم

---

[1] سورۂ اعراف آیت۹۶۔
[2] سورۂ انعام آیت۶۔

بغتۃ فاذا ھم مبلسون فقطع دابرالقوم الذین ظلموا والحمد للہ رب العالمین[1]) ''ہم نے تم سے پہلے والی امتوں کی طرف بھی رسول بھیجے ہیں اسکے بعد انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ شاید ہم سے گڑگڑائیں۔پھر ان سختیوں کے بعد انہوں نے کیوں فریاد نہیں کی؟بات یہ ہے کہ ان کے دل سخت ہوگئے ہیں اور شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے لئے آراستہ کردیا ہے ۔پھر جب وہ ان نصیحتوں کو بھول گئے جو انہیں یاد دلائی گئی تھیں تو ہم نے امتحان کے طورپر ان کے لئے ہر چیز کے دروازے کھول دئے یہاں تک کہ جب وہ ان نعمتوں سے خوشحال ہوگئے تو ہم نے اچانک انہیں اپنی گرفت میں لے لیا ،اور وہ مایوس ہوکر رہ گئے،پھر ظالمین کا سلسلہ منقطع کردیاگیا اور ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے''تمام امتوں کے آغاز سے لیکر ان کے انجام تک تین مرحلے ہیں جن کی طرف ان آیات کریمہ میں اشارہ پایا جاتا ہے اسی طرح ان تینوں مرحلوں میں عالم غیب اور عالم محسوس کے درمیان رابطہ کی وضاحت پائی جاتی ہے۔

پہلا مرحلہ:یہ آزمائش کا مرحلہ ہے اس مرحلہ میں پروردگار امتوں کو نعمتوں اور صلاحیتوں سے نوازتا ہے۔اس مرحلہ میں گناہ و معصیت نزول بلا اور بارگاہ خداوندی میں تضرع وزاری بلاؤں سے نجات کا ذریعہ بنتی ہے۔(فأخذناھم بالبأساء والضرّاء لعلّھم یتضرعون)''اسکے بعد ہم نے انہیں سختی اور تکلیف میں مبتلاکیا کہ شاید ہم سے گڑگڑائیں''گناہ سے بلاؤوں کانازل ہونا اور تضرع وزاری سے بلاؤوں کا برطرف ہونا یہ دراصل عالم غیب اور عالم محسوس کے رابطہ کوبیان کرتا ہے اوراس نقطہ تک مادی فکر کی رسائی نہیں ہوسکتی ہے یہ بات ہمیں کتاب خدا سے معلوم ہوئی ہے۔

دوسرا مرحلہ :مہلت اور چھوٹ کا مرحلہ ہے ۔اس مرحلہ میں بھی عالم غیب و محسوس کا تعلق نمایاں ہے اس لئے کہ برائیوں اور گناہوں میں غرق ہوجانے اور آزمائش کے مرحلہ میں مصائب و مشکلات کو نظر انداز کرتے رہنے کے باوجود کبھی کبھی امت پر نعمت کا دروازہ بند نہیں ہوتا لیکن اس مرحلہ میں رزق،نعمت نہیں بلکہ عذاب ہوتا ہے اور اللہ اس طرح انہیں ان کی سرکشی میں چھوٹ

---

[1] سورۂ انعام آیت۴۲۔۴۵۔

دیگر ان کی رسی دراز کردیتا ہے تاکہ پھراچانک ایک دم پوری سختی وقوت کے ساتھ انہیں جکڑلے:(فلما نسواماذکّروا بہ فتحنا علیھم أبواب کلّ شئ[1]) ''پھر جب وہ ان نصیحتوں کو بھول گئے جو انہیں یاد دلائی گئی تھیں تو ہم نے امتحان کے طورپر ان کے لئے ہرچیز کے دروازے کھول دئے''

تیسرا مرحلہ: بربادی اور نابودی کا مرحلہ ہے:(فقطع دابرالقوم الذین ظلموا والحمد للّٰہ رب العالمین[2]) ''پھر ظالمین کا سلسلہ منقطع کردیا گیا اور ساری تعریف اس اللہ کے لئے ہے جو رب العالمین ہے'' حمد خدا یہاں عذاب پر ہے نعمت پر نہیں۔ یعنی نعمت حیات کے بجائے ''سرکش افراد کی'' نابودی اور ہلاکت پر حمد وثنائے الٰہی کی جارہی ہے ۔ عالم غیب ومحسوس کا رابطہ اس مرحلہ میں بھی گذشتہ مراحل سے جدا نہیں ہے کیونکہ جب افراد قوم اکڑتے ہیں روئے زمین پر سرکشی اور تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان چیزوں میں فرحت محسوس کرتے ہیں تو ان پر ایسا عذاب نازل ہوتا ہے کہ پوری قوم نیست ونابود ہوجاتی ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں غیبی عامل ،حرکت تاریخ کا اہم عنصر ہے۔ غیبی عامل،مادی عوامل کا منکر نہیں اگر چہ اسلام کی نگاہ میں حرکت تاریخ کا اہم عنصر غیبی عامل ہے مگراسکا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام انسانی زندگی میں مادی عوامل کو تسلیم ہی نہیں کرتا بلکہ در حقیقت حرکت تاریخ کا عامل، کسی ایک چیز کو ماننے کے بجائے اسلام متعدداور مشترکہ عوامل کا قائل ہے یعنی غیبی اور مادی عوامل ایک ساتھ مل کر تاریخ کو آگے بڑھاتے ہیں ۔اور ان میں سے صرف کوئی ایک عامل تاریخ کا محرک نہیں ہے وہ مادی عامل ہو یا معنوی۔ اسلام کی نگاہ میں زندگی بسر کرنے کے لئے ان دونوں عوامل کوبروئے کار لانا ضروری ہے۔

---

[1] سورۂ انعام آیت ۴۴۔
[2] سورۂ انعام آیت۴۵۔

تقویٰ اور رزق کا تعلق

جب عالم غیب اور عالم محسوس کا تعلق اور ربط واضح ہوگیا ''تو آیئے ایک نگاہ ،حدیث قدسی کے اس فقرہ پر ڈالتے ہیں: (لایؤثر عبد ہوای علی ہواہ الاضمنت السمٰوات والارض رزقہ) ''کوئی بندہ اگر اپنی خواہشات پر میرے احکام اور مرضی کو ترجیح دے گا تو میں زمین وآسمان کو اسکے رزق کا ضامن بنادوں گا'' عالم غیب و عالم محسوس کے درمیان تعلق کی گذشتہ توضیح کے پیش نظر غیب اور معنویت سے تعلق رکھنے والے ''تقویٰ''اور عالم غیب وعالم محسوس وشہود سے تعلق رکھنے والے ''رزق'' کے درمیان ربط کی وضاحت کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی ۔اسلامی تہذیب میں یہ نظریہ بالکل واضح وروشن ہے اس لئے کہ تقویٰ بھی رحمت الٰہی کا وسیع دروازہ ہے تقوے کے ذریعہ انسان اللہ سے رزق نازل کراسکتا ہے ۔تقوے سے ہی باران رحمت نازل ہوتی ہے اور مشکلات بر طرف ہوتی ہیں تقوے کے سہارے ہی اللہ کی جانب سے فتح وکامیابی میسر ہوتی ہے۔

اسی کے طفیل بند دروازے کھل جاتے ہیں تقوے کی ہی بدولت خداوند عالم زندگی کے مشکلات میں لوگوں کے لئے آسانیاں فراہم کرتا ہے۔جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: (ومن یتّق اللہ یجعلْ لہ مخرجاً ویرزقہ من حیث لایحتسب ومن یتوکّل علی اللہ فھوحسبہ ان اللہ بالغ أمرہ قد جعل اللہ لکلّ شی ء قدرا) ''اور جو بھی اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لئے نجات کی راہ پیدا کردیتا ہے اور اسے ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جس کا خیال بھی نہیں ہوتا ہے اور جو خدا پر بھروسہ کریگا خدا اسکے لئے کافی ہے بیشک خدا اپنے حکم کا پہنچانے والا ہے اس نے ہر شے کے لئے ایک مقدار معین کردی ہے[1]۔ ''جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: (ومن یتّق اللہ یجعل لہ من أمرہ یُسراً[2]) ''اور جو خدا سے ڈرتا ہے خدا اسکے معاملات میں آسانی پیدا کردیتا ہے'' پیغمبر اسلام ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:(لوأن السمٰوات والارض کانتا رتقاً علیٰ عبد ثم اتقیٰ اللہ لجعل اللہ لہ منھما فرجاً ومخرجاً[3]) ''اگر کسی بندے پر زمین وآسمان کے دروازے بالکل بند ہوجائیں پھر وہ تقوائے الٰہی اختیار کرے تو اللہ اسکو زمین وآسمان میں کشادگی اور آسانیاں عطا کردے گا'' روایت کے مطابق جب حضرت

---

[1] سورۂ طلاق آیت۲۔۳۔
[2] سورۂ طلاق آیت ۴۔
[3] بحارالانوار ج۷۰ص ۲۸۵۔

ابوذر (رح) ربذہ کے لئے جلا وطن کئے گئے تو ان سے امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا: (یاأباذر؛انک غضبت للہ فارجُ من غضبت لہ،ولوأن السمٰوات والارض کانتا علیٰ عبد رتقاً ثم اتقیٰ اللہ لجعل منھما فرجاًو مخرجاً[1]) ''اے ابوذر تمہاری ناراضگی اور غضب اللہ کے لئے تھا لہٰذا اسی کی ذات سے لولگائے رکھنا۔اگر زمین وآسمان کے راستے کسی بندہ پر بند ہوجائیں اور وہ تقوائے الٰہی اختیار کرے تو اللہ اسکے لئے زمین وآسمان میں آسانیاں فراہم کردے گا''

مولائے کائنات حضرت علیؑ کا ارشاد گرامی ہے: (من أخذ بالتقویٰ عزبت (غابت) عنہ الشدائد بعد دنوھا،واحلولت لہ الاموربعد مرارتھا،وانفرجت عنہ الامواج بعد تراکمھا،وأسھلت لہ الصعاب بعد انصابھا[2]) ''جوتقویٰ اختیار کرے گا شدائد و مصائب اس سے نزدیک ہونے کے بعد دور ہو جائیں گے تلخیوں کے بعد حلاوت محسوس کرے گا۔ امواج بلا اسکے گرد جمع ہونے کے بعد پراکندہ ہوجائیں گی مشکلات پڑنے کے بعد آسانیوں میں تبدیل ہوجائیں گی'' امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے: (من اعتصم باللہ بتقواہ عصمہ اللہ،ومن أقبل اللہ علیہ وعصمہ لم یبال لوسقطت السماء علیٰ الارض،وان نزلت نازلۃ علیٰ أھل الارض فتشملھم بلیۃ،کان فی حرزاللہ بالتقویٰ من کل بلیۃ،ألیس اللہ تعالیٰ یقول:ان المتقین فی مقام أمین) ''جو تقوائے الٰہی کی پناہ میں آئے گا اللہ اسے محفوظ رکھے گا اور جس کی طرف اللہ کی توجہ ہوجائے اور اللہ اسے محفوظ رکھے توچاہے آسمان، زمین پر گرجائے اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی اگر تمام اہل زمین پرکوئی بلا نازل ہوتو وہ تقوے کے باعث امان خدا میں رہے گا۔کیا خدا کا یہ قول نہیں ہے: (ان المتقین فی مقام أمین[3]) ''بیشک متقین امن کے مقام پر ہیں'' امام جعفرصادقؑ سے مروی ہے کہ: (ان اللہ قد ضمن لمن اتقاہ أن یحولہ عمایکرہ الیٰ مایحب ویرزقہ من حیث لایحتسب[4]) ''اللہ نے متقی کی ضمانت لی ہے کہ اسکے ناپسندیدہ امور کو پسندیدہ امور میں تبدیل کردے گا اور اسے ایسے راستہ سے رزق عطا کرے گا جس کا اسے گمان بھی نہ ہوگا'' امام محمد تقیؑ نے سعد الخیرکو تحریر فرمایا: (ان اللہ عزوجل یقی بالتقویٰ عن

---

[1] نہج البلاغہ خطبہ۱۳۰۔
[2] نہج البلاغہ خطبہ ۱۹۸۔
[3] بحارالانوار ج۷۰ ص۲۸۵۔
[4] گذشتہ حوالہ۔

العبد ما غرب عنه عقله،ویجلّی بالتقویٰ عماہ و جھلہ،وبالتقویٰ نُجّی نوح ومن معہ فی السفینۃ،وصالح ومن معہ من الصاعقۃ،وبالتقویٰ فازالصابرون ونجت تلک العصب من المھالک[1]) ''پروردگار عالم، تقویٰ کے ذریعہ اپنے بندہ سے ان چیزوں کو محفوظ رکھتا ہے جو اسکی عقل سے مخفی تھیں اور تقویٰ کے ذریعہ اسے مکمل بینائی عطا کردیتا ہے اور ان چیزوں کو بھی دکھادیتا ہے جو جہالت کے باعث اس سے پوشیدہ تھیں ۔ تقویٰ کے باعث ہی نوح،اور کشتی میں سوار ان کے ساتھیوں نے نجات پائی،صالح،اور ان کے ساتھی آسمانی بجلی سے محفوظ رہے ۔

تقویٰ کی بناء پر ہی صبر کرنے والے بلند درجات پر فائز ہوئے اور ہلاکت خیز مشکلات سے نجات حاصل کرسکے''

خلاصۂ کلام یہ کہ جو لوگ اللہ کی مرضی اور احکام کو اپنی خواہشات پر ترجیح دیتے ہیں اور حکم خدا کے سامنے اپنی ضرورتوں،خواہشوں اور ترجیحات کو اہمیت نہیں دیتے ہیں تو خداوند عالم زمین وآسمان کو ان کے رزق کا ضامن بنادیتا ہے ۔ان کے امور کا خود ذمہ دار ہوجاتا ہے اور انھیں ان کے نفسوں کے حوالہ نہیں کرتا اور انکی سعی وکوشش میں توفیق و برکت عطا کرتا ہے ۔یہاں پھر سے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تقوی کے بعدرزق حاصل کرنے کے لئے سعی وجستجو کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ حصول رزق کے لئے صرف تقویٰ کوکافی سمجھ لینا اسلامی نظریہ نہیں ہے البتہ اتنا ضرور ہے کہ تقویٰ کے ذریعہ بندہ پر رزق نازل ہوتا ہے اوراس طرح آسانی کے ساتھ مخصر زحمت سے ہی رزق حاصل ہوجاتا ہے ۔

تقویٰ کی بنا پر نجات پانے والے تین لوگوں کا واقعہ

نافع نے ابن عمر سے نقل کیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :تین آدمی چلے جارہے تھے کہ بارش ہونے لگی تو وہ لوگ پہاڑ کے دامن میں ایک غار میں چلے گئے اتنے میں پہاڑ کی بلندی سے ایک بڑا سا پتھر گرااور اسکی وجہ سے غار کا دروازہ بند ہوگیا ۔ تو ان لوگوں نے آپس میں کہا :اپنے اپنے اعمال صالحہ پر نظر دوڑاؤ اور انھیں کے واسطہ سے خدا سے دعاکرو شائد خدا کوئی آسانی پیدا کردے ۔ ان میں

---

[1] فروع کافی ج۸ص۵۲۔

سے ایک نے کہا کہ میرے والدین بہت بوڑھے تھے اور میرے بچے بھی بہت چھوٹے چھوٹے تھے۔ میں بکریاں چرا کر ان کا پیٹ پالتا تھا واپس آکر بکریوں کا دودھ نکالتا تو پہلے والدین کے سامنے پیش کرتا اس کے بعد اپنے بچوں کو دیتا۔ اتفاقاً میں ایک دن صبح سویرے گھر سے نکل گیا اور شام تک واپس نہ آیا۔ جب میں واپس پلٹا تومیرے والدین سو چکے تھے میں نے روزانہ کی طرح دودھ نکالا اور دودھ لے کر والدین کے سرہانے کھڑا ہوگیا مجھے یہ گوارہ نہ ہوا کہ انھیں بیدار کروں اور نہ ہی یہ گوارہ ہوا کہ والدین سے پہلے بچی کو دودھ پیش کروں حالانکہ بچی بھوک کی وجہ سے رو رہی تھی اور میرے قدموں میں بلبلا رہی تھی مگر میری روش میں تبدیلی نہ آئی یہاں تک کہ صبح ہوگئی پروردگار ا!اگر تو یہ جانتا ہے کہ یہ عمل میں نے صرف تیری رضا کے لئے انجام دیا ہے تو اسی عمل کے واسطہ سے اتنی گنجائش پیدا کردے کہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں اللہ نے اتنی گنجائش پیدا کردی اور ان لوگوں کو آسمان دکھائی دینے لگا۔

دوسرے نے کہا: میرے چچا کی ایک لڑکی تھی میں اس سے ایسی شدید محبت کرتا تھا جیسے کہ مرد عورتوں سے کرتے ہیں میں نے اس سے مطلب برآری کی خواہش کی اس نے سودینار کی شرط رکھی میں نے کوشش کرکے کسی طرح سودینار جمع کئے انھیں ساتھ لے کر اسکے پاس پہونچ گیا۔ اور جب شیطانی مطلب پورا کرنے کی غرض سے اس کے نزدیک ہوا تو اس نے کہا ''اے بندۂ خدا اللہ سے ڈرو اور ناحق میرا لباس مت اتارو''یہ بات سن کر میں نے اسے چھوڑدیا۔ پروردگار اگر میرا یہ عمل تیرے لئے ہے تو تھوڑی گنجائش اور مرحمت کردے۔ اللہ نے تھوڑی سی گنجائش اور عطا کردی۔ تیسرے آدمی نے کہا میں نے ایک شخص کو تھوڑے چا ول کی اجرت پر اجیر کیا جب کام مکمل ہوگیا تو اس نے اجرت کا مطالبہ کیا میں نے اجرت پیش کردی لیکن وہ چھوڑ کر چلا گیا میں اسی سے کاشت کرتا رہا یہاں تک کہ اسکی قیمت سے بیل اور اسکا چرواہا خرید لیا۔ ایک دن وہ مزدور آیا اور مجھ سے کہا: خدا سے ڈرو اور میرا حق مجھے دے دو۔ میں نے کہا جاؤوہ بیل اور چرواہا لے لو اس نے پھر کہا خدا سے ڈرو اور میرا مذاق مت اڑاؤ۔ میں نے

کہا میں ہرگز مذاق نہیں کررہا ہوں یہ بیل اور چرواہا لے لو۔چنانچہ وہ لے کر چلاگیا۔پروردگار میرا یہ عمل اگر تیرے لئے تھاتوہمارے لئے بقیہ راستہ کھول دے ۔ اللہ نے راستہ کھول دیا[1]۔

٣۔کففت علیہ ضیعتہ:اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں کیونکہ ''کف'' جمع کرنے اوراکٹھاکرنے کے معنی میں بھی ہے اور یہی لفظ منع کرنے اورروکنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے لہٰذا پہلے معنی کے لحاظ سے اس جملہ ''و کففت علیہ ضیعتہ'' کے معنی یہ ہوں گے ''میں اس کے درہم برہم امور کو جمع کردوں گا اس کے سامان واسباب کانگہبان،اسکے امور کا ذمہ دار اور اسکی معیشت کا ضامن ہوں''ابن اثیر اپنی کتاب ''النہایۃ''میں ''کف''کے معنی کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ احتمال ہے کہ یہ لفظ ''جمع کرنے ''کے معنی میں ہو جیسے کہ حدیث میں آیا ہے:(المؤمن أخ المؤمن یکفّ علیہ ضیعتہ[2])''ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے جو اسکے سرمایہ کو اسکے لئے اکٹھاکرکے رکھتا ہے'' اسکے دوسرے معنی منع کرنا،روکنا اور دفع کرنا ہیں جیسے:(کفّہ عنہ فکفّ،أی دفعہ وصرفہ ومنعہ،فاندفع وانصرف،وامتنع)اس نے اسکو روکا یعنی اسکا دفاع کیا منع کیا اور واپس پلٹایا تو وہ دفع ہوگیا پلٹ گیا اور رک گیا اس معنی کے لحاظ سے مذکورہ حدیث کے معنی یہ ہونگے'': میں نے اسکی بربادی کو دفع کردیا اور اسکی بربادی اور اسکے درمیان حائل ہوگیا اور اسے ہدایت دیدی اور راستے کے تمام نشانات واضح و روشن کردئے[3]''علامہ مجلسی(رح)نے اس فقرہ کی تفسیر میں اپنی کتاب بحار الانوار میں تحریر کیا ہے :کہ اس جملہ میں چند احتمالات پائے جاتے ہیں :١۔وہ معنی جو ابن ثیر نے نہایہ میں ذکر کئے ہیں یعنی اسکے درہم برہم معاملات معیشت کو سمیٹ دونگااور اسمیں ''علیٰ'' کے ذریعہ جو تعدیہ ہے اسکی بنا پر،برکت اور شفقت وغیرہ کے معنی میں ہے یا ''علیٰ ''الیٰ کے معنی میں ہے جسکی طرف نہایہ میں اشارہ موجود ہے البتہ اس صورت میں برکت وغیرہ کے معنی مراد نہ ہونگے ''

---

[1] صحیح بخاری،کتاب الادب،باب اجابۃدعاء من برّوالدیہ ج٥ ص٤٠ط؛مصر١٢٨٦ ہ ق۔فتح الباری للعسقلانی ج١٠ص٣٣٨شرح القسطلانی ج٩ص٥۔صحیح مسلم کتاب الرقاق باب قصۃاصحاب الغار الثلاثۃوالتوسّل بصالح الاعمال ج٨ص٨٩ط؛دارالفکر۔ وشرح النووی ج١٠ص٣٢١وذم الہوی لابن الجوزی ص٢٤٦
[2] النہایۃ لا بن ا لاثیرج٤ص٩٠۔
[3] اقرب المواردج٢ص١٠٩٣۔

٢۔ ''کف''،منع کرنے اور ''علیٰ''، ''فی'' کے معنی میں ہو اور '' ضیعہ''ضائع اور برباد ہونے کے معنی ہو یعنی اس نے اسکی جان،مال، محنت او ر اسکی تمام متعلقہ چیزوں کو ضائع ہونے سے بچالیا اسکی تائید اس فقرہ ''وکففت عنہ ضیعتہ''سے بھی ہوتی ہے جو شیخ صدوق (رح)کی روایت کے ذیل میں آئندہ ذکر ہوگا ۔ہمیں یہ دوسرے معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں جو حدیث کے سیاق کے مطابق اور اس سے مشابہ بھی ہیں خاص طور سے جب ہمیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ شیخ صدوق (رح) نے بعینہ اسی روایت میں ''وکففت عنہ ضیعتہ''،نقل کیا ہے جس میں علیٰ کی جگہ عن سے تعدیہ آیا ہے اور جیسا کہ ہم نے ذکر کیا ہے کہ کف دفع یا منع کرنے اور پلٹانے کے معنی میں ہے جو کہ رفع کے معنی سے مختلف ہیں کیونکہ دفع کے معنی،کسی چیز کے وجود میں آنے سے پہلے اسے روک دینا ہیں اور رفع کے معنی کسی چیز کے وجود میں آجانے کے بعد اسے زائل کردینا یا ختم کردینا ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ سمجھ لیں کہ رفع علاج کی طرح ہوتا ہے اور دفع بیماری آنے سے پہلے اسے روک دینے کی طرح ہے ۔

اور کف ،دفع کے معنی میں ہے نہ کہ رفع کے معنی میں جسکے مطابق اسکے معنی یہ ہونگے خداوند عالم نے اسکو ضائع نہیں ہونے دیا یاوہ اسکی بربادی کے لئے راضی نہ ہوا اور یہ بھی ایک قسم کی ہدایت ہے کیونکہ ہدایت کی دو قسمیں ہیں: ا۔گمراہی کے بعد ہدایت

٢۔گمراہی سے پہلے ہدایت

ان دونوں کو ہی ہدایت کہا جاتا ہے لیکن پہلی والی ہدایت اس وقت ہوتی ہے جب انسان گمراہی اور تباہی میں مبتلا ہوچکا ہو لیکن دوسری قسم کی ہدایت اسکی گمراہی اور بربادی سے پہلے ہی پوری ہوجاتی ہے اور یہ قسم پہلی قسم سے زیادہ بہتر ہے ۔حدیث میں (کف ضیعتہ)بربادی سے حفاظت کا تذکرہ ہے نہ کہ ہدایت کا اور بربادی سے حفاظت ،ہدایت کا نتیجہ ہے اس لئے یہ منزل مقصود تک پہونچانے کے معنی میں ہے نہ کہ راستہ دکھانے اور یاد دہانی کے معنی میں ۔

ہدایت کے معنی

لفظ ہدایت دو معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ہدایت کے ایک معنی منزل مقصود تک پہونچانا ہیں اور دوسرے معنی راستہ بتا نا ،راہنمائی کرنا ہیں جیسا کہ خداوند عالم کے اس قول: (انک لاتھدی من أحببت ولکن اللہ یھدی من یشاء[۱]) ''پیغمبر بیشک آپ جسے چا ہیں ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیدیتا ہے'' میں یہ لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے ۔طے شدہ بات ہے کہ یہاں جس ہدایت کی نفی کی جارہی ہے وہ منزل مقصود تک پہنچانے کے معنی میں ہے کہ یہ چیز صرف پروردگار عالم سے مخصوص ہے ورنہ راستہ دکھانا رہنمائی کرنا تو پیغمبر اسلام کا فریضہ اورآپ کی اہم ترین ذمہ داری ہے اس معنی میں پیغمبر اکرم ﷺ کے لئے ہدایت کا انکار کرکے اسے صرف پروردگا ر سے مخصوص کردینا ممکن نہیں ہے کیونکہ خداوند عالم پیغمبر کے بارے میں فرماتا ہے: (وانک لتھدی الی صراطِ مستقیم[۲]) ''اور بیشک آپ لوگوں کو سیدھے راستہ کی ہدایت کررہے ہیں'' اسی معنی میں قرآن کریم میں مومن آل فرعون کا یہ جملہ ہے: (یا قوم اتّبعون أھدکم سبیل الرشاد[۳]) ''اے قوم والو :میرا اتباع کرو،میں تمھیں ہدایت کا راستہ دکھا دوں گا'' یہاں پر بھی ہدایت ،راہنمائی اور راستہ دکھانے کے معنی میں ہے نہ کہ منزل مقصود تک پہنچانے کے معنی میں اس حدیث شریف میں بھی ہدایت کے پہلے معنی (منزل تک پہنچانا) ہی زیادہ مناسب ہیں اس لئے کہ دوسرے معنی کا لازمہ یہ نہیں ہے کہ انسان ضائع نہ ہو بلکہ ایصا ل الی المطلوب ہی انسان کو ضائع ہونے سے بچاتا ہے اور انسان کو قطعی طور پر اللہ تک پہنچانے کا ضامن ہے سیاق وسباق سے بھی یہی معنی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں اس لئے کہ یہ گفتگو ان لوگوں پر خصوصی فضل الٰہی کی ہے کہ جو اپنے خواہشات پر اللہ کی مرضی کو مقدم کرتے ہیں لہٰذا فضل وعنایت کا خصوصی تقاضا یہ ہے کہ انھیں منزل مقصود تک پہنچا یا جائے ورنہ رہنمائی اور راستہ دکھا ناتو خدا کی عام عنایت ورحمت ہے جوصرف مومنین سے یا ان لوگوں سے مخصوص نہیں ہے کہ جواللہ کی مرضی کو مقدم کرتے ہوں بلکہ یہ عنایت تو ان لوگوں کے شامل حال بھی ہے کہ جو اپنی خواہشات کو اللہ کی مرضی پر مقدم کرتے ہیں ۔اللہ

---

[۱] سورۂ قصص آیت ۵۶۔
[۲] سورۂ شوریٰ آیت۵۲۔
[۳] سورۂ غافرآیت ۳۸۔

بندہ کو بربادی اور ضائع ہونے سے کیسے بچاتا ہے ؟در حقیقت یہ کام بصیرت کے ذریعہ ہوتا ہے ۔بصیرت کے اعلیٰ درجات پر فائز انسان قطعی طور پر ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے ۔لہٰذا جب خداوند عالم کسی بندہ کیلئے خیر کا ارادہ کرتا ہے اور اسے بربادی سے بچانا چاہتا ہے تو اسے بصیرت مرحمت کر دیتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ نجات پا جاتا ہے اور خدا تک اس کی رسائی قطعی ہوجاتی ہے یہ بصیرت اس منطقی دلیل وبرہان سے الگ ہے کہ جس کے ذریعہ بھی انسان خدا تک پہنچتا ہے اور اسلام اس کا بھی منکر نہیں ہے بلکہ اسے اپنانے اور اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہے وہ اسے ہر شخص کے دل کی گہرائیوں میں اتارنا چاہتا ہے اس لئے کہ انسانوں کی بہت بڑی تعداد عقل و منطق کے سہارے ہی خدا تک پہنچتی ہے ۔

بصیرت کا مطلب حق کا مکمل طریقہ سے واضح دکھائی دینا ہے ۔ایسی رویت منطقی استدلال کا نتیجہ بھی ہو سکتی ہے اور صفائے نفس اور پاکیزگیٔ قلب کے ذریعہ بھی حاصل ہو سکتی ہے یعنی انسان کسی ایک راستہ سے اس بلند مقام تک پہنچ سکتا ہے یا عقلی اور منطقی دلائل کے ذریعہ یا پاکیزگیٔ نفس کے راستہ ۔اسلام ان میں سے کسی ایک کو کافی قرار نہیں دیتا بلکہ اسلامی نقطۂ نظر سے انسان کے اوپر دونوں کو اختیار کرنا ضروری ہے ۔یعنی عقلی روش کو اپنانا بھی ضروری ہے اور نفس کو پاکیزہ بنانا بھی ۔اس آیۂ شریفہ میں قرآن مجید نے دونوں باتوں کی طرف ایک ساتھ اشارہ کیا ہے:(ھوالذی بعث فی الامیّین رسولاً منھم یتلوا علیھم آیاتہ ویزکّیھم و یعلّمھم الکتاب والحکمۃ وان کانوا من قبلُ لفی ضلالٍ مبینٍ[1]) ''اس خدا نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو انھیں میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے ،ان کے نفوس کو پاک کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے''تزکیہ کا مطلب صفائے قلب اور پاکیزگیٔ نفس ہے جس سے معرفت الٰہی کے بے شمار دروازے کھلتے ہیں ۔معرفت کا دوسرا باب (تعلیم)ہے ،بہر حال بصیرت چاہے عقل و منطق کا ثمرہ ہویا تزکیہ وتہذیب نفس کا یہ طے ہے کہ حیات انسانی میں بصیرت کا سرچشمہ پروردگار عالم ہی ہے اسکے علاوہ کسی اور جگہ سے بصیرت کا حصول ممکن نہیں ہے اور اس تک رسائی کا دروازہ عقل وتزکیۂ نفس ہے ۔

---

[1] سورۂ جمعہ آیت۲۔

بصیرت اور عمل

ایک بار پھر اس بات کی وضاحت کردیں کہ اسلام بصیرت کیلئے ''علم ''اور تزکیہ یا ''عقل اور صفائے قلب ''دونوں کو تسلیم کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ ان میں سے ایک ،دوسرے سے بے نیاز نہیں کرسکتا لیکن یہ بھی طے ہے کہ حصول بصیرت کیلئے تزکیہ زیادہ اہم اور موثر ہے اسی لئے قرآنِ کریم نے آیہ بعثت میں تزکیہ کو علم پر مقدم رکھا ہے: (یزکّیھم و یعلّمھم الکتاب والحکمۃ[1]) ''ان کے نفوس کو پاک کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے ''مناسب ہوگا کہ چند لمحے ٹھہر کر ہم خود (تزکیہ)کے بارے میں بھی غور کریں اور دیکھیں کہ تزکیۂ نفس کیسے ہوتا ہے ؟رہبانیت کے قائل مذاہب میں تزکیہ کا مطلب یہ ہے کہ گوشہ نشینی کی زندگی بسر کی جائے اور حیات دنیوی سے فرار اختیار کیا جائے اس طرح تزکیہ کا خواہشمند انسان جب اپنی ہویٰ وہوس اور خواہشات نفسانی اور فتنوں سے پرہیز کرے گا تو اسکا نفس پاکیزہ ہوجائے گا لیکن اسلامی طریقۂ تربیت میں صور تحال اس کے بالکل برعکس ہے ۔اسلام تزکیہ کے خواہشمند کسی بھی مسلمان کو ہرگزیہ نصیحت نہیں کرتا کہ فتنوں سے فرار کرے خواہشات اور ہویٰ وہوس کو کچل دے بلکہ اسلام فرار کے بجائے فتنوں سے مقابلہ اور خواہشات کو کچل کر ختم کرنے کے بجائے انھیں حدا عتدال میں رکھنے کی دعوت دیتاہے ۔اسلام کا طریقۂ تربیت ،عمل کو تزکیہ کی بنیاد قرار دیتا ہے نہ کہ گوشہ نشینی ،رہبانیت اور محرومی کو ۔اور یہی عمل بصیرت میں تبدیل ہوجاتا ہے جس طرح بصیرت عمل میں ظاہر ہوتی ہے لہٰذا دیکھنا یہ ہوگا کہ عمل کیا ہے ؟بصیرت کسے کہتے ہیں ؟اور ان دونوں میں کیا رابطہ ہے ؟

بصیرت اور عمل کا رابطہ

بصیرت کے بارے میں اجمالی طور پرگفتگو ہوچکی ہے ۔ ۔یہاں عمل سے مراد ہروہ سعی و کوشش ہے جس کو انسان رضائے الٰہی کی خاطر انجام دیتا ہے اس کے دورخ ہوتے ہیں ایک مثبت یعنی اوا مرخدا کی اطاعت اور دوسرا سلبی یعنی اپنے نفس کو حرام کا

[1] سورۂ جمعہ آیت۲

موں سے محفوظ رکھنا ۔ اس طرح عمل سے مراد یہ ہے کہ خوشنودی پروردگار کی خاطر کوئی کام کرے چاہے کسی کام کو بجا لایا جائے اور چاہے کسی کام سے پرہیز کیا جائے ۔بصیرت اور عمل کے درمیان دوطرفہ رابطہ ہے ۔ بصیرت عمل کا سبب ہوتی ہے اور عمل ،بصیرت کا ۔ ۔ ۔ ۔اور دونوں کے آپسی اور طرفینی رابطے سے خود بخود بصیرت اور عمل میں اضافہ ہوتا رہتا ہے عمل صالح سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اور بصیرت میں زیادتی عمل صالح میں اضافہ کا سبب بنتی ہے اس طرح انمیں سے ہر ایک دوسرے کے اضافہ کا موجب ہوتا ہے یہاں تک کہ انسان انھیں کے سہارے بصیرت و عمل کی چوٹی پر پہونچ جاتا ہے ۔

١۔ عمل صالح کا سرچشمہ بصیرت: بصیرت کا ثمرہ عمل صالح ہے ۔اگر دل وجان کی گہرائیوں میں بصیرت ہے تو وہ لامحالہ عمل صالح پر آمادہ کرے گی بصیرت کبھی عمل سے جدا نہیں ہوسکتی ہے روایات اس چیز کو صراحت سے بیان کرتی ہیں کہ انسان کے عمل میں نقص اورکوتاہی دراصل اس کی بصیرت میں نقص اورکوتاہی کی وجہ سے ہوتی ہے ۔اس سلسلہ میں چند روایات ملاحظہ فرمائیں ۔پیغمبر اکرم ﷺ نے جبرئیل امین سے نقل فرمایا ہے: (الموقن یعمل للّٰہ کأنہ یراہ،فان لم یکن یریٰ اللّٰہ فان اللّٰہ یراہ[1]) ''درجۂ یقین پر فائز انسان اللہ کیلئے اس طرح عمل انجام دیتا ہے جیسے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے اگر وہ اللہ کو نہیں دیکھ رہا ہے توکم ازکم اللہ تو اس کو دیکھ رہا ہے ''مولائے کائنات ؑسے منقول ہے: (یُستدل علیٰ الیقین بقصرالامل،واخلاص العمل،والزھد فی الدنیا[2]) ''آرزووں کی قلت، اخلاص عمل اور زہد، یقین کی دلیلیں ہیں''آپ ؑہی کا ارشاد گرامی ہے: (التقویٰ ثمرۃالدین،وأمارۃالیقین[3]) ''تقویٰ دین کا ثمرہ اور یقین کا سردار ہے''،نیز آپ سے مروی ہے:(من یستیقن،یعملُ جاھداً[4]) ''صاحب یقین بھرپور جدوجہد کے ساتھ عمل انجام دیتا'' امام جعفر صادق ؑکا ارشاد ہے : (ان العمل الدائم القلیل علیٰ الیقین،أفضل عنداللّٰہ من العمل الکثیر علیٰ غیریقین[5]) ''یقین کے ساتھ مسلسل تھوڑا عمل کرنااللہ کے نزدیک یقین کے بغیربہت زیادہ عمل سے افضل ہے'' آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے:(لاعمل

---

[1] بحارالانوار ج ٧٧ص٢١ ۔
[2] غرر الحکم ج ٢ص ٣٧٦۔
[3] غررالحکم ج١ص٨٥۔
[4] غررالحکم ج٢ص١٦٦۔
[5] اصول کافی ج٢ص٥٧۔

الابیقین،ولایقین الا بخشوع[1]) ''یقین کے بغیر عمل اور خشوع کے بغیر یقین بے فائدہ ہے'' آپ نے ارشاد فرمایا: (العامل علیٰ غیر بصیرۃکالسائر علیٰ سراب بقیعۃ لا یزیدہ سرعتا لسیر الابعدا[2]) ''بصیرت کے بغیر عمل انجام دینے والا ایسا ہے جیسے سراب کے پیچھے دوڑنے والا کہ اسکی تیزی اسے منزل سے دور ہی کرتی جاتی ہے

'' صادق آل محمدؐ کا ہی یہ بھی فرمان ہے: (انکم لا تکونون صالحین حتیٰ تعرفوا،ولا تعرفون حتیٰ تصدقوا ولا تصدقون حتیٰ تسلموا[3]) ''تم اس وقت تک صالح نہیں ہو سکتے جب تک معرفت حاصل نہ کرلو اور یقین کے بغیر معرفت اور تسلیم کے بغیر تصدیق حاصل نہ ہوگی ''یعنی تصدیق معرفت اور معرفت، عمل صالح کا ذریعہ ہے امام جعفر صادقؑ سے مروی ہے: (لایقبل عمل الا بمعرفۃ،ولامعرفۃ الا بعمل،فمن عرف دلّتہ المعرفۃ علیٰ العمل[4]) ''معرفت کے بغیر کوئی عمل قابل قبول نہیں ہے اور عمل کے بغیر معرفت بھی نہیں ہو سکتی جب معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو معرفت خود عمل پر ابھارتی ہے'' امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے: (لایقبل عمل الابمعرفۃ،ولامعرفۃ الا بعمل،ومن عرف دلّتہ معرفتہ علیٰ العمل،ومن لم یعرف فلا عمل لہ[5]) ''معرفت کے بغیر عمل قبول نہیں ہوتا اور عمل کے بغیر معرفت حاصل نہیں ہوتی جب معرفت حاصل ہوجاتی ہے تووہ خود انسان کو دعوت عمل دیتی ہے جس کے پاس معرفت نہیں ہے اس کے پاس عمل بھی نہیں ہے''

۲۔بصیرت کی بنیاد عمل صالح: ابھی آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ عمل صالح کی بنیاد بصیرت ہے اسی کے بالمقابل بصیرت کا سرچشمہ عمل صالح ہے ۔دوطرفہ متبادل رابطوں کے ایسے نمونے آپ کو اسلامی علوم میں اکثر مقامات پر نظر آئیں گے ۔قرآن کریم عمل صالح اور بصیرت کے اس متبادل اور دوطرفہ رابطہ کا شدت سے قائل ہے اور بیان کرتا ہے کہ بصیرت سے عمل اور عمل صالح سے بصیرت حاصل ہوتی ہے اور عمل صالح کے ذریعہ ہی انسان خداوندعالم کی جانب سے بصیرت کا حقدار قرار پاتا ہے ۔(والذین جاھدوا فینا

[1] تحف العقول ص۲۳۳۔
[2] وسائل الشیعہ ج ۱۸ ص ۱۲۲ح۳۶۔
[3] بحارالانوار ج ۶۹ ص۱۰۔
[4] اصول کافی ج۱ ص۴۴۔
[5] تحف العقول ص۲۱۵۔

لنھدینّھم سُبُلَنَا وان اللہ لمع المحسنین[1]) '' اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور یقینااللہ حسن عمل والوں کے ساتھ ہے'' آیت واضح طورپر بیان کر رہی ہے کہ جہاد (جوخود عمل صالح کا بہترین مصداق ہے) کے ذریعہ انسان ہدایت الٰہی کو قبول کرنے اور حاصل کرنے کے لائق ہوتا ہے ۔ (لنھدینّھم سبلنا[2]) ''ہم انہیں اپنے راستوں کی ہدایت کرینگے'' حدیث قدسی میں پیغمبر اکرم ﷺ سے مروی ہے: (لایزال عبدی یتنفّل لی حتیٰ أحبّہ ، فاذا أحببتہ کنت سمعہ الذی بہ یسمع، وبصرہ الذی یبصر بہ،ویدہ التی بھا یبطش[3]) ''میرا بندہ مجھ سے نزدیک ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن کے ذریعہ وہ سنتا ہے اسکی آنکھیں بن جاتا ہوں جنکے ذریعہ وہ دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن کے ذریعہ وہ چیزوں کو چھوتا ہے'' یہ بہت ہی مشہور ومعروف حدیث ہے تمام محدثوں ،معتبرراویوں اور مشایخ حدیث نے اس حدیث قدسی کو نقل کیا ہے نقل مختلف ہے مگر الفاظ تقریباً ملتے جلتے ہیں اور روایت صحیح ہے اوروضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ عبادت ،معرفت ویقین کا دروازہ ہے اور بندہ قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ اسے بصیرت عطا کردیتا ہے پھر وہ اللہ کے ذریعہ سنتا ہے دیکھتا ہے اور ادراک حاصل کرتا ہے ۔اور ظاہر ہے کہ جو اللہ کے ذریعہ یہ کام انجام دے گا تو اسکی سماعت بصارت اور معرفت میں خطا کا کوئی امکان نہیں ہے ۔

دوسرا رخ: عمل اور بصیرت کے درمیان دوطرفہ رابطہ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ کس طرح بصیرت سے عمل اور عمل سے بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے اسی کے ساتھ ساتھ اس رابطہ کا دوسرا رخ بھی ہے جس کے مطابق برے اعمال اورکردارکی خرابی بصیرت میں

---

[1] سورۂ عنکبوت ۶۹۔

[2] خداوند عالم ہمارے شیخ جلیل مجاہد راہ خدا شیخ عباس علی اسلامی پر رحمت نازل کرے میں ان سے اکثر یہ سنا کرتا تھا :کہ انسان کو ہر حرکت کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہو تی ہے جن کا بدل ممکن نہیں ہے ایک تو وہ اس چیز کا محتاج ہوتا ہے جو تحرک میں اس کی مدد کر ے اور حرکت کی تکان کو ہلکا کردے اور اسے ایسی طاقت و قوت عطا کرے جس سے وہ اپنی حرکت کو جاری رکھ سکے اور دوسرے اس چیز کا محتاج ہوتا ہے جو اسے صحیح راستہ کی رہنمائی کرتی رہے تا کہ وہ راستہ سے بھٹکنے نہ پائے یعنی اسے ایسی قوت وطاقت کی ضرورت ہو تی ہے جو ہدایت اور بصیرت کے مطابق اس کی حرکت کا راستہ معین کرے تاکہ وہ صراط مستقیم پر چلتا رہے اور انہیں دونوں چیزوں کا وعدہ ہم سے پروردگار عالم نے سورۂ عنکبوت کی آخری آیت میں فر مایا ہے :(والذین جاھدوافینالنھدینھم سبلناوانّ اللہ لمع المحسنین)پس جو لوگ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہیں پروردگار عالم ان کو پہلے تو پشت پناہی اور قوت و طاقت عطا کرتا ہے اور یہی خدا کی معیت ہے '' انّ اللہ لمع المحسنین) اور دوسرے ان کوبصیرت و ہدایت عطا کرتا ہے جیسا کہ ارشاد ہے (لنھدینھم سبلنا)۔

[3] اصول کافی ج۲ص۳۵۲۔

کمی،اندھے اور بہرے پن کا سبب ہوتے ہیں اس کے برعکس یہ چیزیں بے عملی اور گناہ وفساد کا باعث ہوتی ہیں ۔گذشتہ صفحات میں ہم نے روایات کی روشنی میں عمل اور بصیرت کے درمیان مثبت رابطہ کی وضاحت کی تھی اسی طرح اس رابطہ کے دوسرے رخ کو بھی احادیث کی روشنی میں ہی پیش کررہے ہیں ۔

بے عملی سے خاتمۂ بصیرت

اسلامی روایات سے یہ صاف واضح ہوجاتا ہے کہ برے اعمال سے بصیرت ختم ہوتی رہتی ہے قرآن کریم نے بھی متعدد مقامات پراس حقیقت کا اظہار واعلان کیا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: (أفرأیت من اتّخذ الٰھہ،ھواہ وأضلّہ اللہ علیٰ علمٍ وختم علیٰ سمعہ وقلبہ وجعل علیٰ بصرہ غشاوۃً فمن یھدیہ من بعد اللہ[۱]) ''کیا آپ نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے اپنی خواہش ہی کو خدا بنالیا اور خدا نے اسی حالت کو دیکھ کراسے گمراہی میں چھوڑ دیا اور اسکے کان اوردل پر مہر لگا دی ہے اور اسکی آنکھ پر پردے پڑے ہوئے ہیں اور خدا کے بعد کون ہدایت کر سکتا ہے'' جن لوگوں نے خدا کو چھوڑکر کسی دوسرے معبود کی عبادت کرکے شرک اختیار کیا اللہ ان سے بصیرت سلب کرلیتا ہے اور ان کے کانوں اور دلوں پر مہر لگادیتا ہے آنکھوں پر پردے ڈال دیتا ہے اور طے ہے کہ جب اللہ کسی بندہ سے بصیرت سلب کرلے تو پھر اسے کون ہدایت دے سکتا ہے؟اسی کو قرآن مجیدان الفاظ میں بیان کرتا ہے: (کذلک یُضلّ اللہ الکافرین[۲]) ''اللہ اسی طرح کافروں کو گمراہی میں چھوڑدیتا ہے'' یہ جملہ دراصل گذشتہ تفصیل کا اجمالی بیان ہے (کذلک یُضلّ اللہ من ھو مسرف مرتاب[۳]) ''اسی طرح خدا زیادتی کرنے والے اور شکی مزاج انسانوں کو انکی گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے'' اس لئے کہ اسراف گمراہی کی طرف لے جاتا ہےاسی طرح ارشاد ہوتا ہے: (وما یُضلّ بہ الا الفاسقین[۴]) ''اور گمراہی صرف انکا حصہ ہے جو فاسق ہیں'' یا :(ویُضلّ اللہ الظالمین[۵]) ''اللہ ظالمین کو گمراہی میں چھوڑدیتا ہے''

---

[۱] سورۂ جاثیہ آیت۲۳۔
[۲] سورۂ غافرآیت۷۴۔
[۳] سورۂ غافرآیت ۳۴۔
[٤] سورۂ بقرہ آیت۲۶ ۔
[٥] سورۂ ابراہیم آیت۲۷۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ فسق اور ظلم ،گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں ۔خداوند عالم کا ارشاد ہے: (کَلَّا بل ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون[1]) ''نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ لگ گیا ہے'' انسان جب گنا ہوں اور معصیتوں کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کے یہی اعمال ایک ٹیلہ کی شکل میں جمع ہو کر اس کے قلب کے سامنے رکاوٹ بن جاتے ہیں اور پھر خدا اور حق اسے نظر نہیں آتے ۔ خدا وند عالم کا ارشاد ہے: (انَ اللّٰہ لاَ یَھْدِ ی القَومَ الظّٰالِمِیْن[2]) ''اللّٰہ ظالموں کی ہدایت نہیں کرتا'' (ان اللّٰہ لا یھد ی القوم الکافرین[3]) ''اللّٰہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا'' (انَ اللّٰہ لاَ یَھْدِ ی القَومَ الفَاسقین[4]) ''یقیناً اللّٰہ بدکار لوگوں کی ہدایت نہیں کرتا'' (انَ اللّٰہ لاَ یَھْدِ ی من ھوَ مُسْرِفٌ کَذَّا بٌ[5]) ''بیشک اللّٰہ کسی زیادتی کرنے والے اور جھوٹے کی ہدایت نہیں کرتا '' (ان اللّٰہ لاَیَھْدِ ی من ھُوکاذب کفار[6]) ''اللّٰہ کسی بھی جھوٹے اور نا شکری کرنے والے کی ہدایت نہیں کرتا'' پیغمبر اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: (لولا تکثیر فی کلامکم ،وتمریج فی قلوبکم، لرأیتم ما أریٰ و سمعتم ما اسمع[7]) ''اگر تمہارے کلام میں کثرت نہ ہوتی اور قلوب آلودہ نہ ہوتے تو تم بھی وہی دیکھتے جو میں دیکھتا ہوں اور وہی سنتے جو میں سنتا ہوں'' امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے :(کیف یستطیع الھدیٰ من یغلبہ الھویٰ[8]) ''جس پر ہویٰ وہوس غالب ہو وہ کیسے ہدایت پاسکتا ہے؟'' آپؑ کا ہی ارشاد ہے: (انکم ان أمّرتُم علیکم الھویٰ أصمّکم وأعماکم وأرداکم[9]) ''اگر تم نے اپنے اوپر ہویٰ وہوس کوغالب کرلیاتو وہ تمہیں بہرا،اندھا اور پست بنادیں گی'' اس سے معلوم ہوا کہ مسلسل باطل اور فضول باتیں کرنااور دلوں میں حق و باطل کا گڈمڈ ہونا یہ آنکھوں کو اندھا اور کانوں کو بہرابنا دیتا ہے ۔امام محمد باقرؑ نے فرمایا: (ما من عبد الا وفی قلبہ نکتۃ بیضاء،فاذا أذنب خرج فینتکک النکتۃ نکتۃ سوداء،فاذا تاب ذھب ذلک السواد،وان تمادیٰ فی الذنوب زاد ذلک السواد حتیٰ یغطی البیاض،فاذا غطّیٰ البیاض لم یرجع صاحبہ الیٰ خیر أبداً،وھو قول اللّٰہ

---

[1] سورۂ مطففین آیت۱۴۔
[2] سورۂ قصص آیت۵۰۔
[3] سورۂ مائدہ آیت ۶۷۔
[4] سورۂ منافقون آیت۶۔
[5] سورۂ غافرآیت۲۸۔
[6] سورۂ زمرآیت۳۔
[7] المیزان ج۵ص۲۹۲۔
[8] غرر الحکم ج۲ ص ۹۴۔
[9] غررالحکم ج۱ص۲۶۴۔

عزّوجل:(بل ران علیٰ قلوبھم ماکانوا یکسبون[1]) ''ہر انسان کے دل میں ایک سفیدی ہوتی ہے انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس سفیدی میں ایک سیاہ نقطہ نمودار ہوجاتا ہے اگر گناہگار توبہ کرلیتا ہے تو وہ سیاہی زائل ہوجاتی ہے لیکن اگر گناہوں کا سلسلہ جاری رہے تو سیاہی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ یہ سیاہی دل کی سفیدی کو ڈھانپ لیتی ہے اور جب سفیدی پوشیدہ ہوجاتی ہے تو ایسا انسان کبھی خیر کی جانب نہیں پلٹ سکتا ۔ یہی خدا وند عالم کے قول (بل ران علیٰ قلوبھم ماکانوا یکسبون) ''نہیں نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ لگ گیا ہے'کے معنی ہیں''یہی سیاہی جب قلب پر چھاجاتی ہے تو اسکے لئے حجاب بن جاتی ہے جس کے نتیجہ میں انسان سے بصیرت سلب ہوجاتی ہے بہ الفاظ دیگر انسان جب گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے تو بصیرت ختم ہوجاتی ہے ۔امام محمد باقرؑ کا ارشاد ہے: (ماشیء أفسد للقلب من الخطیءة،ان القلب لیواقع الخطیءة فاتزال بہ حتیٰ تغلب علیہ فیصیر أسفلہ أعلاہ،وأعلاہ أسفلہ ،قال رسول اللّٰہ (ص[2]) '' خطا سے بڑھ کر قلب کو فاسد کرنے والی کوئی شئے نہیں ہے بیشک جب دل میں کوئی برائی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اسی میں باقی رہ کر اس پر غلبہ حاصل کر لیتی ہے تو اسکا نچلا حصہ اوپر اور اوپری حصہ نیچے ہو جاتا ہے''،رسول اکرم ﷺ نے فرمایا :(ان المؤمن اذا أذنب کانت نکتة سوداء فی قلبہ،فاذا تاب ونزع واستغفر صقل قلبہ، وان ازداد زادت فذلک الرین الذی ذکرہ اللّٰہ تعالیٰ فی کتابہ (کلاّ بل ران علیٰ قلوبھم ماکانوایکسبون[3]) ''مومن جب گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ بن جاتا ہے اگر توبہ واستغفارکرلے تو اسکا قلب صیقل ہوجاتا ہے لیکن اگر گناہوں میں زیادتی ہوتی رہے تو یہی (رین) یعنی زنگ بن جاتا ہے جسے خدا نے آیت (کلاّبل ران علیٰ قلوبھم)میں فرمایا ہے'' امیر المومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے:(ان أطعت ھواک اصمک وأعماک[4]) ''اگر تم ہویٰ وہوس کی اطاعت کروگے تو وہ تمہیں بہرا اور اندھا بنادے گی''

[1] نورالثقلین ج۵ص۵۳۱۔
[2] گذشتہ حوالہ۔
[3] نور الثقلین ج۵ص۵۳۱۔
[4] غرر الحکم۔

فقدان بصیرت برے اعمال کا سبب

جس طرح برائیوں اور گناہوں سے گمراہی پیدا ہوتی ہے اسی کے بر عکس ضلالت و گمراہی بھی گناہ اور بد عملی کا سبب ہوتی ہے اور اس طرح جہالت و ضلالت اور فقدان بصیرت کے باعث شقاوت و بد بختی ظلم واسراف جیسے برے اعمال وجود میں آتے ہیں ۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے: (قالوا ربّنا غلبت علینا شقوتنا وکنّا قوما ضالّین[1]) ''وہ لوگ کہیں گے کہ پروردگار ہم پر بد بختی غالب آگئی تھی اور ہم لوگ گمراہ ہوگئے تھے''امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا: (لاورع مع غیّ[2]) ''گمراہی کے بعد کوئی پارسائی نہیں رہتی ''مولائے کائناتؑ نے معاویہ بن ابی سفیان کو اپنے خط میں تحریر فرمایاہے:(امریٔ لیس لہ بصر یھدیہ،ولا قائد یرشدہ،قد دعاہ الھویٰ فأجابہ،وقادہ الضلال فاتّبعہ، فھجر لاغطاً،وضلّ خابطاً[3]) ''(مجھے تیرا جوخط ملا ہے)یہ ایک ایسے شخص کا خط ہے جس کے پاس نہ ہدایت دینے والی بصارت ہے اور نہ راستہ بتانے والی قیادت ۔اسے خواہشات نے پکارا تو اس نے لبیک کہدی اور گمراہی نے کھینچا تو اسکے پیچھے چل پڑا اور اسکے نتیجہ میں اول فول بکنے لگا اور راستہ بھول کر گمراہ ہوگیا''آپ ہی کا ارشاد گرامی ہے: (من زاغ ساءت عندہ الحسنۃ،وحسنت عندہ السیءۃ،وسکر سکر الضلالۃ[4]) ''جو کجی میں مبتلا ہوا،اسے نیکی برائی اور برائی نیکی نظر آنے لگتی ہے اور وہ گمراہی کے نشہ میں چور ہوجاتا ہے'' لہٰذا معلوم ہوا کہ بصیرت اور عمل میں دوطرفہ مستحکم رابطہ ہے یہ رابطہ مثبت انداز میں بھی ہے اور منفی صورت میں بھی ۔جسے اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے ۔

۱۔بصیرت،عمل صالح کی طرف لے جاتی ہے ۔

۲۔عمل صالح،بصیرت و ہدایت کا سبب ہوتا ہے ۔

۳۔ضلالت اور فقدانِ بصیرت، ظلم وجور جیسے دیگر برے اعمال اور گناہوں کا سبب ہوتی ہے ۔

---

[1] سورۂ مومنون آیت ۱۰۶۔
[2] غرر الحکم ج۲ص۳۴۵۔
[3] نہج البلاغہ مکتوب ۷۔
[4] نہج البلاغہ حکمت ۳۱۔

۴۔ برے اعمال اور ظلم وجور سے بصیرت ختم ہوجاتی ہے۔

خلاصۂ کلام

حدیث شریف کے فقرہ ''کفقت علیہ ضیعتہ'' کے بارے میں جو گفتگو ہوئی اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان جب خواہشات نفس کی مخالفت کرکے اپنے خواہشات کو ارادۂ الٰہی کا تابع بنادیتا ہے اور مالک کی مرضی کا خواہاں ہوتا ہے تو خدا اسے نور ہدایت اور بصیرت عنایت فرمادیتا ہے اور تاریک راستوں میں اسکا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ خداوند عالم کا ارشاد ہے: (یاأیّھا الذین آمنوا اتقوا اللّٰہ وآمنوا برسولہ یُؤتکم کِفلین من رحمتہ ویجعلْ لکم نوراً تمشون بہ[1]) ''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور رسول پر واقعی ایمان لے آؤ تا کہ خدا تمھیں اپنی رحمت کے دوبڑے حصے عطا کردے اور تمہارے لئے ایسا نور قرار دیدے جس کی روشنی میں چل سکو'' دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: (یاأیّھا الذین آمنوا ان تتّقوا اللّٰہ یجعلْ لکم فرقاناً[2]) ''ایمان والو! اگر تم تقوائے الٰہی اختیار کروگے تو وہ تمہیں حق وباطل میں فرق کرنے کی صلاحیت عطا کردے گا'' (واتّقوا اللّٰہ و یعلّمکم اللّٰہ[3]) ''اوراللہ سے ڈرو تاکہ اللہ تمہیں علم عطاکرے''،حضرت علیؑ سے مروی ہے: (ہُدیٰ من أشعر قلبہ التقویٰ[4]) ''وہ ہدایت یافتہ ہے جس نے تقویٰ کو اپنے دل کا شعار بنالیا'' (ھُدیٰ من تجلبب جلباب الدین[5]) ''وہ ہدایت یافتہ ہے جس نے دین کا لباس اوڑھ لیا'' (من غرس أشجار التقیٰ،جنیٰ ثمار الھدیٰ[6]) ''جس نے تقویٰ کے درخت بوئے وہ ہدایت کے پھل کھائے گا''

والحمد للّٰہ رب العالمین محمد مہدی آصفی ۱۰ ذی القعدہ ۱۴۱۲ قم

---

[1] سورۂ حدید آیت۲۸۔
[2] سورۂ انفال آیت۲۹۔
[3] سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲۔
[4] غرر الحکم ج۲ص۳۱۱۔
[5] گذشتہ حوالہ۔
[6] غرر الحکم ج۲ ص۲۴۵۔